۷۸۶

اثبات دین انسانی

یعنی

کمیونزم اور اسلام

از

صوفی نذیر احمد کاشمیری

(ملنے کا پتہ)

مکتبہ علمیہ عثمانیہ بازار حیدرآباد دکن

مطبوعہ

رفیق مشین پریس مچھلی کمان حیدرآباد دکن

اشاعت اول (۵۰۰)　　۱۹۵۳ء　　۲۴ پونڈ　　قیمت (۸ر)

سے دو چار ہزار پڑھے لکھے سادھوؤں کو تو میرے سپرد کردے تو خدا کے فضل سے میں انہیں دو دو چار چار مہینوں کی خالص اخلاقی و روحانی ٹریننگ دیکر اور انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلا کر ایک ایسی خدا پرستانہ تحریک کی بنیاد ڈال دونگا کہ جو انشاء اللہ ورلڈ سیلنگ پر منتج ہوگی۔ اس صورت میں میں اپنی ساری صلاحیت کو تیرے سپرد کر دونگا۔ میرے پاس ایک ایسا یقین ہے کہ جو اس وقت شاید ہی کسی دوسرے فرد کے پاس ہو۔ اس کا ابتدائی ثبوت تو خود یہ کتاب ہے اور دوسرا ثبوت اس وقت انشاء اللہ دونگا کہ جب تیرے سو دو سو سادھو روحانی تجربے میں میرے پاس بیٹھنے پر آمادہ ہوں گے۔

مسلمانوں سے

آپ سے مجھے یہ عرض کرنا ہے اس کتاب میں مسلمانوں کے کرنے کا جو کام بتایا گیا ہے، اگر اسے کسی حد تک بھی کوئی مسلم جماعت انجام دلا سکتی ہے تو وہ ہند سے بھاگی ہوئی پاکستان مسلم لیگ ہے۔ یہ لوگ یہاں سے اجڑ کر گئے تھے کہ مر تو بینگے مگر اس وقت تک وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔ انقلاب کا داعی بننے کیلئے اجڑنا ایک بنیادی شرط ہے۔ جو اس جماعت میں موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اسوقت تک مسلمانوں کے کسی خاص فرقے کے زیر اثر نہیں آئی، جس کے سبب وہ اگر دیانت داری سے کوشش کرے تو امت کا مفہوم متعین کرالیگی جس کیلئے انشاءاللہ اس کتاب میں اسے بہت سا مواد ملیگا۔

جنابِ محترم - آداب سنون

آپکی خدمت میں کتاب "اثباتِ دینِ انسانی" پیش کی جا رہی ہے۔ درخواست ہے کہ اسے ابتدا سے اخیر تک ملاحظہ فرمانے کے بعد تحریر فرمائیں کہ اس مقصد کیلئے آپ کیا ایثار، قربانی اور تعاون فرما سکتے ہیں۔ گذارش یہ ہے کہ جب تک پوری کتاب ملاحظہ نہ فرمالیں اس وقت تک اس کے متعلق رائے قائم نہ فرمائیں

کتاب کا خلاصہ

یہ کتاب اگر موجودہ دور کی عالمگیر لامذہبیت کے خلاف ایک سچے مذہبی اور با خدا انسان کا مجبوری اعلانِ جہاد ہے تو تنگ نظر اور ناقص مذہبیت کے خلاف ایک دلسوز احتجاج ہے۔ اگر کائنات میں انسان ایک علیحدہ اور مستقل نوع ہے تو یقیناً اس کی اپنی نوعی راہ صرف ایک ہو سکتی ہے

ہندو قوم سے درخواست

اے قوم تین ہزار برس کے بعد تجھے کام کرنیکا جو موقعہ ملا ہے اگر تو سچ مچ اس موقعے کو انسانی بہبودی کیلئے استعمال کرنا چاہتی ہے تو پھر مذہب کی اس فرقہ وارانہ اور وہم پرستانہ شکل کو چھوڑ کر جس پر اس وقت تک تو کاربند رہی ہے، اور اسکی سب سے کامل شکل اور عالمگیر شکل کو لے۔ تیرے ہاں لاکھوں کی تعداد لیسے تیاگی سادھوں کی ہے کہ اگر ان میں

فہرست ابواب و فصول

ہندوستان کے متعلق مسلم لیگ کا فرض

اگر لیگ کو سچ مچ کوئی کام انجام دینا ہے تو پھر اس کا ایک بنیادی فرض یہ ہے کہ ہندوستان سے کبھی کانگریس کی طرف سے اور کبھی سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے تیسرے بلاک کی جو جو آوازیں کبھی کبھی اٹھتی ہیں، ان کا وہ مخلصانہ خیر مقدم کرے اپنا پورا تعاون پیش کردے۔ بلکہ ممکن اور مناسب ہو تو ڈیفنس کو ایک کرنیکی جو آواز اٹھی ہے، اسے بھی قبول کرتے ہوئے اس طرف سے یکسوئی حاصل کرلے۔ اور پھر یکسوئی سے عرض کردہ کام انجام دینے پر لگ جائے اگر یہ کام ہو گیا تو بلاشک مشرقی ممالک مغربی امپیریل ازم اور کمیونسٹ امپیریل ازم کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے اپنی خالص دینی و اخلاقی تنظیم کرلیں گے۔ اور اگر خدا نہ کردہ یہ نہ ہوسکا تو ہندوستان کی حد تک جمعیت العلماء اور شیعہ کانفرنس غیر مسلم جماعتیں اگر آپس میں کوئی پروگرام طے کریں اور علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے اداے کی موجودہ شکل کو بدل کر کوئی ایسا نظام تعلیم اختیار کریں کہ جو مسلم کو فرقہ واریت سے نکال کر خالص دینی بنیادوں پر ایک کرنے کو اپنا مقصود قرار دے تو بلاشک ان کیلئے بھی کام کرنے کی صورت پیدا ہو جائیگی عجب نہیں کہ لیگ اور کانگریس کو عرض کردہ عالمگیر مقصد پر ایک کرنے کا کام یہیں سے انجام پائے۔ بلکہ سارے عالم اسلامی کیلئے یہی تنہا درسگاہ مرکزی ادارہ بن جائے بلاشک اس سے ہندوستان کو بھی بے شمار فائدہ ہوگا۔ اگر کوئی صاحب انگریزی ہندی عربی یا فارسی میں اس کتاب کا ترجمہ کرنے میں تعاون فرمائیں تو یہ نہایت اہم انسانی خدمت ہوگی۔ راقم تو محض ایک بے سر و سامان فقیر ہے۔ آپ سب کا خیر اندیش بھائی

پتہ (مسجد محمد شکر [illegible] فستجو [illegible] آباد دکن) [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

انتساب

میں اپنی اس کتاب کو عالم انسانی کے ان افراد کے نام منسوب کرتا ہوں، جو نوع انسانی کو باقی حیوانی و غیر حیوانی کائنات کے مقابل ایمانا، اعتقاداً اور عملاً ایک اشرف و اعلیٰ مخلوق مانتے ہیں، کائنات انسانی کے اتحاد کا ذریعہ عالمگیر اقتصادی و نسلی و طبقاتی کشمکش کے بجائے پوری ایمانداری سے انسان کی اخلاقی و روحانی قوتوں کی غایت درجہ بیداری و نہایت درجہ ترقی کو جانتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ہر ممکن ایثار و جانبازی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ موجودہ وقت میں انسان کو نوعی ہلاکت کی راہ سے ہٹا کر صحیح اور سچے اخلاقی و روحانی نصب العین پر متحد کرنے کے لئے جانبازی سے کم کوئی ایثار کارگر معلوم ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ مگر یہ جانبازی جذبات کی دیوانگی کے بجائے یقین و احساس فرض کے آخری درجے پر مبنی ہونی چاہیئے۔ میں اس انتساب میں امت اسلامیہ کی ان خاص افراد کو نہ صرف شامل کرتا ہوں کہ جو آج بھی

باب چہارم تکملہ

تمت

مقدمۂ کتاب

مذہب کی ماہیت، عملی شکل اور تکمیل

مذہب اپنی بنیاد اور ماہیت کے اعتبار سے انسان کے اپنے خالق کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح طور پر استوار کرنے کا نام ہے۔ لیکن چونکہ حیاتِ انسانی اپنی تکمیل و بقا کے لئے صرف ایک یک رخ اور یک اندازِ روحانی پرواز کا نام ہی نہیں بلکہ اسے اپنی بقا و تکمیل کے لئے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ایک ملی جلی زندگی ایک عرصے تک گذارنا ہے اور چونکہ اس سارے باہمی میل جول کا اثر خود انسان کے رابطۂ مولا پر بھی ہر آن پڑتا ہے، لہذا مذہب دوسرے درجے پر انسان کے تمام ابنائے جنس کے باہمی تعلقات کو بھی متعین کرتا ہے اور اس سلسلے میں باہمی حقوق و فرائض کا ایک متعین پروگرام پیش کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے لیکن انسان کی یہ نزولی حرکت صرف اسی دوسرے قدم پر پہنچ کر

صرف یہ ادارہ ہے کہ جو مسلمانوں کی فقیہانہ وحدانیت کے بجائے تمام اسلامی مصلحتوں کو اپنے اندر جمع کر سکتا ہے ملّتِ اسلامی کا دین و دنیا کا تفرقہ وبال و ابتلائے انسانی ہے۔ ہندوستانی اکثریت آج بھی مذہبی ہے۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے کوئی ٹھوس اسلامی تعمیری نقطۂ نگاہ تعمیر کر لیا تو وہ سارے ہندوستان کو نور زارِ توحید بنا سکتا ہے۔

ہوا اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ ان مختلف مدارج کے اعتبار سے
خود سرے سے مذہب کو تقسیم کرتے ہوئے اس کے مختلف دائرے
اور ٹکڑے کر دئے گئے ہیں۔ جنھیں ایک مسلم واقعہ کی حیثیت سے
ہزاروں برس سے مختلف مذاہب کہا جا رہا ہے حالانکہ جس طرح عالم
انسانی ایک نوع ہے اس کا طریقِ حیات بھی صرف ایک ہو سکتا ہے
اور چونکہ مذہب انسان کا وہ فطری طریقِ حیات ہے کہ جو نوعِ انسانی
کو بمقابل دوسری انواعِ کائنات کے تمیز دیتا ہے لہذا اُسے صرف
ایک ہونا چاہیئے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہے جس کے اسباب کا کھوج لگانے
کی ضرورت ہے۔

مذہبی اختلاف کے اسباب

صدر میں مذہب کی ماہیت، و ترتیب و تکمیل کے متعلق جو
کچھ عرض کیا ہے اس سے صاف محسوس ہو گا کہ مذہبِ انسانی کو
ساری کائنات میں صرف ایک ہونا چاہیئے اس لئے کہ مذہب
کو جن تین تعلقات کے توازن و تعین پر مشتمل بتایا گیا ہے وہ
تینوں تعلقات قریباً تمام نوعِ انسان کے مشترکہ تعلقات
ہیں۔ اور انسان کی تکمیل و ترقی کا دار و مدار ان تینوں کے
کمالِ تعین اور کمالِ توازن پر ہے۔ لہذا ان تینوں تعلقات
کو توازن و ہم آہنگی دینے کے اصول تمام انسانی بستی کے لئے

ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اپنے معاشرے کے متعلق اپنے حقوق و
فرائض کو معین کرنے کے بعد ایک تیسری بات کو بھی اُسے معین کرنا
ہوتا ہے اور وہ یہ بات ہے کہ انسان کا ساری کائنات زیر
و بالا سے اس میں رہنے والی غیر انسانی مخلوقات سے کیا تعلق ہے!
اگر مذہب نے اس تیسرے تعلق کو بھی متعین کر لیا تو گویا یہ مذہب
کی کامل ترین شکل ہو گی مذہب کامل انسان کے تعلق خدا تعلق
بنی نوعِ انسانی اور تعلقِ کائنات کو ایک متوازی وہم آہنگ
منصوبے کی شکل دیتا ہے۔ تاکہ انسان کے تینوں تعلقات کا
بگاڑ یا عدم تعین حیاتِ انسانی کی راہ کو تاریک کرتا ہوا اُسے حیاتِ
ابدی کی طرف سے ہٹا نہ دے۔ گویا مذہب قدم اول پر انسان
اور اس کے اپنے خالق کے تعلق کی نوعیت کو معین کرتا ہے۔ دوسرے
قدم پر وہ انسان کے آپس میں کے نوعی تعلقات کو متعین شکل دیتا
ہے اور تیسرے قدم پر وہ نوعِ انسانی کے اور باقی کائنات کے
تعلق کو بھی متعین کرتا ہوا انسانی معاشرے کے جائز حرکت و سکون
کی صورت متعین کر جاتا ہے۔ اور ناجائز حرکت و سکون پر پابندی
عاید کر جاتا ہے۔

تاریخ کی روشنی میں مذہب کی مختلف شکلیں

مگر تاریخ کی روشنی میں ہمیں مذہبی ادارہ مختلف مدارج طے کرتا

کی صف کے اندر سے آتا ہے۔ ہندوازم اس مناظر پرستی اور انسان پرستی کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ اس کے بعد تاریخ کی رفتار کے ساتھ ہی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انسان بالآخر سارے کائناتی خود ساختہ خداؤں کو چھوڑ کر صرف انسانی عظمت کا قائل ہوتا جاتا ہے اور سارے حق کا مظہر ایک انسانِ کامل کو ہی سمجھنے لگتا ہے عیسائیت پر اس دورِ تاریخ کا قریباً خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عیسائیت کے ساتھ ہی ہمیں ایک طرف غیر انسانی بتوں کے خلاف ایک عالمگیر بغاوت محسوس ہوتی ہے اور دوسری طرف خالق و مالک کے ایک نصب العینی اور عالم گیر تصور کا آغاز دکھائی دیتا ہے۔ جو محمد رسولؐ کی تبلیغ اسلام میں اپنی تکمیل کے آخری نقطہ پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنے بت پرستی اور شخصیت پرستی دونوں کو ختم کرتے ہوئے ایک خدا کے عالم گیر پیغام پر ایک بین الاقوامی انداز کی جارحانہ سوسائٹی کا قیام نظر آتا ہے۔ جارحانہ سے میری مراد صرف یہ ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی کہ اپنے اعتقاد کی عالم گیری جس کا عملی پروگرام ہے۔ یہ عالمگیری الحاقی (Afterthought) نہیں اصولی ہے۔

جس طرح ہمیں انسان اپنے تعلق خالق میں مختلف مدارج طے کرتا دکھائی دیتا ہے، بالکل اپنے تعلق نوعی میں بھی ہمیں وہ ایسے ہی منازل طے کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یعنے جب وہ پہلے پہل اپنے اور ابنائے جنس کے حقوق و فرائض کو معین کرتا ہے تو

بالکل یکساں ہونے چاہئیں۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مذہب کی اس قدر مختلف اور متعدد شکلیں رہی ہیں اور بن گئی ہیں کہ جن کا بظاہر شمار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کے تمام اسباب کو اس وقت یہاں پر بیان کرنا میرے لئے آسان نہیں مگر پھر بھی اس کی سرسری نشان دہی کرنے کے سوائے میرے لئے چارہ بھی نہیں۔

الف:- اختلافِ مذہب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ تاریخ کے دور میں اپنے قوت و ضعف کے اعتبار سے شعورِ انسانی کے مدارج مختلف رہے ہیں اور چونکہ اسی اپنے اندرونی شعور کی بنا پر انسان ان تعلقات کا ادراک کرسکتا ہے، لہذا شعور کے قوت و ضعف کے اعتبار سے مذہب کے تعینات کی شکلیں مختلف ہو گئی ہیں۔ مثلاً مذہب کی سب سے پہلی شکل کا تاریخ کی روشنی میں ہمیں جو پتہ چلتا ہے اس میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنے خالق و معبود کی تلاش میں جب نکلتا ہے تو عموماً چند غیر معمولی نفع بخش یا غیر معمولی نقصان دہ چیزوں کی عظمت میں الجھ کر اپنے سفر کو ختم کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے بس اس کی منزلِ مقصود یہی ہے۔ اس کے بعد یا اس دور کے ساتھ ہی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو کائنات کے اندر اپنی ہستی کی اہمیت کا بھی ادراک ہو چلا ہے۔ اس لئے کہ اب وہ خود بڑی بڑی انسانی شخصیتوں کو بھی اپنے معبودوں

ک

ہمیں اس دائرہ میں بھی عرب و عجم و سفید و سیاہ کی تمام دیواریں توڑ کر ساری انسانیت کو ایک خدا اور ایک انسانی بھائی چارے کا پیغام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ خود آپکی زندگی میں آپکا پیغام ایک بین الاقوامی تحریک بنکر سارے عالم کو اپنے پروں تلے لے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں بھی یہ عالمگیری عیسائیت کی طرح ایک الحاقی (AFTERTHOUGHT) واقعہ نہیں بلکہ اصولی تعلیم کا متوازن حصہ ہے۔

اب ہم مذہب کے تیسرے تعلق کو لیتے ہیں تو ہمیں یہاں بھی تاریخ کے تدریجی عمل کا پتہ چلتا ہے جس قدر ہم تاریخ مذہب کے ابتدائی ابواب کیطرف جاتے ہیں ہمیں شرافتِ انسانی کا تصور زیادہ سے زیادہ دھیما معلوم ہوتا ہے اور جوں جوں تاریخ ہمارے قریب آجاتی ہے توں توں ہمیں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تصور واضح سے واضح تر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں موجودہ مذاہب میں ہندو مذہب میں کہ جو موجودہ تمام مذاہب میں قدیم تر ہے، شرافتِ انسانی کا تصور سب سے زیادہ دھیما معلوم ہوتا ہے عیسائیت درمیانہ پارٹ ادا کرتی ہے مگر اسلام میں مرکزی اصولِ تنظیم سرے سے اصولِ خلافت ہے۔ قرآنِ مجید سرے سے اس کائنات میں انسان کا تصور ہی خدا کے خلیفہ ہونے پر قائم کرتا ہے یعنے انسان اس کائنات کی سب سے زیادہ افضل و اشرف مخلوق ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ لہذا اسی شرافت کی بنا پر اُسے تمام کائنات کے ذخیروں کو اپنی ضرورت کے لئے استعمال

اس کی نگاہیں صرف قبیلہ وارانہ حدوں تک پہنچ کر رک جا
صدیوں کی کشمکش کے بعد اس کی نگاہیں قومیت کے دائرے تک
پھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں یہاں پر بھی ہمیں ہندوازم قبیلہ وا
اور قومیت کا ایک ملا جلا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں قبیلہ و
کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی ایک قومیت کا عملی تصور قائم کرنے کی
کوشش ہمیں محسوس ہوتی ہے جو مشہور ہندو عمرانی حکیم اور فلسفی منو
سچ مچ ایک عملی شکل قبول کرتی ہے۔ اس کے سبب ہندو سوسائٹی صد
تک ایک ترتیب کے ساتھ زندہ رہی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی ہمیں
عیسائیت قومی دائرے اور بین الاقوامی ادوار تنظیم کا ایک ملا
سمجھوتہ معلوم ہوتی ہے۔ حضرت مسیح تو اصولاً صرف بنی اسرائیل
اصلاح تک اپنا دائرۂ عمل محدود کرتے ہیں لیکن آپ کے ا
دنیا سے چلے جانے کے بعد سینٹ پیٹر ایک خواب یا الہام کے ذ
تمام دنیا کے حیوانات کو اپنے لئے حلال پاتا ہے اور اس طر
منشاء الٰہی یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل اس پیغام کو رد کر رہ
اور چونکہ یہ پیغام باقی تمام کائناتِ انسانی کے مصالح سے
مطابقت کھانے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا اُسے باقی اقوام
بھی پھیلنا چاہیئے۔ سینٹ پال سینٹ پیٹر کے اسی خواب کی عملی تعب
ہے اور عیسائیت کم از کم پورے یورپ کے لئے صدیوں ایک
معاشرتی قوتِ ماسکہ کا کام دیتی دکھائی دیتی ہے۔ مگر محمد رسول

(ج) تیسرا سبب یہ ہوا کہ انسان کوئی مشنری کی قسم کی مخلوق
نہیں کہ اگر اسے ایک دفعہ اعتدال کے سانچے میں ڈھال دیں تو پھر
وہ ابدالآباد تک اسی خطِ مستقیم پر حرکت کرتا جائے بلکہ وہ ایک
ذی ارادہ چیز ہے جس میں ارادے کے علاوہ مختلف قسم کے جذبات
بھی ہیں وہ بالطبع مختلف قسم کے دل پسند مشاغل (Hobbies)
رکھتا ہے۔ ان اندرونی صلاحیتوں کے علاوہ وہ ماحول سے غایت
درجہ متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ماحول کے دل پسند مشاغل
سے بعض وقت اپنی فطری راہ سے ہٹا کر کہیں سے کہیں پہنچا تے ہیں
یہ سب چیزیں ملکر اس کے سلسلہ عمل کو غیر متوازن کر دیتی ہیں جن کے
سبب وہ اپنے تین فطری تعلقوں میں سے کبھی ایک کی طرف انتہا
پسندانہ انداز پر جھک جاتا ہے اور کبھی دوسرے تعلق کی طرف جھک
جاتا ہے۔ افراد کے لئے تو افراط و تفریط کی یہ مدت چنداں طویل
نہیں ہوتی مگر خود اقوام و طبقاتِ انسانی کی طبائع بھی ان ماحولی
اور اندرونی موثرات سے متاثر ہونے میں بعینہ فرد کی طرح واقع ہوئی
ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس افراط یا تفریط کا دور دورہ کسی
ملت پر ہوتا ہے تو پھر وہ اسی ملت کے سارے تعمیری اداروں کو
اپنے ہی رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس افراط
و تفریط پر ملتوں کا اصرار بڑھ جاتا ہے تو ان غیر اعتدال پسندانہ
حرکات سے مختلف انتہا پسند فرقوں کی تخلیق ہوتی ہیں اور

کرنے کا اخلاقی حق حاصل ہے۔

نتیجے کے طور پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے صرف ایک ہونے پر بھی اس کی بیسیوں شکلوں کے عملاً موجود ہونے کا ایک بنیادی سبب یہ رہا ہے کہ مذہب نے جس طرح دوران تاریخ میں اپنے آپ کو مختلف مدارج میں نمایاں کیا ہے بجائے اس کے کہ اُسے ایک ہی سلسلے کی تدریجی کڑیاں سمجھتے ہوئے ایک مربوط شکل میں انسان دیکھتا اور ہر ارتقائی مظہر مذہب کو پورے نوعی انداز پر قبول لیتا اس نے ہر دور کی کڑی کو ایک علیحدہ مذہب بنا لیا اور اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق اس میں مختلف ہنگامی انداز کے شاخ و رنگ کا اضافہ کر لیا۔

(ب) دوسرا بڑا سبب اس اختلاف کا یہ رہا ہے کہ انسان ماضی قریب تک اس طرح پوری دنیا میں مختلف جوگریفیکل دائروں میں بٹا رہا ہے اور بعض وقت نسلی و قومی دائروں میں بٹا رہا ہے کہ اُسے نوعی انداز پر (Human whole) اپنے تینوں تعلقوں کو متعین کرنے کا بہت ہی کم موقع ہاتھ آیا۔ اس سبب سے نوع انسانی کی عالمگیر حیثیت کے بجائے اس پر لوکل حالات کا غلبہ رہا ہے جس نے مذہب کی اصولی حیثیت کے بجائے لوکل حیثیت پر زیادہ زور دیا جس کے سبب ایک غایت درجہ تنگ خیالی کا دور دورا ہوا۔ اور مذہب انسانی انسانی فرقوں میں بٹ گیا۔

کی مشترکہ ہدایتوں اور متحدہ اخلاقی وروحانی تقاضاؤں کو متعین نہیں ہونے دیتے بلکہ اپنی اپنی طبقاتی و قومی و فرقہ وارانہ اور بعض وقت شخصی خصوصیتوں پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اصل مرکزی ہدایتوں کا تصور ہی گم ہوجاتا ہے۔ جب کسی ملت کی تعلیم میں یہ پیچیدگی پیدا ہوگئی تو اب اس کی اخلاقی وروحانی ومعاشرتی زندگی صدہا لاعلاج بیماریوں کا مجموعہ ہوگئی۔ اب وہ روحانی و اخلاقی ومعاشرتی انار کی کا شکار ہوگئی۔ جب کوئی ملت اس مقام ابتلا پر پہنچ جائے تو پھر اس کی انسانی بقا کی محض ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اس پورے جراثیمی لباس کو اتار کر جلا دے اور کوئی اور تازہ لباس جو اس میں یک یکدلی و یک مقصدی و یک عملی پیدا کرسکے پہن لے۔

ہندوازم کی مثال

ہندو مذہب تنہا وہ مذہب ہے کہ جس کی کوئی تعریف کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ اس کے تمام افراد میں کوئی دس چیزیں بھی مشترک نہیں۔ مگر اختلاف کی حالت یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا شاید ہی کوئی ایسا اعتقادی، اخلاقی وروحانی ومعاشرتی اختلاف نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔ ایک پکا منکر خدا بھی ہندو ہوسکتا ہے اور دنیا کی ہر چیز کو عین خدا ماننے والا بھی ہندو ہوسکتا۔ صرف

اس طرح کائناتِ انسانی کا ایک نوعی صراطِ مستقیم ہزار سُبل متفر
میں بٹ کر اصل منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرنے کے ناقابل ہوا
ہے بلکہ سرے سے اس کی اکثر تعمیری صلاحیتوں کو اسی تخریب و تفر
میں صرف کردیا جاتا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے مذہبِ انسانی کے
ایک ہونے کے باوجود اس کے ہزاروں فرقوں میں بٹ جانے کے یہ
بڑے بڑے اسباب ہیں۔

(د) ایک چوتھا سبب بھی ہے اور وہ ہے انسانی سوسائٹی
میں دجالین کا ظہور۔ دجال وہ افراد ہیں کہ جن کے دل میں فلاحِ انسانی
کا کوئی داعیہ موجود نہیں۔ نہ وہ خالق کائنات کی طرف سے فلاحِ
انسانی کا کوئی ناقابلِ رد پیغام دینے کے لئے مجبور ہیں نہ ان کے
دل میں کوئی یقین کا قطرہ ہے مگر اس پر بھی وہ محض اپنی شخصی اہمیت
کو ظاہر کرنے اور اپنے شخصی ہوا و ہوس کو تسلی دینے کے لئے مذہب
کی اجرا و تشریح و تجدید یا تاسیس کے مدعی بنکر سامنے آجاتے ہیں۔
یہ شیطانوں کا گروہ بھی انسانی یک رنگاہی، یک عملی اور ایک مقصدی
کا دشمن ہے اور تفرقۂ انسانی کا بیج بونے والا ہے بہت سا تفرقہ
انھیں کا پیدا کیا ہے۔ جب مذہبی مقاصد کو محض اظہارِ حق اور فلاحِ
انسانی کے بجائے شخصی تشہیر و اقتصادی اغراض کے لئے استعمال کیا
جانے لگا تو سمجھو کہ ایک ملت میں دجل کی روح پیدا ہوگئی۔ ان
کمبختوں کی ایک پیچ دار خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فطرتِ انسانی

معاملہ یہ ہے کہ مذہب خالق فطرت کی اس رضا کا اظہار ہے کہ جو خالق فطرت
اپنے بندوں کے طریق عمل کے متعلق اپنے کسی منتخب فرد کامل کے ذریعہ کرتا ہے
لہذا اتحاد عالم انسانی کی سنجیدہ اور واحد راہ صرف یہ رہجاتی ہے کہ مذہب انسانی
کی اس شکل کو قبول کیا جائے کہ جو تاریخ کی روشنی میں سب سے زیادہ کامل و آخری ہے
اور معاشرتی معاملات میں اور روح و بدن کے مسائل ہیں اس کے نظام تمدن و فقہ پر تشکیک
ایک ایسی ہی تسہیل کے ذریعہ نظر کرائی جائے کہ جس کا صدر میں ذکر کیا گیا ہے مذہب اپنے
رابطہ مع اللہ کے اعتبار سے ایک غیر مبدل حق ہے مگر جب اس پیغام کو انسانی
یومیہ ارضی زندگی سے مربوط کیا جاتا ہے تو اس مقام پر اس میں اجتہاد و نظر کی ہمیشہ
گنجائش رہتی ہے اس لئے کہ انسانی زندگی جیسا کہ صدر میں عرض کیا گیا ہے محض ایک
مشینری کی یکسانی کا نام نہیں بلکہ اس میں ارادی جذباتی شعوری ہر قسم کی حرکت
موجود ہے جو اپنے ماحول کے معاملے میں یکسانی نہیں رکھتی۔ اسلئے اس کے ان
پہلوؤں کو قانون و آئین کا پابند رکھنے کے لئے اجتہاد و نظر کا دروازہ ہمیشہ
کھلا رہے گا۔ یہ ہے سادہ ترین راستہ اختلاف انسانی کو ختم کرنے کا۔

تاریخ انسانی کا موجودہ موقف

آج پورے سطح ارضی کی قومیتی اور جیوگرافیکل حدود یکے بعد دیگرے ٹوٹتی
ہوئی سارے عالم انسانی کو ایک ہی تنظیم میں سمیٹ لینے کی راہ کیطرف کھلی نشاندہی
کررہی ہیں لہذا ماضی کے انداز کی تجرد پسندی (Isolationism)
اب ایک خواب بے تعبیر ہے اب انسانیت کے سامنے صرف دو راہیں کھلی ہیں۔

ایک خالق و مالک کو اپنا معبود ماننے والا بھی ہندو ہو سکتا ہے اور ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کا پجاری بھی ہندو ہو سکتا ہے۔ گویا اپنی ماہیت کے اعتبار سے موجودہ سب زندہ مذہبوں میں سے ہندوازم سب سے زیادہ اپنے اندر مادۂ اختلاف اور سب سے کم مادہ اتحاد رکھتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ عیسائیت کا ہے اور جس مذہب کے ماننے والوں میں سب سے کم اختلاف پایا جاتا ہے، وہ اسلام ہے

ان مذہبی اختلافات کو ختم کرتے ہوئے سب انسانیت کو مذہب کی فطری شکل پر کیونکر متحد کیا جائے

اگر مذہب (نعوذ باللہ) کوئی محض ایسی چیز ہوتی کہ جو انسانی بستی کے کسی سنجیدہ میثاق (Contract) سے پیدا ہو سکتی ہے تو میں فی الفور عرض کرتا کہ عالم انسانی کے تمام اول درجے کے روحانی واخلاقی و معاشرتی حکما و کارکنوں کی ایک مجلس جینوا یا لیک سکسس میں بلائی جائے اور اُن سے تمام عالم انسانی کا یہ تقاضا ہو کہ وہ جب تک انسانی مذہب کا ایک متفقہ اور عالمگیر چارٹر تیار نہ کر لیں اس وقت تک وہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں اور اس طرح موجودہ وقت میں عالم انسانی کے حقیقی اتحاد کی راہ معین کرائی جاتی۔ لیکن

فطرتِ انسانی کا مرکزی ادارہ مذہب ہے لامذہبیت نہیں

کمیونزم اور اسلام

باب اوّل

تین سوالات

۱۔ مسلمان کس معنی میں اپنے آپکو "خیر الامم" کہتے ہیں؟ یہ تو یہود و نصاریٰ کی نقالی ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی اپنے آپ کو خدا کا "منتخب گروہ" کہا کرتے تھے۔

۲۔ "کیا اسلام بھی تاریخ عمرانِ انسانی کا ایک خاص باب نہ تھا کہ جو اپنا وظیفۂ حیات پورا کرنے کے بعد ختم ہو گیا"؟

۳۔ کارل مارکس اور اینگلز نے پوری تاریخ کائنات کو سامنے رکھ کر جس طرح فرائض و واجباتِ انسانی کا تعین کیا ہے کیوں نہ اُسے

ب

(الف) یا تو مذہب کے عالمگیر اصولوں کی کوئی معین شکل قبول کرتے ہوئے تمام انسانی بستی کیلئے ایک جیسے فرائض و حقوق کو متعین کرتے ہوئے عالم انسانی کو صرف ایک ہی مرکزیت میں سمیٹ لیا جائے۔ (ب) اور یا سارا عالم انسانی انارکی کا شکار ہو جائے۔ اس میں ہزاروں برس میں جو قوت تمیز پیدا ہوئی ہے تو اسکی نفی کرتے ہوئے اسے حیوانی گلے کا ایک حصہ کر دیا جائے۔

ہندو قوم کیلئے اتحاد عالم انسانی کی رہنمائی کرنیکا ایک موقعہ

میرا اندازہ ہے کہ چونکہ ہندو قوم صرف اپنی اندرونی تنظیم معاشرتی کیلئے بھی مجبور ہے کہ کوئی بہت بڑا انقلابی قدم اٹھائے لہذا اگر وہ میری اس گذارش کو قبول کر لیتی ہے کہ جو میں نے پوری کتاب میں کی ہے تو بلا شک وہ کم از کم مشرق کے اتنے حصے کو اخلاقی و مذہبی و روحانی اعتبار سے ایک جامع شکل میں متحد کر سکتی ہے کہ جو اسوقت تک روس یا امریکہ کے قبضے میں نہیں آئے۔ اندازہ یہ ہے کہ آئندہ کی جنگ میں وہ یورپی تہذیب اگر کاملاً نہیں تو اکثر اعتبارات سے برباد کر دی جائیگی کہ جو گذشتہ دو سو برس سے لامذہبیت اور مادیت کے اصول پر تعمیر ہوئی تھی لہذا اگر ہندوستان آج یہ راہ اختیار کرتا ہے تو ظن غالب یہ ہے کہ آئندہ جنگ کے بعد اس اصول تنظیم کو تمام بچا کھچا عالم انسانی قبول کر لیگا۔ محض انسانی مردم شماری اور ان کے اقتصادی ذرائع و ضروریات کے پیش نظر بھی عالم انسانی کا مسئلہ آج اسی بین الاقوامی وحدت و اتحاد کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے اور نت نئی جنگوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

فقیر نذیر احمد کاشمیری

ی شکل میں طاری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت ذہنی ونفسیاتی
نتشار اور ان کی بے ترتیبی وانارکی کے سوائے کچھ نہیں لیکن چونکہ
ندگی کا ایک لمحہ بھی نظم وترتیب کے سوائے ناممکن ہے۔ لہذا اسی
احولی دباؤ کے ماتحت یہی دھریت اکثر اوقات اپنی اصل حالت
کے سو فیصدی مخالف جاکر انسانی نظم وترتیب کو اپنا متن بنالیتی ہے
اسی قسم کی مبنی بر تضاد اور نہایت درجہ بر خود غلط کوشش کیمونزم کی
موجودہ عالمگیر تحریک ہے۔ کیمونزم اپنی اصل وخمیر کے لحاظ سے اخلاقی
وروحانی ومعاشرتی انارکی کی منظم ترین تاریخی کوشش ہے۔ روحانی
واخلاقی قوتوں کی انارکی کے منفی مواد کی ترتیب سے اس کا آغاز ہوتا
ہے حیوانی انداز کا مبنی بر انتقام تنازع للبقا اس کا درمیانی طریق عمل ہے اور
کھانے پینے کے لئے بے لاگ اور بے روک انتشار اس کا آخری
نصب العین ہے جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ اوراق کا لفظ لفظ اسکو واضح کریگا
طالب العلم مذکور نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کے بعض فاضل
اساتذہ اپنے علم واستدلال کی فراوانی سے طلبار کو اسی رو میں بہا
لیجاتے رہیں۔ چونکہ طلبا کے پاس کوئی صحیح رہنمائی موجود نہیں لہذا
وہ اس رو میں بہ جانے کے لئے راضی برضا ہو جاتے ہیں۔
اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ اس تحریر کو عالمگیر طور پر اس بے لبی

دینِ انسانی کی سب سے آخری کڑی اور ارتقائے انسانی کا سب سے آخری باب قرار نہ دیا جائے؟

یہ تین سوالات ۷/ستمبر ۱۹۵۱ء کو شام کے وقت مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے سیاسیات کے ایم۔ اے کے ایک طالب العلم نے میرے سامنے پیش کئے۔ یہ سوالات اس کے ذہن کی پیداوار نہ تھے بلکہ ان الجھنوں کا نتیجہ تھے کہ جو ایک ہوشیار مگر نہایت درجہ دشمنِ انسانیت گروہ تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ تمام اٹھتی نسل کو ہر ہر مقام پر دے رہا ہے ان کی نگاہیں تعلیمی اداروں پر بالخصوص ہیں۔ آج تمام عالم میں کمیونزم اور دھریت دو ہم معنے لفظ بن گئے ہیں۔ تاریخ انسانی میں دھریت اور انکار کی دو ہم معنے لفظ رہے ہیں، اس لئے کہ دھریت انسان کی اس ذہنی اور نفسیاتی حالت کا نام ہے کہ جب انسان ایک طرف اپنی نوعی خصوصیات (روحانی و اخلاقی قدروں) کا صحیح صحیح اندازہ قائم کرنے کے اور دوسری طرف اس کائنات کے بندو لبست کو کسی غیر معمولی شعور و تدبیر خیر کی گرفت میں دیکھنے کے ناقابل ہو جاتا ہے۔ یہ حالت انسان پر اپنے مسلسل ناکام منصوبوں کے باعث صرف ایک انتقام کے جذبے کے ماتحت طاری ہوتی ہے یا قوائے حیات کو لگاتار بداندیشی و بدکاری میں تلف کر ڈالنے کے بعد ایک مایوسی

مطلق نہیں بلکہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ پورے ہندوستان کے مسلمان نمائندے یہ فیصلہ کریں کہ کیا وہ اس ادارے کو پورے اسلامی رنگ میں مسلمانوں کی تعمیر کا مرکزی ادارہ بنانے کا فیصلہ کرسکتے ہیں؟ اگر وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں تو پھر انہیں گورنمنٹ کی گرانٹ کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اس لئے کہ موجودہ گورنمنٹ "سیکولرازم" کو ہندوستان کی پوری ملی زندگی پر حاوی کرتی معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ اس کے بس سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اس کی عالی اعانت سے یونیورسٹی کو چلانا ہے تو پھر لامذہبیت بھی لائی جائے گی اور گورنمنٹ کا قبضہ بھی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا اس طرح دہریت کے منہ میں ہر پہلو سے چلا جانا تاریخ انسانی کی بدقسمتی کا ایک خطرناک باب ہوگا۔ انسانی فلاح لامذہبیت سے نہیں بلکہ صحیح مذہبیت سے ہے اس پہلو سے بھی مسلمانوں کی اسلامی تنظیم بنیادی ضرورتِ انسانی ہے۔ اس کا ایک معین خاکہ صدر کے تینوں سوالوں کے جوابات کے ضمن میں اور کچھ کتاب کے آخیر پر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

میرے جواب کی نوعیت

ذیل میں صدر کے تین سوالات کے متعلق جو کچھ عرض ہے وہ محض

بیداری اور اسلامی

کو دور کرنے کا ذریعہ بنا دے بلکہ خود ان دشمنانِ ملت اسلامیہ
کے لئے اس کتاب کو ایک سنجیدہ محاسبۂ نفس اور ہدایت کا باعث بنادے
میرا اندازہ ہے کہ ہندوستان میں نیشنلزم کے فیل ہو جانے اور فرقہ وارانہ
کے عام احیا نے کمیونزم کے لئے بڑی حد تک راستہ صاف کر دیا ہے
وہ تعلیم یافتہ گروہ کہ جس پر مذہب کا اثر نہ تھا اب کمیونزم کو اپنے لئے
واحد ذریعہ نجات سمجھتا ہے۔ عوام ہندوستانی آج بھی سو فیصدی مذہبی
خیالات کا حامی ہے مگر وہ اپنا راستہ معین نہیں کرسکتا۔ لہذا اگر وہ بھی
اسی لپیٹ میں آگیا تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ مسلم یونیورسٹی میں تو کمیونزم اپنے
منصوبے میں پوری طرح کامیاب ہو رہا ہے۔ آج کل مسلم اخبارات مسلم
یونیورسٹی کے معاملات میں گورنمنٹ کے زیادہ دخیل ہونے پر عموماً احتجاج
کرتے رہتے ہیں انہیں شاید اس کا احساس نہیں کہ گورنمنٹ کا تو کبھی
دخل ہوگا کمیونزم تو آج اس ادارے پر حاوی ہو چکا ہے۔ اور چونکہ
اس ادارے کا اثر سارے مسلمانانِ ہند پر سالوں سے حاوی رہا ہے
لہذا یہاں کمیونزم کے مسلط ہونے کے معنے یہ ہیں کہ سارے مسلمانانِ
ہند پر کمیونزم مسلط ہو رہا ہے۔ اس لئے یونیورسٹی کا یہ پہلو گورنمنٹ
پر تنقید کرنے سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہے۔ گورنمنٹ کے اثر سے
اگر مسلم یونیورسٹی کو بچانا ہے تو اس کا علاج غیر ذمہ دارانہ تنقیدیں

خاکستر کر دیا جائے اور کسی موسیٰ پیغمبر کو بلا کر تقدیرِ انسانی کا سارا پلان اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو وہ شاید دس الہامی اصولوں سے کامل تعمیر عملاً کر دکھائے۔ اور پھر اس نظمِ جدید میں اس کمال کا توازن ہو کہ سورج اور چاند تک اس سے ہم آہنگ ہونے کو برضا و رغبت آمادہ ہو جائیں، "انفس" و "آفاق" کیا ہے؟ حیات کی ابدی حرکت ارتقا پر زمان و مکان کی پابندی اور ڈسپلن عاید کرنے کا نام انفس و آفاق ہے۔ انہیں دو کے مجموعے کو عالمِ خلق کہا جاتا ہے جس کا باطن انفس اور ظاہر آفاق کہلاتا ہے) مگر حیات کی منزلِ مقصود اس پابندی کے پنجرے سے قطعاً باہر ہے جب انسان کا اخلاقی و روحانی شعور اپنی ہستی کو متعین کرنے اور اپنی منزلِ مقصود کو معلوم کرنے کے لئے ایک مرکزیت پر سمٹتا ہے اور محض ذہنی مشاغل پر اپنی فطرت کو غیر قانع پا کر اپنے خالق کی طرف فریاد کرتا ہے تو چند جانباز کوششوں کے بعد اُسے زمان و مکان کے زنجیر کی کڑیاں گرد کے ذرات کی طرح اپنے پر و بال سے جھڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اب اُسے اپنی اصل اور اپنی منزلِ مقصود کا پتہ چلتا ہے۔ میں شاعری نہیں کر رہا ہوں بلکہ ٹھیک اس مقامِ انسانی کی تشریح کر رہا ہوں کہ جس کا مجھے حق الیقین ہے۔ کارل مارکس کے آج تک کے عام مخالفوں میں اور مجھ میں یہی فرق ہے میری بنیاد

کتب خانوں اور دماغ کی ملی بھگت یا ان کی کشمکش کا نتیجہ
بلکہ اس کی اصل رابطہ مع اللہ کا ایک عالمگیر یقین و احساس و شعور،
انسان جس مختصر سی کائنات کا نام ہے وہ کائنات انفس
(subjective) و آفاق (objective).
کہیں زیادہ جامع ہے انسان کی مثال ایک دو منزلے مکان کی
جس کی نچلی منزل کے ظاہری حصے کا نام آفاق (objective
اور اندرونی حصے کا نام النفس (subjective
) ہے لیکن اس کی اوپر کی منزل جس چونے سیمنٹ
اینٹ (یہ چونا اینٹ انسان کا مخصوص اخلاقی و روحانی شعور
و احساس و یقین ہے) سے بنی ہے وہ چونا اینٹ حتماً و مطلقاً
اصل انفس و آفاق سے کہیں باہر رکھتا ہے۔ لہذا دنیائے قدیم کے
لوگ باہر سے غیر متعلق ہو کر صرف انفس کی بھول بھلیوں میں
تلاش کرتے رہے ہیں یا دنیائے جدید کے جو لوگ انفس کے بجائے
محض خارج کی دنیا میں اس کی تلاش میں لگے ہیں دونوں کی کوشش
اس مدعا کے پانے میں رائگاں گئی ہیں۔ ان دونوں نے انسان کی
قسمت کو سلجھانے کے بجائے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ لہذا اگر انکی
ساری خود فریبی کی داستانِ رنگین کو تمام دنیا پر سے جمع کر کے جلا کر

اس دائرے میں بڑے سے بڑے تجربے کئے جاتے تھے۔ مگر یہ ساری کوششیں انسانیت کی عالمگیر بقا و نشو و نما کے کسی جامع و مانع نصب العین سے مطلق وابستہ نہیں بلکہ حقیقت میں بقائے انسانی کے جماعتی نصب العین کو نہایت درجہ غیر ذمہ داری کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے محض افراد کی خود مختارانہ کوششیں تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری ملت میں خالص تنظیمی اعتبار سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انارکی کا دور دورا ہو گیا محض نفسی، تجربات کے اعتبار سے یہ کوششیں چاہے کس قدر قیمتی ہوں مگر معاشرتی (سوشل) اور اخلاقی تنظیم کے اعتبار سے ان کا نتیجہ صرف انارکی تھا اور وہی ہوا۔ میرا یقین ہے کہ اگر آج بھی ہندو قوم اس دور کے لٹریچر کو دھرائیگی تو پھر اس ملک پر اسی سوشل و اخلاقی انارکی کا دور دورا ہو جائیگا اور کچھ نہ ہو گا۔ اس انفرادی روحانیت اور اخلاقی و معاشرتی انارکی کے ردعمل میں بدھ ازم کی حرکت شروع ہوتی ہے جس نے ایک طرف روح کے مسئلے کو اور دوسری طرف معاشرتی (سوشل) تنظیم کے مسئلے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف اخلاقی قدروں اور قوتوں کی نوعی تنظیم پر اتنا زور دیا کہ ایک طرف روح کا سوال اور دوسری طرف معاشرتی سوال بظاہر اس ساری تنظیم میں سے کٹ گیا۔ بلاشک اخلاقی حد تک اس میں آفاق گیر ہونے کی صلاحیت تھی چنانچہ وہ پھیل کر خلاف معمول نیشنل حدود سے کہیں باہر نکل گیا۔ مگر پوری انسانی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے اسکی مثال ایک ایسے درخت کی تھی کہ جس کی ایک

منطق نہیں بلکہ ایک شعور و احساس اور ایک یقین ہے۔ منطق یقین کے کوچے کی ایک غلام ہے کہ جو یقین کی غاشیہ برداری کا کام دیتی ہے اور اس کے ساتھ چوبے بار لیتی رہتی ہے

جوابات

(الف) آج خالص مادی اعتبار سے امتِ اسلامی دنیا کی ایک کمزور امت ہے۔ لہٰذا اس پر فی الحال نگاہ نہ رکھی جائے بلکہ تاریخِ مذہب پر نظر رکھی جائے اس لئے کہ جب مذہب و اخلاق کے تسلسل کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائیگا تو صاف معلوم ہوگا کہ اس ملت کا نظامِ اعتقاد و تمدن تاریخ انسانی کا وہ آخر باب ہے کہ جس میں اس سے پہلے کی تاریخ مذہب اخلاق و روحانیت کا سارا بہترین خلاصہ مع کچھ امرِ زاید کے سمیٹ لیا گیا ہے۔ برہمن ازم، بدھ ازم، عیسائیت موجودہ تاریخ مذہب کے تین زندہ باب ہیں۔ برہمن ازم کا مذہبی دائرہ اخلاق و مذہب کا مسلسل ربط پیش کرنے سے ہر دور میں قاصر رہا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ قیمتی اور زرین باب اپنشد کے دور کو سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کا نہایت ایمانداراںہ خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ اس دور میں روح کے معمہ کو ہمیشہ کے لئے حل کرنے کیلئے سینکڑوں انسان سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے۔

جانبازو کامیاب کوششوں پر میں اعتراض کرنے کے لئے یہ کچھ نہیں لکھ رہا ہوں ان کوششوں نے تو پورے یورپ کو عناصر پرستی سے اور بدترین بت پرستی سے نجات دلاتے ہوئے ایک نصب العینی انسان کے ابن خدا ہونے پر متحد کیا۔ یہ کوششیں کوئی چھوٹی موٹی چیز نہیں۔ میں تو انسان کی اس معیاری حالت کے اعتبار سے انھیں ایک نقص بتا رہا ہوں کہ جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے۔ میری غرض یہ ہے کہ اس معیاری حالت کے سمجھنے سے جو جو حجات روک رہے ہیں انھیں ہر ممکن حد تک اٹھا دیا جائے اس لئے کہ آج انسانیت میں جو انتشار پیدا ہو گیا ہے اسکے سبب حضرت انسان یا تو صحیح اخلاقی و روحانی نصب العین سے اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو باندھتا ہوا ایک عالمگیر نظم کیطرف سمٹ آتا ہے اور یا اس کا ایک ایک عضو اور ایک ایک جز و ایک دوسرے سے کٹتا ہوا نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ چونکہ روح کے معاملے میں عیسائیت میں ایک نقص رہ گیا تھا لہذا اس کے نتیجہ میں خود اس کے اخلاق میں بھی ایک بنیادی نقص پیدا ہو گیا (اس لئے کہ اخلاق اپنے اصل کے اعتبار سے روح کی فرع ہے) یہ نقص کفارے کا مسئلہ تھا اس اعتقاد نے انسان میں اپنے تمام اعمال و کردار کے متعلق اپنی کمال ذمہ داری کا احساس پیدا نہ ہونے دیا۔ موجودہ عیسائی اقوام کی عیاشی اور صنفی اخلاق کی کمزوری کے مرکز میں بھی کفارے کا اعتقاد کارفرما ہے اور اسی اعتقادی خامی نے انسان کے تمام قوائے حیات میں تنظیم کامل پیدا نہ ہونے

طرف تو جڑیں ندارد ہوں اور دوسری طرف اسکی ساری شاخیں کاٹ دی گئی ہوں۔ انسانی زندگی کی جڑ اس کی مخصوص نوعی روح ہے جو خدا کے اعتقاد سے فطرتاً وابستہ ہے اور اس کی شاخیں اسکی معاشرتی دستوں تنظیم ہے اخلاق تو اس کا تنہ ہے اور کچھ نہیں۔ اب عیسائیت کو لیجئے اس نے روح اور اخلاق کے سوال کو ملا کر دونوں کو ایک ساتھ اور ایک انداز پر حل کرنے کی کوشش کی۔ گویا یہ کوشش بہترین شکل میں غیر شعوری طور پر اپنشدوں اور بدھ ازم کے پھل کو ملا دینے کی تھی۔ اور اس لحاظ سے کامیاب کوشش تھی، لیکن معاشرتی تنظیم انسانی کا سوال اس میں بھی سو فیصدی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے جو پوری اس کی تصدیق کرے گی۔ روح کے سوال میں عیسائیت میں خامی رہ گئی کہ روح کے بلا واسطہ خدا سے مربوط ہونے کے حق کو مسیح کے ابن اللہ ہونے کے حق میں ضبط کر لیا گیا۔ لہٰذا اگرچہ روح کے وصول الی اللہ کے سلسلے سے اس تحریک نے لاکھوں حجابوں کو پھاڑتے ہوئے انسان کو خدا کے بہت قریب کر دیا مگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کا ایک حجاب ضرور باقی رکھا۔ آگے چل کر جس میں اور ہزاروں مقدس انسان داخل کر دیے گئے۔ میں حضرت مسیح کی اپنی تعلیم کے متعلق کچھ عرض نہیں کر رہا ہوں بلکہ عیسائیت کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔ جس کا آغاز سینٹ پیٹر کے ایک خواب اور سینٹ پال کی عالمگیر تبلیغ سے ہوتا ہے اس میں انسان کی بیتاب روح اور اس کے محبوب خدا کے درمیان ابنیتِ مسیح یوم اول سے حائل کر دی گئی تھی سینٹ پال کی

سارے باطل ذرائع کی کلی نفی کردی جاتی ہے، لہذا التعمیر اخلاقی کے سلسلے میں جو مرکزی اصول معین کیا جاتا ہے وہ بھی کامل خودکفالتی اور کامل ذمہ داری کا اصول ہے اس سلسلے کا مرکزی ستون لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ہے۔ یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائیگا بلکہ ہر شخص اپنے اعمال میں خدا کے سامنے خود ذمہ دار ہوگا عیسائیت نے جس انسانی کمزوری کو سہارا دینے کے لئے کفارے کا مسئلہ پیش کیا تھا وہ یہ تھی کہ انسان اکثر اوقات اپنے اخلاقی فرائض کو پورا کرنے میں تنہا اپنے آپ کو ناکافی پاتا ہے، لہذا وہ تنہا نہ تو اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرسکتا ہے اور نہ اس حیثیت سے خدا کی کرسی عدل کے سامنے جوابدھی کی سکت رکھتا ہے لہذا کسی ثالث کی بیچ بچاؤ کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن اس شبہے کا یوں تدارک کرتا ہے کہ (الف) ایک طرف وہ پوری قوت سے یہ بتاتا ہے کہ خدا کی کتاب قانون میں کسی انسان کو اس بات کا پابند کرنے کی کوئی صورت نہیں کہ جس کے کرنے کی اس میں طاقت نہ ہو" لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی عملی صلاحیت سے زاید کسی چیز کا پابند نہیں کرتا" لہذا اس طرح وہ ان تمام وہمیات و وساوس اور خیالات کو یکسر اپنے محاسبے کی کتاب سے خارج کردیتا ہے جن کے رُو کے پر انسان اپنے آپ کو قادر نہ پاتا تھا اور جو اس کی عملی زندگی تک رسائی نہیں پاسکتے مگر جن کے فرضی وجود سے نجات پانے کے لئے ہیں سابقہ مذاہب کی مذہبی و اخلاقی و فقیہانہ کتابوں میں سیکڑوں قسم کے کفارے اور ریاضتیں

دی جس کے باعث شعور انسانی نے بے اطمینان ہو کر خود مذہب کے خلاف بغاوت کر دی اس کے مقابل اگر مغربی اقوام مسلمان ہوتیں تو ان میں نہ یہ بے اطمینانی ہوتی اور نہ مذہب سے بغاوت کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی۔ آج بھی اگر یورپ و امریکہ میں اسلام پھیل جائے تو دھریانہ بدنظمی ختم ہو سکتی ہے۔ اب اسلام کا یعنی امتِ مسلمہ کا دور آتا ہے۔ یہاں روحانی و اخلاقی و معاشرتی تنظیم کو ایک مربوط انداز عمل کی اجتماعی شکل دیجاتی ہے۔ یہاں ہر ہر فردِ انسانی اپنی روح کی ساری بیتابیوں ساری پیاسوں اور سارے نقائص کو دور کرنے کیلئے کسی عنصری یا انسانی بت کا سہارا لیئے بغیر خود اپنے خالق و مالک سے استغاثہ و فریاد کرتا ہوا اپنی تسکین و تکمیل کا سامان کر سکتا ہے۔ اس حیثیت سے اس کے درمیان اور اس کے خدا کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں چھوڑا جاتا سارے نفسی (Subjective) اور سارے آفاقی (objective) بتوں اور خداؤں کی کامل نفی کرتے ہوئے پوری انسانی بستی کے لئے وصول الی اللہ کی ایک شاہراہ کھول دیجاتی ہے۔ اور "لا الہ الا اللہ" کو تعمیر انسانی کی بنیادی اینٹ بنا دیا جاتا ہے اس کلمے کے معنے یہ ہیں کہ انسانی حاجت روائی کے لئے استغاثہ و فریاد و عجز و نیاز صرف ایک اللہ کی طرف کیجا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سارے طریقے شرک و کفر ہیں اس کے ساتھ کمال جد و جہد کو فرض انسانی قرار دیتے ہوئے درمیانی واسطے ختم کر دئے جاتے ہیں۔ چونکہ روحانی وصول الی اللہ میں سے

میں اسلام اکیلا ہے۔ اس نے معاشرتِ انسانی کی تعمیر نوعی شرافتِ
انسانی کے اصول پر کی ہے۔ یعنے اس اعتقاد پر کہ نوعِ انسانی ساری
کائنات کی اشرف ترین مخلوق ہے اور وہ باقی تمام کائنات اور
اس کی قوتوں کو اپنی بقا و فلاح کے لئے استعمال کرسکتی ہے۔ حیوانات
ہوں یا نباتات و جمادات ہوں انسان سب کو اپنے لئے استعمال کرسکتا
ہے وہ صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک سے کم ہے اور اس کا نائبؔ خلیفہ
ہے۔ باقی سب کائنات سے اشرف ہے مگر اس کی شرافت و خلافت
اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو مضبوط و مکمل کرنے پر مبنی ہے لیکن اگر
وہ ان روحانی صلاحیتوں کو نظر انداز کردے تو بلاشک وہ بدترین درندہ
اور مفسد ترین کائنات ہے۔ یہ ہے پوری تکمیلِ انسانی کا پروگرام۔
بلاشک جو امت یا ملت اس پروگرام پر اعتقاد رکھتی ہے صرف اسی کو
اور محض اسی کو "خدا کا منتخب گروہ کہا جا سکتا ہے" اس کے علاوہ جس
جس گروہ نے بالاستقلال انسان کے اخلاقی یا روحانی یا دونوں کے
ملے جلے انضباط و تنظیم کی کوششیں کی ہیں وہ بھی اپنے اپنے وقت کے
منتخب گروہ تھے۔ مثلاً بدھ کی تنظیم اخلاقی کے علمبردار اپنے وقت میں
اور حضرت مسیح کی تنظیم کے علمبردار اپنے وقت میں اور ویدوں و اسنتوں
کے علمبردار اپنے وقت کے منتخب گروہ تھے۔ مگر جب یہ تنظیم اپنے
آخری مرحلے پر پہنچ کر روح و اخلاق و معاشرت کے تینوں سوالوں
کو اپنے اندر لپیٹتی ہوئی ایک کامل و اکمل شکل اختیار کرتی ہے تو اب

نظر آتی ہیں یہاں تک کہ انسانی ہستی کا بہترین حصہ انہیں خیالاتی اور وہمی گناہوں سے بچنے کے لئے جنگلوں میں ناپید ہوتا دکھائی دیتا ہے
(ب) دوسری طرف وہ انسان کے لئے بلا واسطۂ غیر دعا کا ایک ایسا عام راستہ کھولتا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان ہر ہر قدم پر خدا کی امداد کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اس طرح کامیاب طریق سے ان سارے خیالی و وہمی اور وسوسے کے درجے کے گناہوں سے نجات پا لیتا ہے ساتھ ہی اپنی عملی کمزوریوں کا تدارک کرتا جاتا ہے۔
(ج) تیسری طرف وہ خدا کا تعارف قدم قدم پر اس کے عادل ہونے کے ساتھ ساتھ رحمان، رحیم، عفو، غفور، سلام، مومن، غفار، وہاب، رزاق، وفتاح، حلیم وغیرہ صفات سے کراتا جاتا ہے۔ یہ تین باتیں ملکر ایک طرف انسان کی قوتوں کو خالص عملی زندگی تک محدود رکھتی ہیں اور وہمیات و وساوس کی کائنات سے فضول الجھاوے سے بچا لیتی ہے۔ دوسری طرف انسان کی اخلاقی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی جاتی ہیں اور تیسری طرف غایت درجہ خود اعتمادی پیدا کرتی ہوئی کسی غیر الٰہی تصور کی طرف جھکنے سے کمال بے نیازی پیدا کرتی جاتی ہیں یہ ہے روح انسانی کی کمال آزادی اور یہ ہے اخلاق انسانی کی کمال تکمیل۔ اسلام کے علاوہ تاریخ مذہب کے جن تین دوروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے چونکہ کسی ایک نے معاشرتی تنظیم انسانی کی کوئی اصولی کوشش نہیں کی لہذا اسباب میں اُن کے اور اسلام کے مقابلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس باب

محدود کر دی گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی تاریخ کے ہر طالب العلم کو یہ حق بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ رکاوٹ اس تنظیم کی راہ میں ملوکیت اور شخصی بادشاہت نے پیدا کی تھی جس کا اُس وقت کی ساری تاریخ انسانی پر کامل قبضہ تھا لیکن آج جب خود یہ شخصی بادشاہت حرف غلط کی طرح دنیا سے مٹائی جا رہی ہے تو پھر توحیدِ خدا، اخوت انسانی اور عالمگیر شرافت و خلافتِ انسانی کے اس نظم کو بحال کرنے میں کونسی رکاوٹ ہو سکتی ہے؟ کیا اگر آج ہندو سوسائٹی جو اپنے نظامِ تمدن کے پورے ڈھانچے کو بدل دینے کے لئے مجبور ہو گئی ہے اور جسے کاسٹ سسٹم اور اس کے متعلقات کو ختم کرنے کے سوائے کوئی چارہ کار ہی نہیں سوجھتا اسی اسلامی زندگی کو عملاً اپنا لے تو کیا اس میں کوئی شک رہ جاتا ہے کہ چند برسوں میں انڈونیشیا سے مراکش تک ایک ہی سیاسی و معاشرتی و اخلاقی و روحانی معتدل نظم قائم ہو جائے اور جس طرح انھوں نے جمہوریت کے تقاضوں کو سمجھتے ہو۔ اپنے ہاں کی شخصی ریاستوں کو ختم کر دیا ہے کیا اس طرح مشرقِ وسطیٰ میں بھی ان کی یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی؟ اور اس طرح صحیح اور عالمگیر انسانی تنظیم کی طرف ایک معین قدم طے نہ ہو گا؟ امریکن اور روسی کشمکش جو صرف ایک اقتصادی کشمکش ہے اور انسان کی اخلاقی و روحی زندگی سے اُسے کوئی بھی واسطہ نہیں وہ انسانیت کو کسی بھی حقیقی منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہنچا سکتی۔ لہٰذا ہم نے مشرقِ جدید کے بڑے حصے کو اگر ایک صحیح انسانی تنظیم میں لپیٹ لیا تو بلاشک ان دو حریفوں کی ایک خونریز آویزش کے

صرف اسی کے ماننے والے "خدا کا منتخب گروہ" ہوں گے۔ اب اگر یہ لوگ اپنی معیاری حالت سے گر جاتے ہیں تو ساری انسانیت کے بھلے آدمیوں کا کام ہے یا تو اُن میں شامل ہو کر انہیں پھر اصلی مقام پر لاتے ہوئے کائناتِ انسانی کے موجودہ عالمگیر سوال کو حل کریں اور یا سارے انسانی دائروں کے یہی بھلے لوگ خود اسی حق کو مستقل طور پر خود لے لیں اور اسے اپنی معیاری شکل پہ قائم کرتے ہوئے انسانی راہِ نجات متعین کریں۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری راہ موجود نہیں۔ اگر نہ یہ کیا جائے اور نہ وہ کیا جائے بلکہ مسلمانوں کی رو بتنزل حالت سے محض حاسدانہ یا دشمنانہ فائدہ اٹھاتے ہوئے خود انہیں کی ہستی کا انکار کر دیا جائے یا ان کی ہستی کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جائے یا اپنے اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کو قائم رکھنے کیلئے "تم بھی سچے ہم بھی سچے" قسم کی جھوٹی اور منافقانہ رواداری کا ڈھول پیٹا جائے تو موجودہ دورِ تاریخ میں یہ چیز تقدیرِ انسانی سے بد ترین غداری ہوگی۔ آج عالمِ انسانی کو صحیح ترین نصب العین اور صحیح ترین طریقِ کار کے ماتحت ایک ہی عالمگیر تنظیم میں لانا تاریخ کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ یہ ہے اس سوال کا جواب۔ مجھے اس بات کا کھلا اعتراف ہے کہ آج عملاً امتِ اسلامی کے پاس محمدی رابطہ و ضبط و نظمِ اخلاقی و روحانی کا دسواں حصہ بھی موجود نہیں۔ بلکہ ہر پڑھا لکھا مسلمان اسے کھل کر تسلیم کرے گا کہ یہ نظم خلافتِ راشدہ کے بعد ہی ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ صالح عمرانیت صرف افراد تک

خواب دیکھ لینے سے کبھی مذہب اور انسانی معاشرتیں بن جایا کرتی ہیں؟ ایسی تجویزیں تو عملاً ایک خواب رنگین کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ مذہبی و اخلاقی حیثیت کے بعد اس کے سیاسی و اقتصادی نتائج کو بھی ایک نظر سے غور کر لیجئے (ک) خالص سیاسی اعتبار سے چین غیر جانب داری کے بجائے روس کا کھلا ساتھی اور حلیف ہو چکا ہے بلکہ قطعاً کسی آنے والی جنگ میں وہ آج ہی سے کود بھی چکا ہے۔ اگر امریکہ اور روس میں جنگ شروع ہوگئی تو عجب نہیں کہ روس اپنی جنگی تدبیر کے پیش نظر خود چین ہی کو آگے کرتے ہوئے خود اپنا بچاؤ کرنے کی تدبیر کرے۔ میری نگاہ میں کوریا میں چین کو صرف اسی جنگی تدبیر کے پیش نظر روس نے دھکیل دیا ہے اور خود اقوام متحدہ میں کبھی صلح اور کبھی جنگ کی آواز بلند کر دیتا ہے لہذا ان حالات میں چین کے ساتھ کسی اخلاقی و روحانی و معاشرتی و سیاسی اتحاد میں شمولیت کرنے سے پہلے ایسا کرنے والے کو سو فیصدی یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ وہ آیندہ کی کسی عالمگیر خون ریزی میں پوری طرح شامل ہو رہا ہے اس لئے کہ ایسے عالمگیر معاشرتی اتحاد کے بعد ہند و چین دونوں کا میدان جنگ اور محاذ صلح صرف ایک ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اتحاد حقیقی ہے تو پھر اس کے یہ نتائج بھی حقیقی ہیں (۲) انسانی آبادی کے اعتبار سے عالت یہ ہے کہ ہند و چین دونوں ملکر ساری کائنات انسانی کا سب سے زیادہ گنجان علاقہ بن جاتا ہے۔ اور اقتصادی طور پر ایک دوسرے کے لئے ایک پریشان کن

کے بعد انشاء اللہ ہمیں لوگ اس نئے نظام کو سارے عالم میں کامیاب کریں گے اور مغرب کی تھکی ہوئی قومیں ہمیں خیر مقدم کہیں گی۔ بہرصورت امت اسلامی یا اسلام کے افکار میں انسانیت کا کامل نصب العین تاریخ کی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے لیکن اس کے اپنانے سے فلاح انسانی کی طرف ایک واضح قدم طے ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں کمیونسٹ رجحان رکھنے والا ایک پڑھا لکھا گروہ ایسا بھی ہے جو چین و ہندوستان کو ایک کرتے ہوئے کسی نامعلوم دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھ رہا ہے۔ چونکہ مستقبل کی تاریخ انسانی کے لئے ہندوستان کا کوئی بھی فیصلہ بڑے نتائج پیدا کرنے والا ہے لہذا اس خواب کے نتائج پر غور کرنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ آئیے پہلے اس کے نتائج کو خالص روحانی و اخلاقی اعتبار سے دیکھیں۔ آئیے فرض کریں کہ ویدک دھرم کے خدا کے اعتقا اور بدھ کی اخلاقیت کے سنگھم سے ایک نیا تمدن پیدا کیا گیا ہے۔ میں صدر کی معروضات کی روشنی میں ان سارے بھائیوں سے پوچھتا ہوں کہ (الف) اس کوشش کے سو فیصدی کامیاب ہوجانے پر بھی کیا وہ عیسائیت سے بہتر کوئی چیز پیدا کرسکیں گے۔ اس میں بھی تو خدا کا اعتقا اور ایک معین اخلاقیت موجود ہے ۔(ب) دوسری بات یہ پوچھنا ہے کہ ان کروڑوں بت خانوں اور کروڑوں دیوی دیوتاؤں سے کس طرح نجات مل سکیگی جو یہاں کی روایات کی روح بنے بیٹھے ہیں؟ (ج) تیسری بات یہ پوچھنا ہے کہ کیا چند پڑھے لکھے آدمیوں کے کوئی اچھا فکر

دی ہے کیا اُسے قبول نے کے بعد صدر کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے یا باقی رہتا ہے ؟۔ بلاشبہ میری دعوت قبول کر لینے کے بعد مشرق کے تمام ملکوں میں جو جو ہندوستانی اس وقت ہے وہ اس نئے نظم انسانی کا علمبردار ہو کر ہر ہر جگہ نسلی تنگ نظری معاشی عدم مساوات اور باقی اخلاقی و روحانی وہم پرستی کے خلاف لڑنے والا ایک مبلغ ہو جاتا ہے۔ ہمارا آبادی کا سوال بھی چند برسوں میں حل ہو گا جس قدر ایک خدا اور ایک انسانی بھائی چارے کا اعتقاد جڑھ پکڑتا جائیگا اسی قدر نسلی لسانی اور جو گریفیکل تنگ نظریاں ختم ہوتی جائیں گی اور دنیا دیکھے گی کہ کس طرح سطح زمین بدلنا شروع ہو گئی ہے۔ بلاشک روس و امریکہ کی ایک عالمگیر آویزش کے بعد ساری زمین کی سطح اس اعتقاد کے پھیلنے کے لئے بالکل ہموار ہو جائے گی - اس وقت مشرق کی طرح مغرب بھی ہمارا بھائی ہونے کے لئے آمادہ ہو گا۔ امید ہے کہ اصل سوال سے ہٹ کر وقت کے اس ضروری مسئلے کی طرف توجہ دلانا غیر ضروری نہ سمجھا جائیگا اب دوسرے سوال کا جواب شروع ہوتا ہے۔

(ب) دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام تاریخ انسانی کے عام سلسلے کی ایک کڑی نہیں بلکہ وہ تاریخ انسانی کی اپنی مخصوص نوعی حرکت (اخلاقی و روحانی حرکت) کی آخری کڑی ہے۔ انسان بمقابل حیوان کے ایک مخصوص روحانی و اخلاقی شعور کی ایک نئی

بوجھ بن سکتا ہے جس کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ مستقبل میں جب امریکہ اور روس لڑتے لڑتے کمزور اور تہس نہس ہو جائیں گے اور ہند و چین اپنی میکیانیائی صنعت وحرفت میں امریکہ اور روس جتنی قوت حاصل کر لیں گے تو پھر دو چار چنگیزوں اور تیموروں کو قبروں سے جگاتے ہوئے ساری دنیا کو فتح کر لیا جائیگا اور آبادی کا سوال حل کر لیا جائیگا۔ بظاہر یہ بڑا زوردار خیال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ چلی کے حافظے کی پوری کتاب چرالی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ چلو ایک منطقیانہ فرضیے کے طور پر اسے بھی صحیح مان لو۔ اور سمجھو کہ ایسا ہی ہو گیا۔ میں اپنے بھائیوں سے پوچھوں گا کہ فتح کر لینے کے بعد تم دنیا کو کونسا عملی نظام روحانی، نظام اخلاقی اور نظام معاشرتی عالم انسانی میں قائم کرو گے؟ یہی کہ جتنے آدمی اتنے ہی خدا اور اتنے ہی راہِ نجات ہیں۔ یہی کہ انسان اپنی قدر و قیمت میں گائے بھینس گنگا جمنا اور بڑھ پیپل سے گھٹیا ہے! میرے بھائیو! یہ تو کوئی انسانی فلاح نہ ہوئی۔ گویا گذشتہ چار ہزار برس میں انسان کا روحانی و اخلاقی و معاشرتی نقطہ نگاہ جس قدر صاف ہوا تھا اُسے تم نے تہ و بالا کر دیا لیکن اس کے مقابل ایک خدا ایک انسانی بھائی چارے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے جس نظام انسانی کو پوری طرح اپنا لینے کے متعلق اور فی الحال انڈونیشیا سے مراکش تک کو ایک نظم میں لانے کے متعلق صدر میں دعو

چونکہ انسان پیٹ اور نسلی بقا کے سلسلے میں حیوانات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے لہذا جس وقت اس کا روحانی و اخلاقی شعور و احساس اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بہیمی جذبات ورجحانات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا اور ساتھ ہی اس کے ماحول میں کچھ ایسی چیزیں رونما ہوتی ہیں جو اس کے حیوانی جذبات کو بڑھکا دیتی ہیں تو ایسے اوقات میں انسانی افراد ایسی حرکات و سکنات میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ جن میں ان کا اخلاقی و روحانی تسلسل نظاہر گم ہو جاتا ہے اور ان کے جذباتِ حیوانی نمایاں ہوتے ہیں۔ عام مورخانہ زبان میں جسے تاریخ انسانی کہا جاتا ہے وہ اکثر و بیشتر افراد و طبقاتِ انسانی کی ایسی ہی گمراہیوں کے ریکارڈ پر مشتمل ہے۔ لیکن حقیقی فطرتِ انسانی کی روشنی میں ایسے سارے اجزا تاریخِ انسانی کے ریکارڈ سے خارج ہیں اور بقائے انسانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بعض تاریخ انسانی سے خارج کرتے ہوئے مخصوص فطرتِ انسانی کے اجزائے ترکیبی کی روشنی میں انسانی تاریخ کی ترتیب و تدوین کی جائے۔ انسان ابھی فطرت کے پیٹ میں ایک جوہر مخفی کی حیثیت میں محوِ حرکت ہے۔ اس کے مخصوص نوعی قوا ابھی کمالِ بالیدگی کے مقام سے بہت نیچے ہیں۔ وہ ابھی اس درجہ نہیں ابھرے کہ اپنی پوری نوعی کل کو خود ہی چلا سکیں لہذا اکثر اوقات یہ کل حیوانی جذبات کے سرکش گھوڑوں کی بدلگامی کا شکار ہو ہو کر ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ لہذا

کائنات ہے۔ اس مخصوص روحانی و اخلاقی شعور کو ایک طرف چھوڑ دیا جائے تو انسان بعض باتوں میں تاریخِ حیوانی کا ایک جزو ہے بعض باتوں میں تاریخ نباتات کا ایک جزو ہے اور بعض باتوں میں تاریخ جمادات کا ایک جزو ہے۔ روحِ بقائے نسل اور صنفی جذب و انجذاب میں وہ حیوانات کے ساتھ کلی مطابقت رکھتا ہے۔ نشو و نما میں وہ نباتات کے مشابہ ہے اور ایک ٹھوس جسم رکھنے میں وہ جمادات کے مساوی ہے۔ لہٰذا ان تین دائروں میں اس کی تمام حرکات و سکنات حقیقت میں اسکی اپنی مخصوص نوعی تاریخ کا حصہ نہیں اس حیثیت میں وہ اشرف المخلوقات نہیں۔ اسکے اپنی نوعی مقام کا آغاز اسکے اپنے مخصوص روحانی و اخلاقی شعور سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اسکی اپنی مخصوص تاریخ کی کڑیاں صرف وہ تحریکیں ہو سکتی ہیں کہ جو اسکے اخلاقی و روحانی شعور کی زیر نگرانی چلی ہیں اور اس سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام تاریخِ انسانی کا آخری باب ہے۔ لہٰذا اس کی یہ تکمیل و خاتمیت کی شان اس وقت تک بحال رہے گی اور انسان کے نوعی نصب العین کی بقا کا تقاضا ہے کہ وہ اس وقت تک بحال رہنی چاہیئے کہ جب تک اس سے جامع تر شکل میں کوئی اور روحانی و اخلاقی انقلاب اس سے جامع تر اخلاقی و روحانی نتائج پیدا کرتا ہوا اس سے جامع تر ریکارڈ قائم نہ کرے۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہوئے تب تک کسی شداد کی فرضی بہشت کے انتظار میں اپنی موجودہ بنگلیا جلا دینا شیخ چلی کی اولاد کا کام ہو گا یا انسانیت دشمنی ہو گی اور تیسرا کوئی امکان نہیں۔

بجائے تاریخِ حیوانی کا حصہ ہے جو ابھی تک اشرف المخلوقات پر لپٹا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو توفیق دے کہ وہ اُسے اپنی حدود سے خارج کر دے۔ انسانی برادری کو اس کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ع "کوشش کرے انسان تو کیا نہیں ہوتا؟"

عالمِ انسانی کی فلاح کا مفہوم

تاریخ کا ایک نقطۂ انقلاب

جس وقت نوعِ انسانی کا روحانی و اخلاقی شعور اس درجہ بیدار و قوی ہو جائیگا کہ وہ نوعِ انسانی کی تمام انفرادی و اجتماعی زندگی پر چھا جائے اس کی تمام حیوانی رجعت پسندیوں کو ختم کر دے اور ماحول کے ہر قسم کے دباؤ اور ترغیب کو رد کرتے ہوئے اپنے سارے کاروبار کو خود ہی چلائے اس وقت نوعِ انسانی کی فلاح کی صبحِ اول ہوگی۔ اس وقت نوعِ انسان پر سے زمان و مکان کے زنجیر کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائیگا۔ اور اس وقت اس کی زندگی ایک اجاڑ گورستانِ آرزو و تمنا ہونے کے بجائے فلاحِ حقیقی کا ایک نور زار ہو جائیگی انسان میں نوعی طور پر اس منزلِ ارتقا کی طرف بڑھنے کی صلاحیت کاملاً موجود ہے۔ انسان کے جزا و سزا و عذاب و ثواب کی بنیاد

ضرورت ہے کہ انسان کو حیوانی تنازع للبقا کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے اس کی اپنی مخصوص فطرت کی دھیمی سی رفتار کی روشنی میں سمجھا جائے۔ کیا متفیل کا مورخ یا کارل مارکس کی امت اس انسانی تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے؟ ہاں تو حیوانی جذبات کی ہمہ گیری کے دباؤ میں انسان سے جو کچھ سرزد ہوا ہے یا ہوتا ہے انھیں انسان کی حیوانی رجعت پسندیاں اور ماحول کے دباؤ کے ماتحت غیر فطری انتہا پسندیاں کہنا زیادہ درست ہے۔ ان کی اصل انسان کی مخصوص انسانی فطرت میں موجود نہیں۔ بلکہ ان کی جڑھ یا حیوانی فطرت ہے کہ جو انسان کے ساتھ ابھی جزوِ غالب کی طرح چپکی ہوئی ہے یا ماحول کی غیر ضروری اکساہٹ ہے۔ مخصوص انسانی فطرت (یعنے اخلاقی وروحانی شعور، احساس) ممکن ہے کہ کمزوری کی حالت میں ان حرکات کو برداشت کرلے مگر قوت اور سکت کی صورت میں وہ ان کی اجازت ہرگز نہیں دیتی۔ تاریخِ انسانی تو حقیقت میں صرف ان واقعاتِ انسانی کا نام ہے کہ جن میں انسان کا اپنا خاص اخلاقی وروحانی شعور محرکِ تام (SOLE MOTIVE) کی حیثیت سے کارفرما ہے۔ اگر یہ شعور عالم انسانی میں کم ہے تو اس کو اجاگر کرنے قوی کرنے اور ہمہ گیر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ حقیقی بقا و ارتقائے انسانی تو اسی کی ہمہ گیری سے ہے اور اسی کی ہمہ گیری کا نام ہے۔ اور جس سلسلۂ حرکت و عمل میں یہ شعور محرکِ تام کی حیثیت سے موجود نہیں وہ تاریخ انسانی کے

و اخلاق کے واضح ریکارڈ پر ایک نظر کر لینے کی ضرورت ہے تاکہ تعصب و تنگ نظری اس معیاری باب کے سمجھنے سے روک نہ بنے۔
اپنشد کے جانباز اساتذہ کی روحانی مساعی مسلّم مگر ذرا اس پر انسان کے خالص آفاقی عمران کے اعتبار سے اور اخلاقی و معاشرتی (سوشل) اعتبار سے نظر ڈالئے تو مایوسی کے سوائے آپ کے ہاتھ کیا آئے گا؟
مہاتما بدھ کے اخلاقی استقلال کی حیرت انگیز جرأت مسلّم مگر ذرا خالص روحانی یا خالص معاشرتی تنظیم کے اعتبار سے اس پر غور کرو تو سوائے ناکامی کے تمھیں اور کیا سبق ملے گا؟ کہا جاتا ہے کہ روحانیت کے خلا کو پر کرنے کے لئے مہاتما بدھ کے پانسو برس بعد ان کی امت نے پوجا پاٹ کے لئے کچھ طور طریقے معین کئے۔ غالباً خود مہاتما بدھ کی مورتی پوجا کا راستہ معین کیا ہوگا مگر اس سے اخلاقی استقلال کے عقیدے پر جتنی ضرب پڑتی ہے وہ ظاہر ہے اس کے معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ نروان کے لئے اخلاقی قدروں کا استقلال ناکافی تھا لہذا ایک مقدس ہیرو کی پوجا ضروری سمجھی گئی۔ گویا اب اس نے عیسائیت کی سی صورت اختیار کر لی اب عیسائیت پر نظر ڈالو۔ اس میں ایک شرک آلود روحانی تسکین اور ایک ناکافی و غیر ذمہ دارانہ اخلاقیت کا پتہ چلے گا مگر ذرا ٹھوس معاشرتی تنظیم انسانی کے اعتبار سے بھی اس پر نظر ڈال لو تو تمہیں اس دائرے میں سوائے ایک خلا کے کچھ نہ ملیگا۔ اب ذرا ایمانداری سے بتاؤ کہ پورے نوع انسانی کی

درحقیقت یہی صلاحیت ہے ہاں اگر انسان روحانی و اخلاقی محاکمے کو لگاتار نظر انداز کرتا جائے اور اپنے اعمال کی بنا اس محاکمے کی نفی پر رکھدے تو پھر اس پر ایک وقت آجاتا ہے کہ حقہ بیان کی واقعیت اس کے لئے اس طرح مشتبہ ہو جاتی ہے کہ جس طرح ایک گدھے کے سامنے افلاطون و ارسطو کی منطق یا ایک مردار خوار گدھ کے سامنے عطر و مشکِ عنبر کی حیثیت مشتبہ ہے جب انسان حیاتِ حیوانی پر ایک مخصوص روحانی و اخلاقی شعور کے اضافے کا نام ہے تو پھر فلاحِ انسانی کے معنے سوائے اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اسی مخصوص شعور کو کائناتِ انسانی میں پورا رواج اور کلی غلبہ حاصل ہو۔ لہذا تمام وہ تحریکیں کہ جو اس شعورِ خاص کو اور کاروبارِ انسانی میں اس کے محاکمے کو نظر انداز کرتے ہوئے چلی ہیں یا چل رہی ہیں وہ سوائے اس کے کیا نتائج پیدا کر سکتی ہیں کہ انسان کو اپنی فلاحِ نوعی کی راہ سے ہٹا کر پوری بے تمیزی سے اُسے پھر حیوانی گلے میں شریک کر دیں؛ لہذا اس لحاظ سے اسلام تاریخِ انسانی کے ریکارڈ کی ایک عام تحریک ہرگز نہیں بلکہ وہ انسانی کے نوعی نصب العین کے حصول کی آج تک کی آخری کڑی ہے جس نے پہلی دفعہ نوعِ انسانی کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے مخصوص روحانی و اخلاقی شعور میں پیٹتے ہوئے بحیثیت مجموعی اپنے نصب العین کی طرف ایک واضح حرکت دی۔ اس مقام پر پھر ایک دفعہ سابقہ تاریخ روحانیت

ور جو چند روایات ان کے حلقوں میں موجود ہیں وہ اسی کو تمام کائنات
ین سمجھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی خود کفیل قناعت کسی بھی مجاہدانہ
یا مجتہدانہ دینی کوشش کے لئے سم قاتل ہے (د) جو لوگ مغربی تمدن
و فکر سے متاثر ہو کر کوئی دینی کام کرنا چاہتے ہیں ان میں سے اکثر و
بیشتر کی نگاہیں صرف چند معاشی و معاشرتی و علم الکلامی مسائل تک
محدود ہیں لہٰذا وہ کوئی مفید اور عملی خدمت انجام دینے کے بجائے محض خیالی
منطقیں اور سوفسطائیانہ انداز کے مغالطے پیدا کرنے میں مصروف ہیں
جو ملت اسلامی میں ٹھوس دینی شعور پیدا کرنے کے بجائے یا کوئی ٹھوس
عملی چیز اس کے ہاتھوں تک پہنچانے کے بجائے اسے اوہام پرست اور ایک
خیالی امت بنانے کا کام کر سکتے ہیں عملی قدر و قیمت کے فقدان کے ساتھ
ان کی اساس بعض وقت غایت درجہ جاہلانہ خودسریاں اور بعض وقت
خود غرضیاں ہوتی ہیں۔ اگر ان سب مساعی کا واقعاتی تجزیہ کیا جائے تو شاید
اس سے دس صفحے کا کوئی فقیہانہ خاکہ بھی تیار نہ ہو سکے۔ یہ ہے اس
امت کی حالت جو کبھی اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا
رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ کا پیغام لیکر ساری کائناتِ انسانی کو ایک کرنے
پر کھڑی ہوئی تھی۔ اگر خداوند کریم ان سب کے نفاق کو جلا کر خاک کر دے
انہیں اپنی خامیوں کو سمجھنے کی توفیق دے اور ساتھ ہی محمدی نصب العین
کا یقین بخشے اور وہ سب اسلامی ممالک کے علمائے فقہا و مورخین و صوفیا
و چیدہ سیاسی کارکنوں کی ایک مستقل مجلس شوریٰ کا قیام کریں کہ جو

انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام دائروں کو ایمان و یقین ا
روحانی و اخلاقی شعور واحساس میں لپیٹتے ہوئے اس کی پوری
زندگی میں سے تضاد و دو رنگی ختم کرنے اور بحیثیت مجموعی اُسے
اپنے مخصوص نوعی نصب العین کی طرف حرکت دینے کا سامان سو
محمد رسول اللہؐ اور اسلام کے کہاں ملتا ہے؟ اگر تاریخ کے اس صریح
محاکمے کے باوجود بھی کوئی دشمنِ انسانیت گروہ اسے بھی ختم شدہ
باب قرار دینا چاہتا ہے تو اس کی غرض جان کر یا جہالت کے باعث
کائناتِ انسانی کی اخلاقی و روحانی انارکی کے سوائے کچھ نہیں ہو سکتا
ہاں اس ریکارڈ کی اتنی عالمگیر وضاحت کے باوجود اس کے موجودہ
عملی نظام میں جو خلل آگیا ہے تمام کائناتِ انسانی کے سارے بھلے
آدمیوں کا فرض ہے کہ اس خلل کو دور کریں۔ موجودہ مسلم اقوام شاید
اُسے یا تو انجام ہی نہ دے سکیں گی اور یا کہیں دیر میں اُسے انجام
دیں اس کے کچھ اسباب ہیں (الف) مثلاً موجودہ تمام مسلم ممالک اس
فیوڈل نظام میں الجھے ہوئے ہیں کہ جسے ملوکیت نے پیدا کیا تھا اور
جس سے ایک مشتبہ تمدن پیدا ہو چکا ہے اور جس کے ساتھ مذہبی روایات
کو بھی فقہا نے بُن دیا ہے (ب) موجودہ اکثر و بیشتر مسلم ممالک
گذشتہ چالیس پچاس برسوں سے یورپ کے پیدا کردہ نیشنل ازم میں
گھر چکے ہیں۔ اُسے انھوں نے اپنا لیا ہے (ج) جو فقیہانہ یا خانقاہی
حلقے ان ممالک میں موجود ہیں وہ اپنی اپنی حالتوں پر قانع ہیں

اخلاقی شعور کی کمال بیداری سے سارے بنی نوع انسان کی اقتصادی
تقدیر بھی خود سے خود ایک ہوسکتی ہے۔ نہیں بلکہ ایک ہوجاتی ہے
صرف اسلامی تنظیم کو پھر سے عالمگیر انداز پر اپنانے کا پھل ایسا کامیاب
اتحاد ہوسکتا ہے۔ لہذا اُسے ختم شدہ قرار دینے کے بجائے اُسے اصولی
شکل میں پھر سے اپنانے کی ضرورت ہے۔ کانگریس نے ایک دفعہ پہلے بھی
خلافت تحریک کو چلایا تھا۔ لہذا ابھی در اندازوں کے بجائے اگر مخلص
انسانوں کا کوئی گروہ لیگ اور کانگریس کو قریب کرنے کی کوشش
کرے تو یہ کام ہوسکتا ہے۔ ہندوستانی ملت کے ذہین ترین فرد
جناب مولوی ابوالکلام آزاد صاحب اور ان کی پارٹی اگر جان
جوکھوں میں ڈالکر اس کام کو انجام دلانا چاہیں تو امید کرتا ہوں کہ
اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو ناکام نہ کریگا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب
ہوں کہ آخری آیام میں یہ صرف مولوی صاحب موصوف اور ان کی
پارٹی تھی کہ جو ہندو مسلم سیاسی سمجھوتے کی راہ بار بار روکتی تھی جس کے
نتیجے میں دو ملتیں دو متخالف راہوں پر گامزن ہیں۔ اگر ایک دفعہ یہ
سیاسی سمجھوتہ ہوگیا ہوتا تو اس کا دوسرا قدرتی قدم ایک معاشرتی انقلاب
ہوتا جو بلا شک وشبہ سارے مشرق کے سوال کو ہمیشہ کے لئے حل کردیتا
ہندو سوسائٹی بھی ایک معاشرتی انقلاب کے لئے مجبور تھی اور ہے اور
مسلمان سوسائٹی بھی موجودہ عالمگیر جمہوریت کے دور میں اپنے فیوڈل
اور خانقاہی قسم کے دو متوازی نظاموں کو بدل کر پھر توحید اخوت

سیاسی ہنگاموں کے جواز و عدم جواز کے فتوے دینے کے بجائے اس صورتِ حال کا کوئی دینی جامع و مانع جواب تیار کرے کہ جس سے ایک طرف کمیونزم اور مغربی امپیریل ازم کی ہوسِ عالمگیری سے نجات کی راہ معین ہو سکے تو دوسری طرف اپنے اندرونی انتشارِ ملی کا علاج بھی کیا جا سکے شاید کوئی مفید قدم اٹھایا جا سکے۔ ورنہ موجودہ حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ شاید زمین کا ایک چپہ ان کے ہاتھ نہ رہے۔ میری اس وقت بھی یہ دعا یہ آرزو اور یہ تمنا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ آف پاکستان ایک دفعہ پھر ہاتھ ملائیں اور پہلے قدم پر تو انڈونیشیا سے مراکش تک کیلئے ایک خارجی دفاعی اور اقتصادی پالیسی بنا ڈالیں اور دوسرے قدم پر محمدی نصب العین کو جس قدر اصولی شکل میں اپنانا ممکن ہو اسے اپناتے ہوئے تعمیرِ انسانیت کا ایک خالص روحانی و اخلاقی ماڈل تیار کر ڈالیں جس سے پوری انسانی بستی کو یہ معلوم ہو سکے کہ انسان کی حقیقی تنظیم اقتصادی حیوانی تنازع للبقا سے نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی رجحانات پر عالم گیر تمرکز سے ہو سکتی ہے۔ انہیں یہ بھی محسوس ہونے لگے کہ انسان اخلاقی و روحانی شعور کی کمال تربیت کے ضمن میں اس کا اقتصادی سوال خود بخود اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ کائنات کے ایک افتادہ کونے کا ایک بھائی اسی کائنات کے دوسرے کونے میں ہوتے ایک بھائی کے رنج و غم کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسی روحانی

کڑیاں ہماری گذشتہ تاریخ میں موجود ہیں ان میں سب سے جامع کڑی محمدی حرکتِ تنظیمی ہے (۱۳) اوراب فلاحِ انسانی صرف اس میں ہے کہ اُسے اصولاً اپناتے ہوئے موجودہ عالمگیر بحران اور الجھاوے سے نجات کی راہ نکالی جائے۔

محمد رسول اللہؐ نے کسی موقعہ پر ایک مثال دے کر بتایا تھا کہ مذہبی تعمیر مختلف مقدس انسانوں کے ہاتھوں قریبًا مکمل ہو چکی تھی مگر اس میں ایک اینٹ کی کسر تھی میں وہ آخری اینٹ ہوں اوراب یہ تعمیر مکمل ہے۔ اب تاریخِ مذہب کے تسلسل کو ایمانداری سے دیکھتے ہوئے اس بیان کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کس قدر سچا بیان ہے۔

لیکن جو شخص تاریخ حیوانی کے مقابل تاریخ انسانی کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہے اوراُسے تاریخ حیوانی کے باب کا ایک جزو سمجھتا ہے اور اسی حیثیت میں وہ تاریخِ حیوانی کے بعض نتائج کو عالمِ انسانی کا نصب العینی چارٹر بناتا ہوا سارے عالمِ انسانی کو اس کی دعوت دیتا ہے وہ درحقیقت عالمِ انسانی کا ایک دشمنِ اعظم ہے محض نیک نیتی کا فائدہ دیتے ہوئے اس کے خیالات کو انسانی کشتی میں جاگزیں ہونے دینا انسانی ملت سے غداری ہے۔ نیک نیتی کوئی ایسا کیمیا نہیں کہ جو ہر زہر کو تریاق اور ہلاکت کو آبِ حیات کردے

کی طرف سمٹ جانے کے لئے مجبور تھی اور ہے۔ جب دونوں کی ایک مصیبت ہے تو دونوں کا ایک علاج کیوں نہ ہوتا۔ شاید تقدیر خداوندی نے ہمارے محترم بھائی آزاد صاحب اور ان کی پارٹی سے یہ غلطی اس لئے کرائی تھی تاکہ وہ سارے حالات کا سنجیدگی کے ساتھ اندازہ کرنے کا وقفہ حاصل کریں اور پھر سینٹ پال کی طرح اپنی گزشتہ غلطی کا اندازہ کرتے ہوئے سارے مشرق کو ایک خدائی نظم میں پرو لینے کے لئے جان کی بازی لگا دیں؟ وما ذالك على الله بعزیز اس ضمنی مگر ضروری بات کے بعد پورے جواب کا خلاصہ پھر عرض کر دیا جائے

جواب کا خلاصہ

جو شخص تاریخ حیوانی کے مقابل تاریخ انسانی کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں وہ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود یہ ماننے کو مجبور ہے کہ (الف) عالم انسانی عالم حیوانی کے مقابل ایک مخفی روحانی و اخلاقی شعور کا نام ہے (ب) انسانی تاریخ صرف ان تحریکات کے تسلسل کا نام ہے جہاں یہ شعور رہنما کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ (ج) انسانی تاریخ کا وہ تسلسل کہ جہاں یہ شعور ناپید ہو صرف حیوانی جذبات کی بے راہ روی اور خودسری ہے جسے انسانی تاریخ کے تسلسل میں سے ختم کرنا ہی فلاح انسانی ہے (د) اس سلسلے کی جتنی واضح

رکھتا ہے وہ پورے یقین سے جان لے گا کہ مارکس اور اینگلز کسی صورت فلاحِ انسانی کے علمبردار نہیں۔ بلکہ وہ اس لحاظ سے کائنات انسانی کے دشمنانِ اعظم ہیں۔ ان کے اس مذہب جدید کے دو قدم ہیں۔ ایک اعتقادی قدم اور ایک عملی قدم۔ عملی قدم پر وہ تمام اخلاقی و روحانی قدروں اور تمام مذہبی شعائر کی کلی نفی کرتے ہوئے پورے نوعِ انسانی کو سخت ترین طبقاتی بغض و عناد کے جذبے سے معمول کرتے ہیں اور پھر ایک اقتصادی عاملِ تاریخ کو انسان کا کامل نصب العین بنا کر خالص حیوانی انداز پر اس کے حصول کے لئے تنازع للبقا میں اسے مصروف کر دیتے ہیں۔ اس کا اگر کوئی بھی اخلاقی نتیجہ ممکن ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان و حیوان کے درمیان کی ساری حدود منہدم کر دی جائیں اور انسان حیوانات کے گلے کا ایک حصہ قرار پا جائے مگر یہ دونوں صرف اسی نوعی انحطاطِ انسانی پر قانع نہیں بلکہ یہ تو صرف ان کا عملی قدمِ اول ہے۔ ان کے اعتقادی کائنات کا قدمِ دوم اس سے کہیں آگے ہے۔ اس قدم پر وہ سرے سے حیات و مظاہرِ حیات (شعور، ارادہ وغیرہ) کے دشمن بن گئے ہیں اور بے شعور مادے کو ساری کائنات کے مستقل بالذات رب الارباب کی حیثیت سے منواتے ہیں۔ ان کے نزدیک جس طرح قدمِ اول پر نیکی و بدی کا سارا اخلاقی شعور یا عذاب و ثواب کا سارا روحانی شعور ایک بطلانِ مطلق ہے اور انسان کا نوعی نصب العین بننے کا حق نہیں رکھتا بلکہ نوعی نصب العین

تیسرا سوال (تمام اہل مذاہب سے ایک بات)

"کارل مارکس اور اینگلز نے تاریخ حیات کو سامنے رکھتے ہوئے جس طرح وظائف حیات انسانی کو معین کیا ہے اس کوشش کو دین انسانی کی آخری کڑی اور اس کی کامل تعبیر کیوں نہ سمجھا جائے؟" سوال کے جواب کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے تمام دنیا کے اہل مذاہب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سوال کہ جو عملاً سو برس سے ایک چیلنج کی حیثیت پر ساری دنیا کے مذاہب کے سامنے ہے اور جو دنیا کے تیسرے حصہ پر عملاً محیط کر دیا گیا ہے اس کا جواب صرف ایک فرد کا کام نہیں نہ اس کا مخاطبہ درحقیقت ایک مذہب سے ہے بلکہ اس کا مخاطبہ ساری دنیا کے مذہب سے ہے لہذا ضرورت صرف اس بات کی داعی ہے کہ تمام دنیا مذہب کے پرستار اس عالمگیر چیلنج کے مقابل ایک محاذ پر آئیں اور اس کا عملی جواب دیں۔ اسی مقصد کے لئے مجھے سوال کا جواب دیدینے کے بعد پوری دنیا کے مذاہب سے ایک تنقیدی مخاطبہ کرنا پڑے گا۔

جواب

اصولاً اس سوال کا جواب صدر کی سطور میں آگیا ہے اس کہ جو شخص تاریخ حیوانی کے مقابل تاریخ انسانی کو سمجھنے کی صلاحیت

و روحانی قدروں کی نفی پر زور دیا گیا ہے۔ اگر ایک سو برس
گذر جانے پر بھی دنیا اس فکری نظام کی حقیقی حیثیت نہیں سمجھی
اور اس کی طرف کھچی جا رہی ہے تو یہ نوع انسانی کا سب سے بڑا تاریخی
ابتلا ہے۔ پوری انسانیت غور سے سن لے کہ کارل مارکس کیا کہتا ہے
وہ کہتا ہے کہ نیکی و بدی، عذاب و ثواب ایک فریب ہے۔ سرمایہ
دار کا گھڑا ہوا فریب ہے، اصل چیز اور اصل منزلِ مقصود انسانی صرف
روٹی کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے قتل و رہزنی و قزاقی فریب
و مکر کرنا ۔ اس کے حصول کے قدرتی ذرائع ہیں۔ خوب غور
سے سنو! کارل مارکس کا کیا اعتقاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شعور، ارادہ،
احساس و جذبہ محض اعتباری چیزیں ہیں، ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں
وجود حقیقی حضرتِ واجب الوجود بے شعور مادے آنجہانی کا ہے ۔
انسان کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ جب وہ اپنے ہوس کارانہ
منصوبے میں ناکام ہو جاتا ہے، تو پھر بغض وغضب، بغض و عناد
سے لبریز ہو کر خود اپنی تباہی کا پورا سامان کر جاتا ہے اور محسوس
ہی نہیں کرتا کہ وہ ایسا کر رہا ہے کارل مارکس اور اینگلز نے پوری
انسانی نسل کے لئے درحقیقت یہی خدمت انجام دی ہے۔ ذرا
ان کے تاریخی مادیت کے استدلال کا ملاحظہ فرمائیے ۔

اقتصادی عامل کی ہمہ گیری کے اعتقاد کے ساتھ طبقاتی جنگ ہے
بالکل اسی طرح وہ اعتقادی پہلو میں حیات و مظاہر حیات (شعور و
ارادے احساس۔ جذبہ) کے استقلال کے قائل نہیں۔ بلکہ اسے بالکل
غیر مستقل بالذات قرار دیتے ہوئے بے شعور مادے کی ہمہ گیری کا
منوانا ہی اپنے مذہب کی بنیاد بناتے ہیں۔ یہ ان کی شریعت کا مرکزی
اصول ہے۔ اب اس کا نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے
منصوبے کی کامیابی پہلے تو نوع انسانی کو مطلق اخلاقی و روحانی
شعور نیک و بد اور ادراک عذاب و ثواب سے محروم کرتی ہوئی
حیوانیت کے گلے کا ایک بے امتیاز جز بنا دے اور قدم دوم پر
خود حیات و مظاہر حیات (مطلق شعور و ارادے احساس و جذبے
کو نیست و نابود کرتی ہوئی بے شعور مادے میں نیست و نابود کر دے۔
بے شعور مادے کی ہمہ گیری اور مظاہر حیات کے عدم استقلال کا
اعتقادی دائرے میں منوانا ان کے مذہب کا اتنا ہی ضروری جز
ہے کہ جتنا ضروری جز عملی دائرے میں اخلاقی و روحانی قدروں کی
نفی اور اقتصادی نصب العین کے حصول کے لئے حیوانی تنازع
للبقا ہے اس کے اعتقادی پہلو میں حیات کے مظاہر مثلاً شعور و
ارادہ و احساس و جذبہ وغیرہ کے عدم استقلال کے متعلق اور بے شعور مادے
کی ہمہ گیری کے متعلق اتنا ہی زور دیا گیا ہے کہ جتنا زور اقتصادی
جھگڑے کو انسان کا نوعی نصب العین بنانے کے لئے تمام اخلاقی

ہونی چاہیئے کہ جو بے شعور مادے کی ہمہ گیر خدائی کو چیلنج کر سکے
بالکل اسی طرح اپنشدوں کے اساتذۂ روحانیت کی کوششوں کا
مرکزی نقطہ یہ ہے کہ کائناتِ فطرت کے ہر گوشے کی تشریح و تعبیر
صرف انفسی و روحانی ہونی چاہیئے جدید یورپ میں اس خیال کا حامی
پادری برکلے تھا کہ جو کمیونسٹ دنیا کے لئے سب سے بڑا نشانہ بنا ہوا
ہے۔ اپنشدوں کی انفسیت (Subjectivity) اور مارکسی
امت کی آفاقیت (Objectivity) اپنی اپنی تشریحات میں
ایک دوسرے کا سو فیصدی رد ہونے پر بھی اپنے اپنے نظاماتِ
خیال کے اخلاقی و معاشرتی و تمدنی نتائج سے سو فیصدی لاپرواہ
ہونے میں مساوی ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کے سو فیصدی
اتباع کرنے کا نتیجہ عمرانِ انسانی کی کلی تباہی ہے۔ نوعِ انسانی کی
عمرانی حرکت کی بنا قوائے حیات کی اعتدال پسندانہ خود شناسی
خود مرکزیت و خود ارادیت پر مبنی ہے مگر اپنشدوں کی انفسیت
و مارکسی آفاقیت انسان کو انسانی خودی کے احساس سے یکسر محروم
کر دیتے ہیں۔ اور پھر ایک تو انسان کو یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان
کا کمال یہ ہے کہ وہ انفسیت میں گم ہو جائے اور دوسرا اُسے بے
شعور مادے کی ہمہ گیری کے سامنے سر بسجود کر دیتا ہے۔ اپنشد تو
انسان کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اسے اپنے شعورِ ذات اور تمیز بانی
دمی کو کم کرتے کرتے ایک ہمہ گیر روحِ کلی میں ناپید ہو جانا چاہیئے

مارکس کے تاریخی مادیت کے استدلال کی تعمیری حیثیت

کارل مارکس کی امت نے اس وقت سارے عالم کو مبہوت
کرنے کے لئے جو شعور مچا رکھا ہے، اُسے چند منٹوں کے لئے بھول
اور ایک دیانت دار "انسان" کی حیثیت سے ان کے تاریخی مادیت
کے استدلال کو تعمیر و تکمیل انسانی کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کیجئے
پھر دیکھئے کہ اس نقطۂ نگاہ سے اُس کے کیا کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں
سیدھے سادے الفاظ میں مارکس و اینگلز کے استدلال کا خلاصہ
ہے کہ اس کائنات کا رب الارباب، اصل الاصول محیطِ کل او
ہمہ گیر سرچشمہ بے شعور مادہ ہے (حقیقت میں یہ مادیت یا یہ آفا
(objectivity) ان روحانی یا انفسی کوششوں کا سو فیصد
مخالفانہ اور انتہا پسندانہ ردعمل ہے جو قدیم تاریخ مذہب پر چھا
ہوئی نظر آتی ہیں اور جن میں کائناتِ فطرت اور سلسلۂ تخلیق
روحانی یا انفسی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ انسا
میں اس کا سب سے بڑا مرکز آریائیت کی وہ شاخ ہے کہ جو ہندوستا
میں آکر تھمی۔ اس دور میں بھی اُپنشدوں کا دور انفسی و روحا
کوششوں کا مرکزی دور ہے جس طرح مارکسی امت کے مفکرین کی انتہا
کوشش یہ ہوتی ہے کہ سلسلۂ تخلیق کی کسی ایک کڑی کی ایسی تشریح

میں جو جو سائنٹیفک الفاظ اور اصطلاحیں پیدا ہوئی ہیں مارکس
کی امت ان سب کو صرف ایک مدعا ثابت کرنے کے لئے استعمال
کر رہی ہے "حیوانیت سے آگے نہ تو نوع انسانی کا کوئی مقام اور نہ
حیوانیت کے علاوہ اس کے کوئی فرائض و واجبات ہیں" ان کا کہنا ہے
کہ اس مدعا کے علاوہ آج تک پوری تاریخ انسانی میں جو کچھ کہا گیا ہے
وہ جھوٹ اور اختراع ہے بہتان ہے۔ وہم پرستی و مکر ہے کہ جو
"بُرژوا سوسائٹی" نے ورکنگ کلاس کو لوٹنے کے لئے تراشا ہے۔
انسان کا کوئی ممتاز و اشرف مقام یا اس سے متعلق کوئی خاص
فرائض و واجبات یا " ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" قسم
کا نصب العین صرف برژوا کی بے ایمانی ہے۔ ایمان، ایقان، خیر و شر
نیکی و بدی کا امتیاز سر تا سر فریب و بے ایمانی کی ٹٹیاں ہیں۔ جو
راہ ادھر لیجانے والی ہے فریب محض ہے۔ لہٰذا اُسے یکسر چھوڑ دو
اور سر سے پاؤں تک جذبۂ انتقام سے لبریز ہو جاؤ۔ رشک و
رقابت حسد و بغض کے اوزاروں سے مسلح ہو جاؤ اور صرف
پیٹ اور صنفی تقاضوں کے لئے شہید اکبر بن جاؤ۔ یہی فلاح
انسانی کی راہ ہے اس پر جو کوئی ٹوکے ممکن ہو تو اس کی جان
لے لو۔ کارل مارکس نے جو وعظ شروع کیا تھا اور جس کی
تشریحات و ڈیفنس سو برس سے ہو رہا ہے اور جسے جبر و مکر کے
ہر حیلے سے عالمگیر کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں یہ اس کا نہایت

اور مارکس ازم انسان پر مادے کی اصطلاح میں یہی اور پرشین گزا ہوا اور یہ یقین دلاتا ہوا کہ شعور واحساس و جذبہ وغیرہ مادے کے نہایت ہی عارضی کیفیات ہیں بالآخر اُسے بے شعور مادے کی تاریک وسعتوں میں ناپید کر دیتا ہے۔ بحیثیت دو عمرانی نظاموں کے اُن کے نتائج بلا کم و کاست صرف یہی ہیں۔ ایک قطب جنوبی کا باشندہ ہے اور دوسرا قطب شمالی کا۔ انسانی اعتدال کا شیرازہ دونوں میں گم ہے تاریخ حیوانی کے متعلق مارکس و اینگلز کا نقطۂ نگاہ بالکل مبہم ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اسوقت تک بیالوجی اپنی ابتدائی حالت میں تھی اور غالباً یہ لوگ بیالوجی کے بجائے اقتصادیات کے طالب العلم تھے لہذا حیاتِ حیوانی کے متعلق آج جو ملے جلے سے اندازے قائم کئے گئے ہیں ان کے ہاں اس کا بھی پتہ نہیں لہذا یہ لوگ مادے کی ہمہ گیر کے ڈاروینین تصورات کی دنیا سے ایک زقند بھرتے ہوئے تاریخ انسانی کی راہ کی اس گھاٹی کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جہاں سے صرف دو قدم آگے بڑھنے کے بعد انسان کو ایک طرف اپنے اشرف واعلیٰ مقام کا پتہ مل جاتا ہے اور دوسری طرف تھوڑی سی ہمت بلند ہی پر اپنی نوعی منزلِ مقصود نظر آنے لگتی ہے اس گھاٹی کو روک لینے کے بعد یہ دونوں شخص اس زور و شور سے قافلہ انسانی کو پیچھے کی طرف پلٹ جانے کی دھائی دینا شروع کرتے ہیں کہ سو برس گذر جانے پر بھی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس ایک سو برس کے عرصہ

پہلی تنظیمیں بالکل اعتدال پسندی پر مبنی ہوتی ہیں ان کی اصل فطرتِ انسانی کے مخصوص مثبت داعیے ہوتے ہیں۔ اُن کا آغاز ایک خودشناس و خداشناس مردِ کامل سے ہوتا ہے جسے اپنے تمام قوائے حیات کی متوازی ترقی و تکمیل کا جذبہ اور اپنے نوعی نصب العین کا یقین اس راہ پر گامزن کرتا ہے۔ یہ سب تحریکیں سرتاسر اعتدال و اثبات کا رنگ لئے ہوتی ہیں۔ اس اعتدال و اثبات کی حالت میں نفسِ انسانی (Human mind) سارے عالمِ انفس و آفاق ہی سب صلاحیتوں کا جامع ہو جاتا ہے۔ صرف ایسی حالت میں نوعِ انسانی کے اشرف المخلوقات ہونے کا راز کھلنے لگتا ہے اور کائناتِ فطرت کے تمام اجزائے ترکیبی میں تضاد و تخالف کے بجائے ایک کلی ہم آہنگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس حالت میں پوری کائناتِ فطرت کے تمام اجزائے ترکیبی پر ایک مبنی بر خیر تدبیری و تقدیری وحدتِ مطلق کا کلی غلبہ و تسلط محسوس ہونے لگتا ہے۔ بعض خام کار اور کوتہ اندیش و النفسی رجحانات کے مغلوب افراد اس حالت کو کہ جب ساری کائنات زیر و بالا ایک مبنی بر خیر تدبیری و تقدیری وحدت معلوم ہونے لگتی ہے ہستیٔ حق سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ حالت خدا نہیں بلکہ خداوندِ کریم کی تدبیر و تقدیر کے عالم کون و فساد پر اجرا کے مشاہدے کا مقام ہے۔ جب انسان اپنے انسانی فرائض و واجبات پر اصولاً اور حیوانی مصالح پر ضمناً کاربند ہو جاتا ہے اور اس پر اسے استقامت

واضح خلاصہ ہے۔ ایک یہودی اپنے عالمگیر منصوبۂ ہوس و طمع میں سو فیصدی ناکام ہو کر کائناتِ انسانی کے خلاف جذبۂ بغض و عناد سے لبریز ہو جاتا ہے اور تاریخِ انسانی کے سارے لالہ زار کو ایک فریب سارے سیب ناشپاتی انگور کو کھٹا مہلک اور مضر بتانے پر اپنی ساری قومی ذہانت خرچ کر جاتا ہے۔ انسانی سیرت و کردار کی تہ تک بعض اوقات متجسس نگاہیں اس لئے نہیں پہنچ سکتیں کہ وہ اس کی مخصوص نفسیاتی کیفیتوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں کارل مارکس کی انسانیت سوز مساعی کی منطقیانہ تہ تو شاید کبھی انسان کو معلوم نہ ہو سکے گی۔ اس لئے کہ وہ موجود ہی نہیں البتہ اس کی نفسیاتی اساس خط کشیدہ فقرے ہیں صدر میں درج ہے۔ مارکس نے اگر قافلۂ انسانی کی ساری جمع پونجی کو سر تا سر فریب مکاری و وہم پرستی بتایا تو اس میں اسکی یہودی ہوس کار فطرت اور اسکی مسلسل ناکامی کو بڑا دخل ہے۔

انسان کی مخصوص نوعی حرکت اور اس کی حیوانی رجعت پسندیوں میں فرق

انسان کی مخصوص نوعی تنظیم کے لئے جو جو تحریکیں چلی ہیں ان میں اور ان کے مقابل ان تحریکوں میں کہ جو حیوانی جذبات کے بے قابو ہو جانے کے باعث رونما ہوئی ہیں یہ بنیادی فرق ہے کہ

شعور کہا گیا ہے۔ حالانکہ اسی کی کامل تربیت و تکمیل پہ نوعِ انسانی کی فلاح کا دار و مدار ہے اور اسی کے فقدان کے بعد انسان کو پوری کائناتِ فطرت ایک کلی و دائمی تضاد و تخالف کی آماجگاہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسی جوہر کے گم ہو جانے کے بعد اشرف المخلوقات انسان بدترین مخلوق بن جاتا ہے۔ اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مارکس و اینگلز اور ان کی امتِ مشترکہ صرف یہی نہیں کرتی کہ انسان کو حیوان کے درجے پر گرا کر اس کی ارتقائی حرکت کی راہ روک دیتی ہے بلکہ یہ لوگ سرے سے حیات ہی کے لئے کسی متنقل مقام کے قائل نہیں بلکہ سارے سلسلۂ حیات کو ارتقائی حرکت کی راہ سے ہٹا کر بے شعور مادے کی ہمہ گیری کے پاؤں پر سر بہ سجود کر دیتے ہیں۔ کمالِ جہل و تعصب یہ ہے کہ ایک سو برس گذر جانے پر بھی انھیں اپنی ظالمانہ مہم کے نفسیاتی نتائج و عواقب کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ ذرا فرض کیجیے کہ اگر سارا سلسلۂ حیات ان کی اس بے بنیاد اور جھوٹی منطق کی پابندی و اطاعت کا اعلان کر دے تو سوائے اس کے کہ وہ عدمِ مطلق کی تاریکی میں سو جائے اور کیا کر سکے گا۔ یہ ہے مارکسی "تاریخی مادیت" کا خلاصہ اور یہ ہیں اُسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے ضابطۂ حیات بنانے کے منطقی و طبعی اور نفسیاتی نتائج۔ مارکس و اینگلز اور ان کی امت نے تاریخ انسانی کے ساری انتہا پسندیوں، ساری رجعت پسندیوں اور ساری روحانی و اخلاقی رذالتوں کے امتزاج و ترکیب سے اس طرح ایک عالمگیر نظام

حاصل ہو جاتی ہے تو بہت جلد اُسے اپنی نوعی سلامتی وامن کے
اس مقام کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میرے مارکسی بھائیو! خدائے
قدوس کی قسم کہ تم کائناتِ فطرت کے اندر جس دائمی تضاد و تخالف
کا پتہ دے رہے ہو اگر اس کی اصلیت ایک یرقان زدہ انسان
کے سارے عالم کو زرد دیکھنے یا ایک ساون کے اندھے کو ساری
دنیا کے سبزی سبز دیکھنے کے علاوہ اور کچھ بھی ہے۔ وہ حالت خلافِ
وضع فطرت حالت ہے جب انسان اپنے نوعی فرائض واجبات
روحانی واخلاقی کو یکسر نظر انداز کرتا جاتا ہے اور اپنے لئے حیوانات
اور درندوں کی طرح صرف بطن و فرج کی ضرورتوں کو نصب العین
بنا لیتا ہے اُسے سچ مچ یہ ساری کائنات صرف ایک کلی تضاد و
تخالف کی آماجگاہ معلوم ہوتی ہے، جہاں صرف شر ہی شر ہے اور
خیر کا کوئی پتہ نہیں۔ یہ درحقیقت جہنمی زندگی کا آغاز ہے جس طرح
کہ صدر میں عرض کی ہوئی حالتِ اطمینان بہشت کی زندگی کا آغاز ہے
مگر دوسری قسم کی تحریکیں درحقیقت افراد کے قوائے حیات کے
مجموعی اندازے اور متوازی تکمیل کے داخلی پہلو سے اور نوعی
نصب العین کے خارجی جاذبے اور یقین سے یکسر خالی ہوتی ہیں۔
یہ منفی قسم کی رجعت پسندیوں اور اعتدال سوز انتہا پسندیوں کا
مجموعہ ہوتی ہیں۔ ان میں الجھ جانے کے بعد وہ جوہر انسانی یکسر نابید
ہو جاتا ہے کہ جسے صدر میں کئی جگہ انسان کا مخصوص اخلاقی و روحانی

مارکسی فکر و عمل کے نتائج و عواقب

اگر پراپاگنڈے کی رنگین عبا اور سائنٹفک اصطلاحات کے لبادے کو اُتار کر مارکسی تخیل و دین کی تلخیص کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ مارکس اس اعتقاد کا جانی دشمن ہے کہ انسان کا نصب العین حیاتِ حیوانی کے نصب العین کے علاوہ اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ تاریخِ انسانی کے اقتصادی عامل کو انسان کے لئے رب النوع قرار دیتا ہے۔ بے شعور مادے کو ساری کائنات کا رب الارباب تسلیم کراتا ہے لہذا انسان میں سے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے اعتقاد کو سرے سے ختم کرتا ہوا اس کی نوعی ارتقا کی راہ کو روک دیتا ہے۔ اور حیوانی گلے میں شریک کر دیتا ہے۔ مگر چونکہ اقتصادی تنازع للبقا کو وہ سلسلہ حیات کی آخری سند تسلیم نہیں کرتا بلکہ آخری رب الارباب اس کے ہاں بے شعور مادہ ہے۔ یہی اس کا آخری خدائے واحد لاشریک ہے۔ لہذا لزوماً حیاتِ حیوانی بھی اس کے نظامِ فکر میں کوئی مستقل مقام نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک برزخی وقفہ ہے کہ جہاں چندے سستانے کے بعد زندگی کو بے شعور مادے کے رب الارباب کی طرف پرواز کرنا ہے اور اسی بے شعور مادے کے ساتھ من تو شدم تو من شدی ہو جانا ہے۔ بطن و فرج کی ضرورت کو حیات کا نصب العین قرار دینے اور آخری نصب العین بے شعور مادے

فکری بنانے کی کوشش کی ہے کہ اپنی اصل کے لحاظ سے اس کا جزو جزو محض منفیات کا مجموعہ ہونے پر بھی بظاہر ایک اثباتی زرق برق محسوس ہوتا ہے۔" بلاشبہ جس طرح محمد رسول اللہؐ کو عالم انسانی کی تمام اخلاقی و روحانی قوتوں کو جامع ترین عالمگیر انداز کی تنظیم دینے کے باعث خاتم الانبیا کہنا تاریخ کی روشنی میں ایک حق ہے بالکل اسی طرح کارل مارکس کو انسانی تاریخ کی تمام حیوانی رجعت پسندیوں، تمام ظالمانہ انتہا پسندیوں اور تمام اخلاقی و روحانی رزالتوں کو ایک عالمگیر تنظیم دینے کے باعث آج تک کی تاریخ کا سب سے بڑا دشمن انسانیت بتانا سر تا سر درست ہے۔" میں خط کشیدہ فتویٰ پوری انسانی ذمہ داری کے احساس سے دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ عالم انسانی کی کتنی بڑی مقدار کو ہلاکت کے منہ میں دھکیل دیا گیا ہے اور کتنی بڑی مقدار شکوک و شبہات میں گرفتار ایک اضطرابی شکل میں اسی طرف کھنچی جارہی ہے۔ مارکس اور اس کی امت کی نیک نیتی کا عذر ان کی ہلاکت انگیزی کو کسی طرح کم نہیں کرتا۔ بلکہ زیادہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ ایک ایسا گروہ کہ جو عالم انسانی کو ہلاکت کی وادی کی طرف رہنمائی کر رہا ہو اور ساتھ ہی پوری نیک نیتی سے یہ سمجھتا ہو کہ وہ حیات ابدی کی طرف رہنمائی کر رہا ہے ایسا گروہ اس گروہ سے کہیں زیادہ مضر ہے کہ جو مضر کاموں میں مشغول ہے مگر اسے اپنی مضرتوں کا یقین ہے۔ یا کم از کم اپنی صحت کا کوئی یقین نہیں۔

اس لئے اصولاً ایسا لگاؤ حرام ہے (ج) انسان دنیا اور اس کے ذخیروں کے ساتھ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی حد تک تعلق رکھے اور اسی حیثیت سے جتنے افراد کو رب العالمین نے پیدا کیا ہے وہ سب اس کے ذخیرۂ ربوبیت سے مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں ذخائر حیات سے مستفید ہونے کی شرط عمل صالح اور محنت ہے اب اگر کوئی شخص بھوکا اور کوئی قارون ہے تو نعوذ باللہ یہ رب العالمین کی ربوبیت کا نقص نہیں بلکہ سوسائٹی کا ظلم عظیم ہے کہ وہ اللہ کے سامان ربوبیت سے سب کو متمتع ہونے سے روک رہی ہے۔ یہ تین باتیں انبیا علیہم السلام کی معاشی تعلیم کا خلاصہ ہیں خود ان کی واجب الاتباع زندگیاں اسی "لانرث ولا نورث" قانون کا نمونہ ہیں۔ البتہ اس معاشی تعلیم کے بعض حصوں کو انھوں نے سوشل قانون بنادیا ہے اور بعض کو صرف اخلاقی و روحانی ترغیب و ترہیب کے دائرے میں رکھا ہے جسے سوسائٹی کی مجموعی فلاح کے پیش نظر کسی وقت بھی قانون بنایا جاسکتا ہے۔ اس اخلاقی ترغیب و ترہیب کو سوسائٹی کا عملی قانون معیشت بنا دینا حقیقت میں انھیں انبیا کی تعلیم کا عملی اتباع ہے۔ لیکن اسی معاشی تعلیم کا ایک خالص روحانی پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی حیات ایمانی کے دو مرکزی ستون ہیں۔

حسن عمل اور توکل علی اللہ

"عبودیت نام ہے مسلسل جد و جہد و مجاہدے اور جہاد فی سبیل اللہ

کی ہمہ گیری کو بتانے کا اگر اور کوئی نتیجہ نکالنا ممکن ہے تو پھر اس کے لئے کسی نئی منطق کو عالم وجود میں لانا ہوگا ورنہ موجودہ منطق کے سارے پیمانوں سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے غضب یہ ہے کہ سو برس گذر جانے پر بھی اس خود دشمن گروہ کو اپنے تعصب و عناد کا جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ اُدھر بعض غلط بین، رسوم پرست اور سرمایہ داری کے وظیفہ خوار مذہبی گروہوں نے اگر اس خطرے کے مقابل کچھ کہا ہے تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ اصولِ ملکیت شخصی کو درست ثابت کرنا ہے جو ایک طرف اصول مذہب اور بانیان مذہب کی غایت درجہ توہین تھی تو دوسری طرف اس باطل وکالت نے آدھی مظلوم دنیا کو مذہب سے بدظن کر دیا۔

ملکیت ذاتی کا سرمایہ دارانہ اصول غلط ہے

(الف) بلاشبہ تمام بانیان مذاہب تمام صدیقین خدا اور تمام اول درجے کے مبلغین اخلاق و روحانیت کی تعلیم دنیا اور اس کے ذخائر کی مقصودیت کے کلی انکار پر مبنی ہے۔ وہ ہر اس شخص کو جہنمی بتاتے ہیں کہ جو دنیا کو یا اس کے ذخائر کو مقصود زندگی سمجھے۔

(ب) وہ حیاتِ دنیا کی حیثیت کو صرف ایک مسافر خانے کے قیام سے تعبیر کرتے ہیں، جہاں ہمیشہ ساتھ دینے والے "باقیاتِ صالحات" کے علاوہ ہر چیز کا ذخیرہ زندگی کی ناجائز گرفتاری کا موجب ہو جاتا ہے

روحانی نقطۂ نگاہ سے وہ حرام کاری ہے اور کچھ نہیں۔ جو شخص مومن کی جدوجہد اور اللہ کی ربوبیت کے اس درمیانی جوڑ کو نہیں دیکھ سکا کہ جسے توکل کہا جاتا ہے اور جس کا کامل ترین نمونہ انبیا و صدیقین کی عملی زندگیاں ہیں وہ دین کی اصل سے ناواقف ہے۔ انبیا کی تعلیم کا بہترین نمونہ خود انھیں کی زندگیاں ہوتی ہیں اگر اس عام قانون معیشت انسانی اور اس کے خالص اخلاقی و روحانی پہلو کے خلاف کہیں کوئی بات تعلیم انبیا میں ہے تو وہ ہرگز قانون نہیں بلکہ قانون سے استثنا ہے۔ استثنا درحقیقت قانون کا خارق نہیں ہوتا بلکہ قانون کا موید ہوتا ہے۔ قانون کی قانونی حیثیت کو بحال رکھنے کے لئے بعض مواقع کو اس سے علیحدہ کرتا ہے تاکہ قانون کے عمل میں یکسانی پیدا ہوسکے اور کوئی بڑی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ بس بات یہ ہے کہ اگر انبیا کی تعلیم کے قانون معیشت کے قانونی پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیم کے روحانی پہلوؤں کو مربوط کرتے ہوئے انھیں قانونی شکل دیدی جائے تو آج دنیا کو معلوم ہوجائے کہ اصل بات کیا تھی۔ لیکن جب تک کوئی ایسی ایجنسی عالمگیر پیمانے پر پیدا نہیں ہوتی تب تک غلط نگاہ اور تنگ نظر و خود غرض شارحین مذہب مذہب ہی کے نام سے لامذہبیت پھیلاتے رہیں گے عجب نہیں کہ اللہ تعالی نے انھیں خود غرض لوگوں کو بے دست و پا کرنے کے لئے مارکس جیسے ایک دشمن انسانیت کے خیالات کو اتنی مہلت دیدی ہو کہ سو برس گذرنے پر بھی وہ ابھی باقی ہیں۔ گو قانونِ ملکیت کے باطل مفہوم کی کامل ترین

کے ساتھ دائمی توکل علی اللہ کا اگر جد و جہد موجود ہے لیکن اعتماد و توکل علی اللہ موجود نہیں تو یہ کافرانہ ہوس کاری ہے۔ اسی بنا پر ہر مومن کی ایک صفت متوکل بھی ہے۔ اگر وہ بحیثیت عبد کے اپنے تمام فرائض حیات کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہے تو کیا اسکا معبود بحیثیت رب العالمین کے اس کی ضروریات کو پورا کرنے میں کوتاہی کرے گا! ایسا خیال کرنا کفر و نفاق ہے۔ اسی نفاق و بے اعتمادی کی نفی کا نام توکل علی اللہ ہے۔ اور جب سارا معاملہ یہ ٹھہرا تو پھر جہد مومنانہ کے بعد رب العالمین کے بجائے زر و جواہر کے ذخائر پر اعتماد کا جواز کہاں موجود ہے۔ وہ صرف شرک ہے۔ انبیا وصدیقین کا ترک و تجرید اور مومنوں کا توکل و اعتماد علی اللہ اسباب کے ذخائر کی ملکیت شخصی کے اصول کے جواز کے بجائے اسکے کلی انکار پر مبنی ہے۔ اس لئے ذخائر دنیا کی ملکیت نہیں بلکہ لاملکیت ضروری اجزائے ایمانی میں داخل ہے۔ جو یہ نہیں سمجھا وہ حقیقت ایمانی کے ذائقے سے یکسر محروم ہے۔ میں ملکیت کے فی الجملہ جواز و رخصت کا انکار نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اسے دین کی اصولی تعلیم کا جزو سمجھ کر اس کی وکالت کا انکار کر رہا ہوں۔ البتہ مسلسل حسن عمل کے سوائے جو شکلیں توکل کی پیدا کی گئی ہیں وہ حقیقت میں تعطل و بے کاری اور شاید اکثر شکلوں میں ریا و مکاری ہیں۔ چونکہ ذخیرہ اندوزی اس غایت درجہ جد و جہد کے ساتھ غایت درجہ اعتماد علی اللہ کے ایمانی نصب العین کی روشنی کو بجھا دیتی ہے اس لئے خالص

محض رخصت کے پہلو ہیں کہ جو اصلِ دین نہیں۔ انبیا کی عملی زندگیوں کو سوسائٹی کے تمام پہلوؤں پر حاوی کرنے کے بجائے انھیں صرف پوجنے پجوانے کی ہیروز قرار دینا اور سوسائٹی کا قانونِ معیشت و معاشرت صرف رخصتوں سے اور قانونی استثناؤں سے بنا ڈالنا مذہب کے نام پر لامذہبیت اور دین کے نام پر لادینیت کی تبلیغ ہے اور کچھ نہیں۔ بس مسئلے کو اس قدر اس لئے پھیلا رہا ہوں تاکہ مارکسی امت کے لئے صحیح مذہبیت کو سمجھنے کی راہ میں کوئی روکاوٹ نہ رہجائے اور تاکہ انھیں اپنی کسی مخصوص افادیت کا حسن ظن نہ رہے نیز اس لئے بھی یہ تفصیل ضروری ہے تاکہ روحِ دین اور فقیہانہ رخصتوں اور جوازوں میں بھی امتیاز کی شکل پیدا ہوسکے۔ عام دنیائے مذاہب کا تو کہنا ہی کیا آج بلاشبہ خود امتِ اسلامیہ کا سارا موجودہ فقیہانہ قانونِ معیشت و معاشرت بالکل انھیں رخصتوں اور استثناؤں کو ترتیب دینے سے بنایا گیا ہے۔ اور حیاتِ انسانی کی وہ ساری عزیمتیں اور قوانین کہ جن سے عملاً انبیا و صدیقین کی سیرتیں بنتی ہیں صدیوں سے مستور کردئے گئے ہیں۔ لہذا اگر اوسط درجے کا انسان امیری بھی ہے عیاری فقیری بھی ہے عیاری کہتا ہوا اپنے آپ کو ہلاکتِ عام کے سپرد کردے تو کیا تعجب ہوسکتا ہے۔

تو ہیں کر دینے کے بعد مجھے اب ان کے بقا کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی
اور ٹرومین کی آوازیں مجھے مارکسی امت کے لئے وہی برباد کن جراثیم نظر
آتے ہیں کہ جو ہٹلر و مسولین کی بربادی کے لئے مسٹر چرچل کی آوازیں
نظر آتے تھے۔ بہرحال حیاتِ انسانی کا قانونِ معیشت ملکیت و ذخیرہ
سازیاں نہیں بلکہ مسلسل عمل کے ساتھ غایت درجہ اعتماد علی اللہ ہے
اس کی عملی شکل باہمی رضاکارانہ تعاون ہے۔ اسی سے قوائے حیات
انسانی بالیدہ اور اسی سے انسان کا نوعی نصب العین واضح ہوتا ہے
آؤ تھوڑے عرصے کے لئے ہم فرض کریں کہ عالم انسانی اس بات پر متفق
ہو گیا ہے کہ (الف) دنیا انسان کی مستقل قیام گاہ نہیں۔ بلکہ کسی بلند
تر منزلِ مقصود کی طرف ایک عارضی سیٹشن ہے (ب) انسان کی نوعی
تقدیر یہ ہے کہ وہ اس عارضی قیام گاہ کے اندر پھیلائے ہوئے ذخیروں
میں سے اپنے مایحتاج کی حد تک لے لے مگر ذخیرہ نہ کرے۔ (ج)
ضروریات کی حد تک ذخائر فطرت میں سے لے لینے کا معیار انسان کا حسن
عمل ہو اور کچھ نہ ہو۔ اب ذرا ایسی دنیا کے حسن انتظام کا اندازہ کیجئے
کہ کیسی ہو گی۔ آخر انسانی جماعت کی ایماندارانہ زندگی اس کے علاوہ
کیا ہو سکتی ہے کہ انبیا و صدیقین خدا کے اسوۂ حسنہ کو ہر پہلو سے ان پر
حاوی کر دیا جائے۔ حیات انسانی کی عزیمت کا پہلو صرف یہی ہے جو
انسان کو اپنی نوعی نصب العین کی طرف بلند کرتا ہے۔ اس کے علاوہ
تعلیم انبیا میں جو ارشادات مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں وہ

مذہب کو اپنی کامل ترین شکل میں قبول لینے کے نتائج

مارکس ازم کو نوعِ انسانی کا دین بنانے کے نتائج صدر میں وضاحت سے عرض کئے جا چکے ہیں اب مذہب کامل کو تعمیرِ انسانی کے مرکزی ادارے کی حیثیت سے پورے نوعِ انسانی کے لئے قبول کر لینے کے نتائج پر بھی غور کیجئے۔ مذہبِ کامل کے مرکزی تین ستون یہ ہیں (الف) انسان اس کائنات کی اشرف ترین مخلوق ہے یہ شجرہ ہستی کا سب سے میٹھا پھل ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ حضرتِ انسان کی کسی نہ کسی خدمت میں صرف ہو۔ کائنات کی ہر چیز میں انسان کے حلقہ تسخیر میں آنے کی ایک مخفی خصوصیت موجود ہے۔ قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ تمام خشکیوں اور تریوں سے لیکر سورج اور چاند تک انسان کے احاطۂ تسخیر میں رکھے گئے ہیں مگر انسان کی یہ خصوصیت اس کی کسی مادی خصوصیت یا حیوانی داعیے کے سبب نہیں۔ بلکہ اپنے مخصوص اخلاقی و روحانی شعور کی بنا پر ہے۔ اگر انسانی جامے میں ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص اس مخصوص احساس و شعور کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ مقامِ انسانی سے گر جاتا ہے۔

اہلِ مذاہب سے عام طور پر اور علمائے امتِ اسلامیہ سے خاص کر ایک سوال

محترم بھائیو! خوب غور کرو اور بتاؤ کہ کائناتِ انسانی کے لئے کس کی زندگی واجب الاتباع ہو سکتی ہے؟ یزید ابنِ معاویہ، راک فیلر، ہنری فورڈ، قارون و شداد کی یا محمد و مسیح، ابراہیم و بدھ کی؟ ہاں ہاں یہ بھی بتاؤ مذہب کا قانونِ معیشت و معاشرت کونسا ہو سکتا ہے وہ کہ جو تمہیں شداد و ہامان، قارون و ہنری فورڈ، ہلاکو اور چنگیز، ہٹلر و مسولینی سے ہم آہنگ کر سکے اور ان کا جانشین بنا سکے یا وہ ہو سکتا ہے کہ جو تمہیں ابراہیم موسیٰ، محمد و عیسیٰ بدھ اور راجہ جنک سے ہم آہنگ کرے۔ یاد رکھو! ایں سے ایک سر تا سر مکارانہ تاویل ہے اور لفظوں کا سہارا لیکر اللہ کے حراموں کو حلال کرنے کی کوشش ہے۔ یہاں تو اسی قدر عرض کروں گا البتہ اسی مضمون کے آخر میں چند معین باتیں عرض کروں گا جنہیں سامنے رکھکر اگر تم چاہو گے تو دنیائے الحاد و بے دینی کے مقابل مذہبِ انسانی کی کوئی عالم گیر شکل معین ہو سکے گی۔

موقف اور اس کے باہمی طریق عمل کی بنا کے مقرر ہو جانے کے بعد اس کی منزل مقصود کس طرف پڑتی ہے۔ حیات سکوں شناس نہیں بلکہ اس کی فطرت میں حرکت داخل ہے۔ کیا انسانی منزل پہ پہنچ جانے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے یا "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں" جواب باصواب یہ ہے کہ جس طرح کارل مارکس نوع انسانی کی ہمت و عزیمت و صلاحیت کا پہلا مرجع و ماوی اقتصادی جنگ کو قرار دیتا ہے اور ایک عارضی وقفے کے بعد انسان کی ساری اعتقادی قوت کو بے شعور مادے کی بے رحم و بے حس ہمہ گیری کے ناپیدا کنار طوفان میں پھینکتا ہوا خود ایک طرف ہو جاتا ہے؛ مذہب کامل کا پروگرام مارکسی دھریت کے تنزل و انحطاط کے عین برعکس انسانی منزل مقصود کی نشاندہی ایک دائمی فلاح کے مسلسل ارتقا کی طرف کرتا ہے جس طرح مارکس حیات انسانی کو حیوانی سطح کی طرف گرانے کے بعد دوسرے قدم پر لاشعور مادے کے رب الارباب و محیط کل ہمہ گیرہستی کے اسفل السافلین کی طرف لڑکا دیتا ہے' مذہب کامل حیات انسانی کو پیچھے کیطرف دھکیلنے یا نیچے کی طرف لڑکانے کے بجائے آگے کی طرف بڑھنے اور اوپر کی طرف چڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور پوری بلند آہنگی سے کہتا ہے کہ انسان کی منزل مقصود اس خدا کی رضا جوئی ہے کہ جو اس ساری کائنات کا خالق ہے جو عقل کل کا مالک' تدبیر کل کا جامع' جو رحمن و رحیم' جو عادل و غفار' جو عفو و قہار ہے

وہ حیوانات و جمادات سے بدتر ہو جاتا ہے (ب) پورے نوعِ انسانی کے باہمی تعلقات کا مرکزی محرک نوعی بھائی چارے کا اعتقاد ہے۔ لیکن جس طرح انسانی شرافت کی بنا اس کا مخصوص اخلاقی و روحانی شعور و احساس ہے، کوئی مادی چیز یا کوئی حیوانی خصوصیت نہیں۔ اسی طرح اس کے نوعی بھائی چارے کا خمیر بھی انھیں اخلاقی و روحانی قدروں کی باہمی رعایت سے تیار ہوتا ہے اور اس طرح ہر وہ شخص کہ جو ان مخصوص نوعی قدروں کی رعایت نہیں کرتا وہ انسانی برادری سے خارج ہے۔ وہ نوعِ انسانی کے اپنے مخصوص موقف کا غدار ہے (کفر و دین کے تفرقے کی اصل یہی بات ہے) محض نسلی رابطے یا خونی رشتے کا انسانی بھائی چارے میں کوئی دخل نہیں۔ اس لئے کہ وہ رشتہ محض حیوانی سطح کا رشتہ ہے جو انسان کے اپنے مخصوص نوعی موقف کے دائرے سے یکسر خارج ہے۔ صلۂ رحم کے عنوان سے خونی رشتے کے متعلق بھی کچھ انسانی ذمہ داریاں ہیں مگر وہ ایمانی رابطے کے بعد آتی ہیں۔ اور پھر وہ بھی انسانی کتاب میں اخلاقی فرائض کے ضمن میں درج ہیں۔ اخلاقی و روحانی اخوت کے لئے بعض وقت خونی رشتے اور تعلقات یکسر چھوڑ دینے پڑتے ہیں۔ (ج) شرافتِ انسانی کے اعتقاد نے اس کائنات میں انسان کی حیثیت عرفی کو مقرر کیا اور اخلاقی و روحانی بھائی چارے کے احساس و یقین نے اسی مقامِ شرافت کے موافق و مناسب انسانی تعلقات کی نوعیت معین کی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طریق سے انسان کے نوعی

حلم وعفو وغفران سے بنتی ہے۔ ہر معاملہ میں ایما نداری و دیانت ہر قول وعمل میں خدائے علیم وخبیر کے سامنے جوابدہی کے یقین سے بنتی ہے۔ وہ خدائے علیم وخبیر کہ جس کی فراست وعلم ہمارے سارے داخلی وخارجی اعمال پر محیط ہے۔ جو ہماری تمام امیدوں اور تمام خوفوں کا مرکز ہے۔ آئیے چند لمحات کے لئے یہ فرض کریں کہ اس راستے سے روکنے والے سارے شیاطین فنا کر دئے گئے اور انسان نوعی طور پر ایسی دنیا بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایما نداری سے بتاؤ کہ یہ کیسی دنیا ہو گی؟

مارکسی کائنات و مذہبی کائنات کا مقابلہ

اب ان دو نظاموں کا پہلو بہ پہلو رکھکر ذرا مقابلہ کیجئے۔

مارکسی نظام حیات انسانی حیات حیوانی کے علاوہ کوئی نوعی نصب العین نہیں رکھتی۔ اخلاق و روحانیت فریب نفس ہے یا بے ایمان "امپیریلسٹ" اور بد دیانت "برژوا" کی دھوکہ بازی ہے۔ انسانی ایمان ویقین کی بائے لبسم اللہ اور قدم اول بطن و فرج کا تنازع للبقا ہے۔ جو قوت وطاقت بطن و فرج کے معاملے کو نصب العینی حیثیت بنانے سے روکے اُسے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ خط کشیدہ واقعہ مارکس کی تعلیم کا جذباتی پہلو ہے۔ عوام کو جذبات حسد و انتقام سے لبریز کرنے کے بعد عقل و دیانت کے ہر مطالبے کو کچلواتے ہوئے مارکس اپنے پروگرام کے اس حصے پر عمل کرا دینا چاہتا ہے۔ اس کے دین کا دوسرا قدم یا دوسرا

جو سب لا تینوں اور سکینتوں کا سرچشمہ، جو امن و رفاہیت کا منبع
اپنے تمام منصوبوں میں غالب قاہر و قادرِ مطلق ہے۔ چونکہ انسان اسلا
طور پر اس کائنات کی افضل و اشرف مخلوق اور ایک نہایت درجہ مخ
سی کتاب ہونے پر بھی ان تمام حقائق پر محیط ہے کہ جو اس پوری کائنا
کی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہیں۔ بلکہ اس سے کچھ زاید صلاحیتیں بھی
رکھتا ہے، لہذا وہ اس کائنات میں خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس
فرض یہ ہے کہ وہ اپنے جامع صفاتِ کمال خالق کی تمام صفات کے
تقاضوں کو اپنی سیرت میں جمع کرے اور اس کے تمام اخلاق سے
متصف ہو۔ صرف اسی صورت میں وہ اپنی نوعی منزلِ مقصود کے صرا
مستقیم پر گامزن رہ سکیگا۔ صرف اسی صورت میں اس میں وہ نورِ بصیرت
پیدا ہوگا کہ جو اس کی منزلِ مقصود کو دیکھ سکے اور اس کی طرف رہنما
کر سکے۔ زندگی ایک مسلسل سلسلہ ارتقی ہے بے شعور مادے سے ایک قافلہ
حیات کی تخلیق کی جاتی ہے۔ اور پھر مختلف ادوارِ حیات طے کرنے
کے بعد وہ انسان جیسی ایک قابلِ صدرشک احسن التقویم BEST OF THE
(ALL MOULDS) ہستی کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس وقت تک
کی تمام منزلوں کے خلاف اب زندگی کے اس نئے مظہر اتم یعنے حضرت
انسان کی راہ گارے چونے اور اینٹ پتھر سے طیار نہیں ہوتی۔
نہ حیوانی رجحانات و میلانات سے بنتی ہے۔ وہ باہمی خیر اندیشی و
راستبازی، عدل و رحمت شفقت و ایثار، صبر و تحمل، تسلیم و رضا،

کو بالکل اسی طرح پیدا کرتا ہے کہ جس طرح اگر کشمیر کے شالامار باغ میں سے تمام پھولوں کو اجاڑ دیا جائے اور تمام پھل دار درختوں کو اکھاڑ پھینکا جائے تو ان کی جگہ بھنگ، دھتورا، جھاڑ، جھنکاڑ قدرتاً پیدا ہو جائیں گے۔ سوائے اس کے کہ وہاں آپ کوئی ایسا مسالہ زمین میں ملا دیں کہ اس میں سے مبادیاتِ حیات ہی ختم ہو جائیں۔ اخلاقی و روحانی احساس و شعور کے انکار کے بعد مارکسزم کی جس دنیا کا خاکہ صدر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک حرف مبالغہ نہیں مثبت اخلاقی ملکات و روحانی داعیوں کی کل نفی کے بعد جو دنیا تیار ہو گی اس میں منفیات کا بھنگ، دھتورا، جھاڑ، جھنکاڑ اور کوڑا کرکٹ قدرتاً محیط ہو گا۔ خاص کر کہ جب بے شعور و نامعقول مادے جیسے خدائے واحد کا اعتقاد اس ساری مہم کی واحد روحانی اساس ہے۔

یہ ہے فلاحِ انسانی کی وہ منزلِ اولی کہ جس کی طرف کارل مارکس اور انیگلز نے ایک طوفانی دعوت عالمگیر کا آغاز کیا ہے۔ یہ شخص فلاحِ انسانی کا خاتم النبیین ہے یا ارتداد و ہلاکتِ انسانی کا آخری دعوت دینے والا دجال اکبر ہے؟ اس کا فیصلہ میں ان سطور کو پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔ البتہ یہ بات عرض کردوں کہ محمد رسول اللہ نے ایک ایسے ہی یہودی نژاد کا پتہ دیا ہے کہ جو سارے عالمِ انسانی کو دعوتِ ہلاکت دیگا۔ انھوں نے اسے دجال بتلایا ہے۔

(ج) اب یہ ملاحظہ فرمائیے کہ مذہبی ادارہ اپنی کامیابی کی صورت

حصہ جسے اس کا اعتقادی و منطقی حصہ کہا جا سکتا ہے وہ بے شعور مادے کی ہمہ گیری کا اعتقاد ہے۔ نتائج اوپر عرض کر آیا ہوں یہاں دھرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ ذرا اس کائنات کا اندازہ کیجئے کہ جہاں ایمان و دیانت، صدق و صفا، عدل و ایثار، محبت و شفقت، رافت و رحمت غرض کہ ہر اخلاقی و روحانی خاصۂ انسانی کو "برژوا" اور "امپیریلیسٹ" کا مکر و دغا بازی کہکر یا "انسان کی بدوی زندگی کی وہم پرستی" بتا کر ختم کر دیا گیا ہو اور انسان کے پاس حصولِ مقاصد کے جو تسلیم شدہ ذرائع رہ جائیں وہ صرف طبقاتی جنگ، حسد و بغض و منافست، جھوٹ دغا بازی، فریب، بے ایمانی و بددیانتی ہوں۔ ذرا اس دنیا کا خوب اندازہ کیجئے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان کے تمام مثبت اخلاق و روحانی ملکات کی نفی کرنے کے بعد فطرتِ انسانی میں محض خلا تجویز کرنا صرف کسی اول درجے کے احمق کا کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ مثبت اخلاق و روحانی مثبت ملکات کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ان کی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے اخلاقِ ذمیمہ اور روحانی رذالتیں آجاتی ہیں۔ دیانت و وفا کو فطرتِ انسانی سے کھرچ دو تو بلا خیال کئے اور بلا محسوس کئے وہاں بددیانتی و غدر براجمان ہوں گے۔ ہاں اگر سرے سے حیات ہی کو ختم کر دیا جائے تو پھر رذائلِ اخلاق کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ مثبت اخلاق و مثبت روحانی ملکات کا انکار و خاتمہ منفی اخلاق و روحانی رذالتوں

کو جمع کیجئے پھر اُن سے دریافت کیجئے کہ اب وہ اپنی نوعی خوش قسمتی کا اندازہ کریں اور ساتھ ہی اپنی آیندہ منزل کیطرف نظر اٹھا کر دیکھیں کہ کیا وہ پوری صفائی سے نظر آرہی ہے یا نہیں۔ پہلی نگاہ میں ان کے دل سے متحدہ آواز نکلے گی کہ نیکی خود ہی اپنا بدلا بھی ہے۔ مگر جب ان کی نگاہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے گی تو اپنے اس فیصلے میں ترمیم کرتے ہوئے متفقہ طور پر یہ کہہ دیں گے کہ نیکی کا بدلا دائمی اور ابدی ہے "اے انسانِ کامل تیرا اجر دائمی ہے" القرآن ممکن ہے کہ کوئی پست ہمت اذیلِ فطرت اور جلد باز کہدے کہ یہ سب خیالِ خام اور ناممکن بات ہے۔ جواب یہ ہے کہ کیوں ناممکن ہے؟ کیا صدق و صفا، مودت و وفا محبت و رحمت، شفقت و باہمی خیراندیشی، عدل و ایثار، دیانت و ایمانداری عفو و درگذر حلم و تحمل، صبر و شکر، تسلیم و رضا، توکل و باہمی حسنِ ظن اور بایت درجہ جد و جہد کے ساتھ غایت درجہ اعتماد علی اللہ کا جوہر انسانی دنیا میں موجود نہیں؟ کیا ایک غائب و حاضر کو جاننے والے خیر کے سرچشمے اور شر و نقص سے پاک خدائے برحق کا اعتقاد، انسانیت میں نہیں پایا جاتا ہے۔ کیا انسان کے باہمی نوعی بھائی چارے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا یقین تاریخِ انسانی میں ناموجود ہے؟ اور اگر یہ سب کچھ موجود ہے تو پھر اسے تعمیرِ انسانی کے عناصرِ ترکیبی بنانے کے بجائے خیالِ خام و ناممکن الوقوع بتانا خودکشی و انسانیت دشمنی کے علاوہ کیا ہے؟ آخر اس میں عقل و خرد کا کوئی بھی حصہ ہے کہ ایک

میں انسانیت کے لئے کیسی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ میں ابھی اسی دنیا کا خاکہ کھینچتا ہوں کہ جس میں ہم تم سب بس رہے ہیں جب تک موجودہ قدم واضح طور پر ان خطوط پر تعمیر نہ کر لیا جائے کہ جو انسان کے مقامِ شرافت کے اجزائے ترکیبی ہیں اور جن کا چونا سیمنٹ اینٹ گارا بالکل انھیں مخصوص صلاحیتوں اور خصوصیتوں سے تیار ہوتا ہے کہ جو انسان کو کائناتِ حیوانی سے امتیاز دینے والی ہیں، اس وقت تک نہ تو اس کے نوعی تنزل و انحطاط سے بچنے کی کوئی صورت ہے اور نہ آیندہ کے قدمِ ارتقا کا کوئی پتہ چل سکتا ہے۔ اب آئیے فرض کریں کہ نوعِ انسانی نے اپنی مخصوص فطرت کے ساتھ غدر کرنے سے بالکل توبہ کر لی ہے اس لئے تمام اخلاقی رذالتیں اور روحانی گمراہیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ اور ایک ایسی تعمیر کا اس نے آغاز کیا ہے کہ جس کا ڈھانچہ ایک جامع جمیع صفاتِ کمال خالق برحق کی رضا جوئی اور ہر حرکت و عمل میں اس کے سامنے جوابدہی (۲) نوعِ انسانی کی عالمگیر اخوت (۳) اور کائنات میں انسان کے اشرف المخلوقات اور خلیفہ خدا ہونے کے اعتقاد سے تیار ہوا ہے۔ اس کا اینٹ گارا اور چونا سیمنٹ صدق و صفا، مودت و وفا، محبت و رحمت، شفقت و باہمی خیر اندیشی، عدل و ایثار، دیانت و ایمانداری، عفو و درگذر، حلم و تحمل، صبر و شکر، تسلیم و رضا، توکل و اخلاص اور باہمی حسن ظن ہیں۔ ذرا اس خالص انسانی مواد سے بنی ہوئی دنیا میں چند یوم کے لئے نوعِ انسانی

عدم کی بے حس کال کوٹھڑی میں جا کر سو جائے مگر خاطرِ فطرت کے مسلسل ترغیبی الہام کی ماتحت اس نے اپنی مخصوص جہد للبقا کو جاری رکھا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ یہی حیاتِ نباتی ایک حاکمانہ اور قاہرانہ انداز سے ساری زمین پر محیط ہو گئی۔ پھر ان لا اُبالی جھاڑوں جھنکاڑوں اور سربفلک درختوں کی ہمہ گیری میں جب پہلے پہل حیاتِ حیوانی نے اپنے ظہور کی آنکھ کھولی ہو گی تو ذرا اس سہمے ہوئے کا تصور بھی باندھو۔ اپنی کمزوری کے مسلسل احساس اور ناسا عدو مخالف ماحول کی حیرت انگیز قوت نے اس ننھی سی شمعِ حیات کو کتنی دفعہ خود سے خود بجھ جانے کی ترغیب دی ہو گی۔ کتنی دفعہ شیطانِ تنزل و ابلیسِ انحطاط نے نہایت میٹھے سروں میں اس نئی خود ارادیت کے کانوں میں یہ آواز ڈالی ہو گی سے

مزاجِ زیست سے آب و ہوا یاں ناموافق ہے
کہ گرمی میں پگھل جاتے ہیں سردی میں ٹھٹھرتے ہیں

لیکن خاطرِ فطرت کی رحمت و ربوبیت کے مسلسل الہامِ بقا نے کس کس طرح اس احساسِ ضعف کے باعث خود سے خود ٹوٹ جانے پر آمادہ اور نہایت کمزور نظامِ اعصاب کو بار بار ترغیب جد و جہد دی ہو گی اور پھر کس طرح اس ڈھارس کی ہدایتِ مسلسل کے باعث آخر وہ وقت بھی آیا کہ جب یہی چھوٹی سی حیوانی نمود نو ایک طوفان کا ریلہ بن کر سب شجر و حجر سے لے کر سارے برگ و بار پر مالکانہ قابض ہو گئی حیات کے

شخص صرف اس لئے خودکشی پر آمادہ ہو جائے کہ اس کی نگاہ میں حیاتِ ابدی کی راہ مشکل ہے۔ بلاشبہ حیوانی رذائلِ اخلاق کے مقابل انسانی اخلاقی عزیمتوں کا مادہ بہت تھوڑا ہے اور حیوانی جذبات و جبلتوں Instincts کے مقابل روحانی احساس وشعور و وجدان ابھی بہت کمزور ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ہر انسان میں اس مقدار میں موجود نہیں کہ اگر اس کی ٹھیک ٹھیک دیکھ بھال کی جائے اور نوعی طور پر اس کی ترقی و تربیت کو عالم انسانی کا مقصدِ اولی قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت کرنے والے بزدلوں کے خلاف مجلسی تعزیرات (سوشل سنکشنز) عاید کرنا شروع کر دی جائیں تو یہ مختصر سی قوتیں پھیل کر ساری انسانی کائنات پر نہیں چھا سکتیں۔

سلسلۂ ارتقا پر ایک عبرت خیز نظر

آخر ذرا اس وقت کا تصور باندھو کہ جب ابھی ابھی زمین کی سخت اور چٹانی قسم کی سطح کو پھاڑ کر حیاتِ نباتی نے کائنات کی وسعت پر نظر ڈالی ہو گی۔ اُسے کس طرح ایک طرف اپنی نہایت درجہ کمزور ہستی کا احساس ہوا ہو گا اور دوسری طرف اُسے سارا لق و دق بیابان کتنا اپنی زندگی کے مخالف محسوس ہوا ہو گا۔ کتنی دفعہ اس کے کمزور سے شعورِ ذات میں یہ خیال آیا ہو گا کہ بہتر ہے کہ اس ناموافق وسعت کدۂ ہست و بود کے مقابل ایک بے سود جنگ کرنے کے بجائے وہ پھر

ہی طرح بے بس اور مجبور پایا۔ لہٰذا ان کی فطرت کی تیز نگاہی نے انھیں
اس سب سلسلۂ جبر و اکراہ سے نکتہ نگاہ کرتے ہوئے اس اصلی محرّک
کل، ہستیٔ مطلق کی طرف استغاثہ کرنے کا مشورہ دیا کہ جو اس سارے کارخانۂ
حکمت و تدابیر کو اس طرح چلا رہی ہے کہ ایک حکمت سے دوسری حکمت
اور ایک تدبیر سے دوسری تدبیر اس طرح پھوٹ رہی ہے کہ جس طرح ایک
کونپل سے ایک کلی ایک کلی سے ایک پھول اور ایک پھول سے ایک پھل پھوٹ
رہا ہے۔ یہ ایسا منظر تھا کہ جس نے بابا آدم کی رہنمائی اصل
سرچشمۂ خیر و فلاح کی طرف کی۔ دونوں نے واویلا کیا اے فاطر فطرت
جس نے سوائے ہمارا مشورہ لئے ہمیں نیست سے ہست کیا تو ہماری
بے بسی کو دیکھ رہا ہے، ہمارے احساسِ غم سے واقف ہے۔ اگر ہماری
حیات کی بقا سے تیرا کوئی حکیمانہ منصوبہ وابستہ ہے تو غیوبِ مطلق کے
پردے کو اٹھا اور ہماری اعانت کر ورنہ موجودہ احساسِ غم سے ہمارے
لئے عدم کی نیند زیادہ کشش رکھتی ہے"۔ یہ چیخنا ہوا نالۂ جانگداز نکلنا تھا
کہ انسان پر اپنی تدبیر نوعی کا الہام شروع ہوگیا اور یہ سب سے کمزور اور
سب سے آخری مخلوق اسی تدبیر نوعی کے الہام کی رہنمائی میں جمادات
ونباتات وحیوانات پر اس طرح چھا گئی کہ آج اسے چیلنج کرنا ان میں
سے کسی کے بس کی بات نہیں۔ اب جب ہم انسان کی تدبیر نوعی کی
تاریخ کو تاریخ حیوانات سے مقابلہ کرتے ہوئے متعین کرنا چاہتے ہیں
تو ہمیں انسان کے اخلاقِ حسنہ کی وہ فہرست نظر آتی ہے کہ جو صدیہا

جہدللبقا کے اس نئے مظاہرے کے بعد ابھی کل یا پرسوں صبح کا وہ عجیب و غریب واقعہ بھی یاد کرو کہ جب اماں حوا اور باوا آدم یا پہاد یواور پاربتی عدم کی گپھا سے آنکھیں ملتے ملتے باہر آئے اور یکایک انہیں نظر آیا کہ وہ ایک ناقابل ورک وسعت زار ہست و بود کے روبرو کھڑے ہیں اس کے بعد انھوں نے اس حیران کن وسعت کی طرف سے اپنی نگاہوں کو قدرے سمیٹا اور پھر دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک چپٹی سی بے ڈھنگی چٹان پر کھڑے ہیں اس کے بعد انھوں نے جب کسی پرامن مقام کی تلاش میں دائیں بائیں دوڑنا شروع کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک ناہموار چٹان پر کھڑے ہونے کے بجائے ایک بڑے بھاری گولے پر چپکا دئے گئے ہیں جہاں انہیں آگے پیچھے اور دائیں بائیں رینگنے کی تو اجازت ہے مگر اڑ کر کسی اور محاذ پر چلے جانے کی سب راہیں بند ہیں۔ غضب یہ ہوا کہ جب انھوں نے مزید خود مرکزیت اختیار کرتے ہوئے اپنے قریبی ماحول کا گہرا جائزہ لینا شروع کیا تو انہیں پہلے تو لا اُبالی قسم کے سر بفلک درخت نظر آئے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی شاخوں اور تنوں میں لپٹے ہوئے ہزار در ہزار سانپ بچھو، مگر، شیر، اژدہے اور بھیڑیے نظر آئے جن میں سے ہر ایک ان دونوں کو ہڑپ کر جانے کے تیوروں سے دیکھ رہا تھا۔ پاربتی اور باوا آدم نے بے بسی کی حالت میں کبھی کسی شیش ناگ کبھی کسی ہنومان کے جد اعلیٰ کبھی کسی سورج اور کبھی کسی چاند کی طرف دستِ اعانت دراز کیا مگر بالآخر ان میں سے ہر ایک کو یا تو اپنے مخالف پایا اور یا ایسی

سے انسانی برادری اپنی تدبیر کو سمیٹے تو انسانی زندگی میں سے شروفساد
ختم نہ ہوگا۔ تم اس وقت ساری کائنات میں جس تضاد کا پتہ دے رہے ہو
س کا کوئی وجود نہیں۔ حقیقت میں چونکہ تمہارے قوائے حیات کے
امنے سے ان کا فطری نصب العین گم ہو چکا ہے۔ اس لئے ان میں ایک
ر فطری الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے جو تمہارے ہی حواس کے ذریعہ کائناتِ فطرت
اثر انداز ہوتا ہے اور وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ایک یرقان زدہ
ے لئے اس وقت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب اُسے ساری دنیا زرد محسوس ہونے لگتی
ہے۔ کیا صدر میں عرض کئے ہوئے سلسلۂ تخلیق سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ سلسلہ
یک شعورِ اعلیٰ کے دباؤ سے وضاحت کیساتھ ایک اعلیٰ مقصدیت کو اُٹھائے
وئے ایک دائمی ارتقا کی طرف محو پرواز ہے؟ کیا اس سے پوری وضاحت
ے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حیات کی اس شعوری رفتار نے آخری دفعہ جب
وبال نکالے ہیں تو اس میں شعور نے شعورِ محض کے درجے سے ارتقا
تے ہوئے ایک مفصل شعورِ نیک و بد ایک مشرح شعورِ ثواب و عذاب
ور ایک واضح شعورِ خیر و شر کی شکل اختیار کی ہے؟ کیا پنہانئے ہستی
ود میں سلسلۂ تخلیق کے کسی مخصوص نوع کی فلاح و بقا و ترقی کے
نے سوائے اس کے اور کچھ ہو سکتے ہیں کہ اس نوع کی اپنی نوعی خصوصیتیں
رمابہ الامتیاز قوتیں اسکی باقی عام انداز کی قوتوں کے مقابل زیادہ
ھلیں پھولیں؟ جمادات کی بظاہر جامد و بے حرکت ہستی کے مقابل آخر
ات نباتی کے معنے سوائے اس کے کیا تھے کہ اس کی قوتِ نمو اُسے

کسی جگہ مندرج ہے۔ یہی وہ خواص و امتیازات ہیں کہ جو انسان کو
سلسلۂ تخلیق سے امتیاز دیتے ہیں اور جن پر انسانی کائنات کی بائر
تعمیر اس طرح ہو سکتی ہے کہ آئندہ کا قدم خود بخود مشہود ہونے لگ
ہے۔ حیات کی حرکت اپنے ظہور اول سے اس وقت تک تمام نامسا
حالات کے ظاہر میں وجود کے باوجود آگے کو ہے۔ ایک کلی شعور وا
کی طرف سارا سلسلۂ حیات و نما کھچا جا رہا ہے۔

مارکسی گروہ خوب غور کرے

مارکسی سراب حیات میں پھنس جانے والے غیر مآل اندیش وا
لیند بھائیو! خوب غور کرو کہ سلسلۂ حیات کے متعلق صدر میں جو کچھ عر
ہے ایک عالمگیر شعور کلی کی تدبیر و حکمت کا پتہ دیتا ہے یا کوئی نامعقو
غیر شعوریت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کائنات کی بعض کڑیوں پر شعور
ہیبت ناک و حیران کن اور پر وقار ہے اور بعض کڑیوں پر دلکش جاذ
نگاہ اور پر بہار ہے۔ اگر بعض مقامات پر وہ حیران کن ہے۔ تو اس لئے
ہم اس کڑی سے زیادہ مانوس نہیں۔ اور جہاں اس کی وضاحت آفتاب
طرح واضح ہے اس لئے ہے کہ ہم اس کڑی سے زیادہ واقف ہیں جس مقام پر حیات لیکل
فائض ہے کیا اسکے انکار میں کوئی منطق ہے۔ کیا جو اخلاقی و روحانی قدر
میں بیان کیگئی ہیں ان کے وجود سے منکر ہونے میں کوئی عقل و تدبیر اور کوئی خیر
ہے؟ کیا اس میں کوئی شک کی گنجائش ہے کہ اگر ان پر پوری دیانت و عز

دن اس نئی مخلوق کے پاس کتنی مختصر سی قوت نمو تھی؟ مگر تم نے دیکھا
کہ آخر یہی امتیازی اختصار سارے بے امتیاز پھیلاؤ پر محیط ہو گیا۔
پھر حیاتِ حیوانی کے طلوعِ اول کے وقت اس کے پاس حیاتِ نباتی
کے مقابل حرکتِ ارادی کی کتنی قلیل مقدار تھی؟ مگر آپ نے دیکھا کہ آخر اس
نئے خاصۂ حیات نے کس پھرتی کے ساتھ میدان مار لیا۔ اب اگر انسانی
کائنات کی تعمیر صرف انھیں چند زریں تنکوں کے ذریعہ شروع کی جائے
کہ جو حضرتِ انسان کی اپنی مخصوص ملکیت ہیں تو کیا اس میں
شک ہے کہ غایت درجہ مختصر ہونے پر بھی یہ بقعۂ نور تنک کائنات زیر
و بالا نہ ہو جائیگا؟ کیا جس وقت حیاتِ نباتی نے اپنی مخصوص نوعی راہِ
عمل پر اپنی قوتوں کو مرکوز کیا تو تم نے نہیں دیکھا کہ کائنات زیر و
بالا نے کس طرح اس کی تائید کی، یہاں تک اس کا نوعی ضعف ایک
بے محابا قوت بن کر اپنے ماحول پر چھا گیا؟ حیاتِ حیوانی نے جب اپنے
مخصوص نوعی الہام کی ہدایت کو قبول کیا اور اپنی راہِ عمل کو اپنی
مخصوص فطرت کے مطابق معین کیا، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ماحول کے
ہر ذرے نے اس کی تائید کی اور آخر خوف و ہراس کے کوچے سے نکل
کر اس نے کامیابی و رفاہیت کے میدان میں اپنے خیمے گاڑھ دئے
کیا اگر انسان اپنی مخصوص فطرت کی رہنمائی میں اپنی دنیا تعمیر کرنا
شروع کرنے لگے، چاہے قدمِ اول پر وہ کتنی مختصر ہی کیوں دکھائی نہ دے
تو کیا خدائے فطرت اس کی دست گیری کرنے میں اپنی پچھلی سنتِ

جمادات سے تمیز دینے والی تھی، بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ حیاتِ نباتی
ساری سطح ارض پر چھا گئی۔ پھر اس حیات نباتی کے مقابل حیاتِ حیوانی
سوائے اس کے اور کیا تھی کہ اس میں وہ امتیازی قوت کہ جسے حرکت
ارادی کہتے ہیں اور جو ایک جاندار کو ایک ہی مقام کی پابندی سے
آزاد رکھتی ہے زیادہ اور نمایاں ترقی کرتی جاے۔ اب اس نیم شعوری
حیاتِ حیوانی کے مقابل بقائے انسانی کے اس کے سوائے کیا معنیٰ ہیں کہ
اس کا وہ شعور اعلیٰ ترقی کرتا جائے کہ جو اسے سلسلۂ حیوانات سے ایک
امتیازی حیثیت دیتا ہے؟ یہ شعورِ اعلیٰ انسان کے اخلاقی و روحانی احساس
و شعور کے علاوہ کیا ہے؟ کیا اس میں شک ہے کہ اگر انسانی
کائنات کا ضابطۂ حرکت و سکون اقتصادی عامل کی حیوانی انداز
کی تنازع للبقا کے بجائے خدائے برحق کے سامنے جواب دہی کے
احساس، شرافتِ انسانی کے اعتقاد اور نوعی اخوتِ انسانی کے یقین
صداقت و دیانت، عفو و ایثار، مسلسل جہد کے ساتھ لگاتار توکل علی
اللہ، حلم و صبر، شکر و رضا، عدل و اعتدال۔ باہمی حسن ظن و خیر اندیشی
سے بنے تو وہ آپ کی کائنات سے ہزار گنا افضل نہ ہو گی؟ کیا حقیقی
سیرت انسانی کے یہ زرین عناصر دنیا میں ناپید ہیں؟ کیا وہ فطرتِ انسانی
میں اتنی مقدار میں موجود نہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے اور حیوانی رذائل
سے پاک کرتے ہوئے انسانی کائنات کی تعمیر صرف انہیں پر کی جانے لگے
تو وہ کافی نہ ہو سکیں؟ سطح ارضی پر حیاتِ نباتی کی پہلی صبح ظہور کے

طرف ماضی میں نکل جائیں اور مادے کی سب سے پہلی حرکت کا تصور باندھیں۔ کیا یہ حرکت قانون، ترتیب، ضابطے (ڈسپلن) اور نظم (سسٹم) کی پابندی سے آزاد تھی یا قانون ترتیب ضابطے اور نظم کی ایک محکوم اور غلام تھی؟ اگر اُسے نظم و ترتیب وغیرہ سے آزاد گمان کرنے کا کوئی فرضی امکان بھی موجود نہیں تو پھر فرمائیے کہ مادے کے ہر حرکت و سکون کو اس طرح ہر قدم پر اپنے بس میں رکھنے والی ترتیب (آرڈر) ضابطہ (ڈسپلن) اور قانون (لا) مادے کی لاشعوریت کی پیداوار ہیں؟ ہے کوئی منطق کہ جو لاشعوریت مطلق کو آفاق گیر ترتیب آفاق گیر ضابطے اور عالمگیر قانون کا خالق بتا سکے؟ لاشعوریت تو ترتیب ضابطے اور قانون کی نفی کا نام ہے۔ یہ جاہلانہ ضد و عناد اس وقت اور بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے کہ جب انسان دیکھتا ہے کہ حیات کس طرح ایک مسلسل شعوری ترتیب کیساتھ نقطۂ انسانی تک پہنچ کر سرتاسر شعور و ادراک ہو گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مادے کے بعض ایسے مدارج فرض کئے جا سکتے ہیں کہ جن میں مادے پر شعور کی گرفت اس رنگ کی نہیں کہ جس رنگ پر وہ بعد کے مراحلِ حیات پر معلوم ہوتی ہے۔ اس سے زاید کہنے والا اول درجے کا جھوٹا ہے۔ ممکن ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر کوئی شخص یہ سوال کر بیٹھے کہ مانا کہ ترتیب، ضابطہ، قانون اور حیات بے شعور و مجبور قانون مادے کی تخلیق نہیں تو آخر ان چیزوں کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ تم اپنے مخصوص نوعی راہِ عمل کی ایما ندارانہ

جاریہ کا اعادہ نہ کریگا؟ قرآن کہتا ہے "او انسان حقیقی تیرا اجر غیر منقطع ہے" پہلے قدم پر نیکی خود اپنا کافی بدلا معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بدی کی کائنات سے نیکی کی کائنات بہرصورت افضل و اعلیٰ ہے لہذا وہ خود ہی اپنا بدلا ہے۔ میرے تمہارے حوصلے کے لئے بظاہر اتنا اجر کافی و وافی معلوم ہوتا ہے مگر جو خاطر فطرت نیکی کو منجمد کر کے ضائع کرنے کے مخالف ہے اُسے یہ گوارا نہیں کہ نیکی کو اپنا بدلا خود بننے دے۔ اس لئے وہ اپنی نورانی چلمن کی غایت درجہ نورانی سلکیوں سے ایک پر وقار اشارے میں کہہ دیتا ہے" او انسانِ حقیقی تیرا اجر غیر منقطع اور دائمی ہے"

خدا کہاں ہے؟ اور بے شعور مادہ کہاں ہے؟

بے شعور مادے کی ہمہ گیری کی حقیقت

اخلاقی و روحانی شعور و احساس و ارادے کی نفی کرنے کے بعد جس طرح حقیقت میں حیاتِ انسانی ہی کی نفی ہو جاتی ہے جو غایت درجہ لغو حرکت ہے۔ بے شعور مادے کی ہمہ گیری کا خیال اس سے بھی لغو تر بات ہے۔ کیا مادے کی کسی ایسی صورت یا حالت کا اندازہ قائم کرنا ممکن ہے کہ جس وقت اس کی حرکت کسی نہ کسی ترتیب (آرڈر) کسی نہ کسی ضابطے (ڈسپلن) اور کسی نہ کسی قانون (لا) کی پابند نہ ہو؟ آؤ ہم دس ہزار ارب برس پیچھے کی

سے کہیں جامع تر ہے۔ صدر ریں میں جس شعور واحساس کو بار بار اخلاقی
ور وحانی شعور واحساس بتاتا چلا آیا ہوں اس کی اصل الفس و آفاق
دونوں سے باہر ہے۔ الفس و آفاق تو زمان ومکاں کے قیدخانے کے
دو پہلو ہیں۔ اس کے داخلی پہلو کو الفس اور خارجی پہلو کو آفاق کہا جاتا
ہے۔ انسان جس حیاتِ نو کا نام ہے وہ الفس و آفاق کے سارے عمارہ
عناصرِ ترکیبی کے علاوہ ایک ایسا مزید نورانی عنصر اپنے اندر رکھتا ہے
کہ جس کی اصل مکاں وزماں کے قید خانے سے کہیں باہر ہے اور اسکی
طرف رہنمائی صدر ہیں عرض کردہ ساری اخلاقی وروحانی ڈسپلنز کو اپنے
اوپر عاید کرتے ہوئے انکشافِ حق کے لئے لگاتار دعا سے ہوتی
ہے۔ قطعاً وحتماً ہوتی ہے۔

بندگی کے دو درجے

جو شخص صدر کے حقوق و فرائضِ انسانی کی پابندی اس لئے
اختیار کرتا ہے کہ وہ ایمانداری سے محسوس کرتا ہے کہ ایسا نہ کرنے
کی صورت میں اس کی نوعی تباہی ہوگی۔ لہذا وہ ساری اخلاقی وروحانی
ڈسپلنز کو برضا و رغبت اپنے اوپر حاوی کرتا ہے۔ یہ بھی بندگی والیمان
کا مقام ہے مگر یہ اربابِ تقلید کا مقام ہے۔ مذہب پرست دنیا کی اکثریت
اسی عنصر پر مشتمل ہے (میں نے گاندھی جی سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وردھا
میں ملاقات کی۔ میں انہیں توحید و اخوتِ محمدی کے نظم کی طرف متوجہ

پابندی شروع کرو تو تمھارے لئے تمھاری سطح شعور کے موافق یہ سرچشمۂ ادراک و شعور خود محسوس ہونے لگے گا۔ میں عملی تجربہ عرض کررہا ہوں انسان کے نوعی خزائن بالکل بدھیات اولیہ ہیں۔ انسان کی فطرت ہر شخص کو اپنا ضابطۂ زندگی بنانے کا فطری داعیہ اپنے اندر رکھتی ہے جب ایمانداری کے ساتھ انسان ان فطری ہدایتوں پر عمل پیرا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ ہدایت طلبی ہی نہیں کرتا بلکہ انکشاف حق کی چھپی ہوئی آگ کو اپنی روح کے عمق میں سلگنے دیتا ہے تو بلاشک اس کی حیات کے لئے کلی سامانِ تسکین ہوجاتا ہے۔ وہ مجاہدے کے ایک مختصر سے عرصے کے بعد ایک صبح یا ایک شام یا ایک دوپہر یا ایک آدھی رات کو یا تو نور کی ایک ناپید کنار مگر شعوری وسعت میں اپنے آپ کو لپٹا ہوا پاتا ہے اور یا سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک یقین سے لبریز ہوجاتا ہے۔ دوسری حالت پہلی سے زیادہ واقعیت رکھتی ہے۔ اور اس میں سب سے زیادہ اہمیت کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ اس مقام پر ہم میں جو ادراک کی نئی لہر پیدا ہوتی ہے وہ محض انفسی subjective ادراک یا محض آفاقی (objective) ادراک سے کہیں زیادہ قوی کہیں زیادہ جامع اور کہیں زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہے۔ میں مضمون کی ابتدا میں کہہ آیا ہوں کہ انسانی زندگی کو محض انفسی پیمانے سے ماپنا بھی اتنی ہی بڑی گمراہی ہے جتنی گمراہی اسے محض آفاقی پیمانے سے ماپنے میں ہے حیاتِ انسانی انفسیت و آفاقیت دونوں

سارا دن اپنی پھوٹی قسمت کو رویا کرے کہ جو بلا استحقاق دنیا جہاں کے سارے پکے ہوئے پھلوں کو ہڑپ کر جانے کے باوجود ان سب پھلوں کو پکانے والے سورج کی ہستی اور اس کی روشنی دونوں کے منکر ہیں۔ روحانی فرائض و واجبات سے آزاد رہتے ہوئے جو طبقات ان انکشاف حق کے متمنی ہیں وہ بالکل انھیں چمگادڑوں کے گلے میں شمار ہونے چاہئیں۔

حاصل کلام

اپنے تمام ان اعمال پر نادم ہو جاؤ کہ جو تمھیں بداہتًہ فطرت انسانی کے خلاف محسوس ہوں۔ اُن تمام اعمال پر مواظبت کرو کہ جو تمھیں شرافت انسانی کے مقام اعلیٰ کے مناسب معلوم ہوں۔ اگر حیات ابدی کی تلاش کا کوئی داعیہ اپنی فطرت میں محسوس ہو تو اُسے اور اُجاگر کرنا شروع کرو اور اس سلسلۂ عمل کو جذبات پرستی کے رنگ میں مت قبولو بلکہ اپنی فطرت کے ٹھنڈے احساس فرضی کے ماتحت اس پر عمل شروع کرو تو یکے بعد دیگرے شکوک گم ہونا اور حجابات اٹھنا شروع ہونگے یہاں تک کہ ایک دن سارے جہاں کے پھول پھلوں کو پرورش کرتے اور پکانے والے سورج کی شعاعوں میں اپنے آپ کو لپٹا ہوا محسوس کروگے انسانی قسمت کا آزمایا ہوا نسخہ یہی ہے۔ تقدیر انسانی یہی ہے جس طرح ہر فن میں کمال کے لئے انسان کے اندر زور دار داعیے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس مخصوص انسانی وادی میں بھی تم کامیاب

کرنے کے لئے ملا تھا۔ یہ ان کی خاموشی کا دن تھا۔ اس لئے وہ بولنے
کے بجائے کچھ لکھ دیتے تھے اور بابو راجندر پرشاد اُسے مجھے سنا دیتے
تھے۔ گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ وہ اُس وقت تک خدا کو محض اخلاقی
دباؤ کے ماتحت مانتے ہیں اور مجھ سے پوچھا کہ اگر میں انھیں اس کے علاوہ
کوئی عملی یقین کرا سکوں۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ اس بات کیلئے ہمیں تین
ہفتے ایک ساتھ رہنا ہوگا۔ افسوس کہ اس کا موقع نہ آیا) ایک گروہ وہ
ہے کہ بقائے نوعی کی ان پابندیوں کا منکر تو نہیں مگر اتنی سی بات پر وہ
قانع بھی نہیں کہ "نیکی خود اپنا معاوضہ ہے" بلکہ اس سے غیر قانع ہو کر
وہ پورے انکشاف حق کا متمنی ہے۔ کائنات انسانی کی ساری رفاہیتیں اور امن
اسکی عزیمت کا نقطۂ مقصود نہیں بن سکتے بلکہ اپنی حقیقی قرارگاہ سے ادھر اسکی ہمت
کہیں رکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنکی بیتابیٔ روح کے مسلسل نالے جا جا نکرا
مکان و زماں کے در و دیوار کو شگاف کرتے ہوئے اپنی اصل قرارگاہ کیطرف نگاہِ
متجسس کے لئے راہیں نکال لیتے ہیں۔ یہ انبیا و صدیقین کا گروہ
ہے ان کے لئے یقین و مشاہدے کے وہ مناظر و مقام اسی دنیا میں
منکشف ہونے لگتے ہیں کہ جو عام نوعِ انسان کے لئے عملاً شاید دیر میں
کھلیں اگر کوئی اس عرض کردہ راہ پر عمل کرنے پر آمادہ نہیں اور پھر
بھی صدر کا سوال دھرائے جاتا ہے یعنے بار بار یہ پوچھتا ہے کہ آخر
وہ سرچشمۂ خیر و فلاح اور منبع شعور و حیات کہاں ہے؟ تو میں اس
سے عرض کروں گا کہ وہ چمگادڑوں کہ ان جھنڈوں کے ساتھ ملکر سارا

جب کمیونسٹ طبقات تاریخی مادیت کہتے ہیں تو معلوم نہیں کہ یہاں لفظ تاریخ سے ان کی کیا مراد ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کی مراد حیاتِ انسانی کے اقتصادی عامل کی تاریخ ہے جو ان کی تمام کتابوں سے معلوم ہوتا ہے تو یہ ایک غایت درجہ خیانت آمیز مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ پیٹ اور بقاے نسل کے لئے انسانی یا حیوانی کشمکش بالکل انسان وحیوان کی اندرونی فطرت کا ایک احساس ہے ظاہر ہے کہ یہ بھوک اور توالد وتناسل کا احساس مادی ماحول کا کسی صورت حصہ نہیں۔ وہ تو انسان کی اندرونی زندہ فطرت کا ایک احساس ہے۔ اس کی کشمکش کو مادیت یا تاریخی مادیت قرار دینا یا تو خیانت ہے یا ادراک کا فقدان ہے) کیا یہاں پر ان کی مراد تاریخ سے تاریخ فطرت کے وہ ابواب ہیں کہ جو مارکس و اینگلز کے زمانے میں مرتب کئے جارہے تھے اور جن میں سب سے زیادہ حصہ ڈاروِن کی تحقیقات کو ہے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے (جو غایت درجہ لیطلان ہے۔ اس لئے کہ اُسے اقتصادی عامل کی تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ اقتصادی عامل تو حیات کا ایک خالص داخلی احساس ہے۔ جیسے بھوک پیاس اور بقاے نسل کا احساس۔ اس کی بھی تاریخ ہے مگر اسے ماحول کی تاریخ سے غلط ملط کرنا خیانت ہے)۔ تو یہ اول درجے کی جہالت معلوم ہوتی ہے کہ وہ تاریخ فطرت کے نہایت ابتدائی ابواب کو اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کی زندگی پر کلی طور پر منطبق کریں۔ وہ ابواب تو حقیقت میں تاریخ حیاتِ انسانی کے سلسلے سے ہی خارج رہیں۔ انھیں تاریخ حیات انسانی کے بجائے حیات کے ماحول کی

مسافر جب ہی ہو سکتے ہو کہ جب تم میں بندگی کا زوردار داعیہ ہو۔
محض سیر و تفریح کے خیال سے وادیٔ ایمن کے جلوے کے روبرو نہیں
جاسکتے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ قافلۂ انسانی ہر دور اور ہر آن میں ایسے لاکھوں
کارل مارکسوں سے بھرا رہتا ہے کہ جو ان مخصوص رجحانوں کا قلع و قمع
کرنا اپنا فرض بنا لیتے ہیں۔ یہاں پر یہ شبہ بھی دور کر دوں کہ یہ مقام
انسان کا نوعی مقام ہے محض افراد کی مونوپلی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ
نوعی طور پر ابھی انسان نے "آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی" کا نعرۂ
صدق و اخلاص سے بلند نہیں کیا

کارل مارکس کی تاریخِ انسانی کی خیانت

اس مضمون کے صدر میں جو تین سوال نقل کئے گئے ہیں اور جن کے
جواب پر یہ مضمون مشتمل ہے ان میں سے تیسرے سوال کو ایک دفعہ پھر
غور سے دیکھو! اُسے پھر دھراتا ہوں۔ "مارکس اور انگلز نے پوری تاریخ
کو سامنے رکھ کر جس طرح وظائفِ حیاتِ انسانی کو معین کیا ہے اس
کوشش کو دینِ انسانی کی آخری کڑی اور سب سے کامل تعبیر کیوں نہ قرار
دیا جائے" ذرا اس سوال پر چند دفعہ غور کرو یہاں تک کہ تمہیں کہنے
والے کے متعلق کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ پھر اس پر غور کرو کہ کارل مارکس
کے استدلال کا سر عنوان "تاریخی مادیت" ہے۔ اس کی مادیت کا تارو
پود اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ اب اس کی تاریخ دانی کا تجزیہ بھی دیکھ لو

رکھ کر بھی کوئی شخص انسان کی اقتصادی تعمیر کا خاکہ تیار کرنا چاہتا ہے تو اس کی صحیح اور دیانت دارانہ شکل یہ تھی کہ حیات انسانی کے کم از کم ان سب محرکات و عوامل کا استقصا کیا جاتا کہ جو تاریخ انسانی میں پھیلے ہوئے ہر سادہ لوح سے سادہ لوح انسانوں کو بھی معلوم ہوتے ہیں یہ نفسیاتی عوامل ہیں، اخلاقی عوامل ہیں، روحانی عوامل ہیں اور اقتصادی عوامل ہیں ان سب کا آپس میں عمل و ردِّ عمل معلوم کیا جاتا اور اس طرح سے اقتصادی عامل کی ماضی کی حرکت کا ایک اندازہ قائم کرتے ہوئے اسی کی روشنی میں اس کے مستقبل کے متعلق کوئی جچا تلا خاکہ تیار کر لیا جاتا۔ امید کی جا سکتی تھی کہ اس صورت میں کوئی مفید و صحیح خدمت انسانی انجام پاتی لیکن جب تک ایک جزو کو اپنے کل کے اندر اس کے صحیح مقام بحیثیت شدہ حالت میں نہ دیکھا جائے اس وقت تک اس کے فنکشن کا کیا خاک پتہ چل سکتا ہے۔ پھر یہ ستم ظریفی اس وقت حد کو پہنچ جاتی ہے کہ جب اسی جزو کو مستقبل حیثیت دیتے ہوئے اس کے علاوہ کل کے ہر تصور کو نظرانداز کیا جائے اور پھر اسی جزو کو کل کا ہم معنے سمجھتے ہوئے اس جزو کے اسی جزوی فنکشن کو کل کے کلی فنکشن کے مساوی قرار دے دیا جائے آخر ایسی خیانت کا نتیجہ گمراہی اور ہلاکت کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔
بلاشک مارکس نے تاریخی نقطۂ نظر سے یہی کچھ کیا ہے۔ اس نے تاریخِ انسانی کے ہر عامل کو نظرانداز کیا۔ ان کے انکار کرنے کے

تاریخ کہنا صحیح ہے۔ حیات اور ماحول حیات ایک چیز نہیں نہ مطلق
اور حیات انسانی ایک چیز ہے حیات کے پورے سوال کو ایک طرف چھوڑ
صرف حیاتِ حیوانی کو لیں تو اس میں بھی ہزاروں انواع ہیں جنہیں سے
ایک کی جدا جدا تقدیر و تدبیر نوعی ہے۔ ان سب کی جدا جدا نوعی
خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سب کے لئے ایک تدبیری چارٹ
تیار کرنا اول درجے کے گدھوں کا کام ہے۔ ان کا آپس میں تعلق
سہی مگر وہ سب ایک نہیں۔ لیکن اگر ان لوگوں کی مراد یہ ہے کہ ان
لوگوں نے حیاتِ انسانی کے متعلق جو فیصلے کئے ہیں وہ خود تاریخ انسانی
کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں تو پھر یہ اول درجے کی خیانت ہے۔ تاریخ انسانی
کے نفسیاتی محرکات و نفسیاتی عوامل (اقتصادی عامل بھی نفسیاتی
محرکات میں شامل ہے انہیں کا حصہ ہے) تاریخ انسانی کے اخلاقی
محرکات و اخلاقی عوامل اور تاریخ انسانی کے روحانی محرکات و
روحانی عوامل کو یکسر نظر انداز کرنا اور ایک اقتصادی محرک (جو ہر صورت
حیات کا ایک داخلی احساس ہے وہ کوئی مادی چیز مطلق نہیں) کے متعلق
کہ جس میں وہ باقی حیوانات کے مساوی ہے کچھ مواد دستیاب کرتے ہوئے
اس سے برا یا گنڈے کے اندازے کے بعض نتائج و عواقب کی ایک
فہرست تیار کرنا اور کمالِ خیانت سے یہ حشر انگیز ہنگامہ برپا کر دینا
کہ بس انسان کی نوعی تقدیر کا چارٹ یہی نتائج و عواقب ہیں کھلی
خیانت کے علاوہ کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اگر تاریخ انسانی کو سامنے

احساس ہے۔ وہ کسی طرح اس کے مادی ماحول کا حصہ نہیں۔ ہاں
اس احساس کی تسکین کے لئے انسان مادی ماحول سے اُلجھتا ہے۔
لیکن اس سے یہ ظاہر کرنا کہ یہ خارجی ماحول کا ایک جزو ہے۔ محض باطل
ہے پھر صرف اسی باطل انسانی ترقی اور دھوکے بازمغالتے پر اس
کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا یا کمالِ جہل ہے یا کمالِ خیانت۔ عجیب
ہے کہ اس حیثیت سے ابھی اس باطل دعوے کو کسی نے بھی نہیں پرکھا
بہرحال اقتصادی سوال تاریخ انسانی میں ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ اور
اور ضمنی حیثیت ہی میں اس کا صحیح حل بھی دریافت ہوسکتا ہے۔
اس لئے کہ اُسے سب عوامل پر سبقت دینے کے معنے حیوانیت کو انسانیت
پر سبقت دینے کے سوائے اور کیا ہوسکتے ہیں؟ جس کے نتائج عرض کئے جا
چکے ہیں لیکن جب انسان اپنے اخلاقی و روحانی فرائض کو بنیادی
حیثیت دیکر اپنا نوعی منصوبہ انھیں اخلاقی و روحانی قدروں سے
تیار کرتا ہے تو اس سے جو سکون و سکینت و رفاہیت و امن و
آشتی کی فضا پیدا ہوتی ہے، اس کا سرسری سا ذکر اوپر موجود ہے۔
جس کا اِختصار یہ ہے کہ اسے کارگاہِ ہست و بود متخالف و متمنول
کا ایک غریب کارانہ میدانِ کارزار محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک
ذرے سے لیکر سورج تک اسے اپنی نیکوکاری سے تعاون کرتا
دکھائی دیتا ہے

لئے جھوٹی اور غیر مآل اندیشانہ منطقیں پیدا کیں اور پھر ایک اقتصادی عامل کے تجربے اور اس کے نتائج کو پوری تاریخ انسانی کے مساوی قرار دیا (اس میں بھی کھلی خیانت یہ کی ہے کہ اقتصادی عامل کو جو درحقیقت حیاتِ انسانی کا ایک داخلی جذبہ یا احساس ہے خارجی مادی ماحول سے خلط ملط کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ گویا انسان کا اقتصادی داعیہ اور مادی ماحول ایک ہے) اگر تعصب کی خیانت انسان کی ساری دیانت کو جلا دے تو شاید اس وقت کوئی اس الزام سے انکار کر سکے۔ ورنہ مارکس کی حیاتِ انسانی کی محض اقتصادی تشریح میں اس کے سوائے اور کوئی تاریخی دیانت نادار دہے۔ اس موقعہ پر مجھے ایک ایسے احمق و دشمنِ انسانیت طبیب کا تصور سامنے کھڑا نظر آتا ہے کہ جس نے انسانی اعضا میں سے کسی ایک عضو کی صحت و علالت کے متعلق کچھ وقت خرچ کر کے کوئی تحقیق کی ہو اور اس کا ذہن اس سلسلے میں کچھ مخصوص نتائج تک پہنچا ہو۔ اب وہ ڈاکٹر یہ کرے کہ محض اپنی دوکان چلانے کے لئے اس ایک عضو کے متعلق اپنی تحقیق کے صحت و علالت کے نتائج کو پوری حیاتِ انسانی کی صحت و علالت کے مساوی قرار دیتا ہوا اس کا پرا پا گنڈا سارے عالم میں کرنا شروع کر دے۔ انسانی گمراہی کا مواد ۹۹ فی صدی ایسے ہی خیانت کار انتہا پسندوں کی بے اعتدالیوں سے تیار ہوا ہے۔ صدر میں میں صفائی سے عرض کر آیا ہوں کہ اقتصادی عامل حیاتِ انسانی کا ایک داخلی

ہیں ختم ہوچکی ہے۔ یہ حروف یا یہ دعوت کسی بداندیشی کی بنا پر نہیں لکھے جارہے ہیں بلکہ ملت انسانی کی خیراندیشی کا ایک حتمی یقینی یہ عرض کرارہا ہے۔

مارکس و انیگلز کے عالمگیر اقتصادی انقلاب کا تخمینہ سو فیصدی جھوٹ ثابت ہوا

مارکس انیگلز نے اپنے جس عالمگیر اقتصادی انقلاب کا منصوبہ کمیونسٹ مینی فسٹو میں پیش کرتے ہوئے مدت العمر اس کے لئے ایک جھوٹی منطق کو کبھی ایک استدلال کی شکل میں اور کبھی پیغمبرانہ انداز کی پیشنگوئیوں کی شکل میں تیار کیا اور جسے لینن نے ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلی تحریرات میں "ابدی صداقت" بتایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا اور آج بھی ہے کہ جدید صنعت و حرفت یعنے مشینی صنعت و حرفت زمانہ وسطی کی فیوڈل سوسائٹی کو نیست و نابود کرتے ہوئے سارے ذرائع حیات پر قبضہ کر رہی ہے اور آیندہ کے لیے صنعت تضاد کے مارکسی اصول کی بنا پر ایک "خود شناس مزدور بے ملکیت طبقہ" بطور اپنی ضد کے پیدا کر رہی ہے۔ جوں جوں صنعتی انقلاب ہمہ گیر ہوتا جائے گا توں توں یہ نئی "خود شناس و بے ملکیت مزدوروں کی جماعت" بڑھتی جائے گی اور ساتھ ہی صنعتی پیداوار اپنی کثرت و بہتات

مارکسی امت سے پھر ایک انسانی التجا

مارکسی امت سے میری انسانی التجا ہے کہ وہ اپنے سارا
معاندانہ جذبات کو دباتے ہوئے صدر کے تجزیۂ حیاتِ انسانی کو
بغور پڑھیں اور اگر ان میں سے کم از کم بعض کو میری گذارشات بنی
بر صداقت ولیقین نظر آئے تو وہ اپنے مقام سے واپس ہٹ کر ان
سطور کو اپنی پوری پارٹی کے سامنے پیش کر دیں۔ میں اور میرے بے
بے شمار انسان اقتصادی مساوات کو انسانی اخلاقیات کی ایک
ضروری عملی شق بنوانے میں ان کا پورا ساتھ دیں گے۔ میرا خیال ہے
اس دعوت کو قبول لنے کے بعد مذہبی دنیا کے سارے صحیح البصیرۃ
انسان ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور سچ مچ وہ انقلاب رونما ہو
کہ جو اس وقت ضرورتِ انسانی محسوس ہوتا ہے۔ ورنہ مجھے تو میرا
بصیرت پکار پکار کر کہتی ہے کہ اب قدرت کا ہاتھ مارکسی امت
کو زیادہ مہلت نہ دے گا اور اس وقت جو ہلاکت کا مواد ان
نے جمع کیا ہے وہ حیاتِ انسانی غیر شعوری طور پر اس کو ختم کرنے
میں صرف کر دے گی۔ مارکس ازم بلا شک انسان کی نوعی فنا کم ہم بے
ہے جو قدرت کو کسی صورت پسند نہیں۔ مختلف طاقتوں میں ایک نیا
پیدا کرنے کے لئے انھیں قدرت نے مہلت دی تھی، جو میری بصیر

نظر رکھنا جہالت ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حالات اور شرائط کے ماتحت جس انقلاب کو ہونا چاہیئے تھا اس کی صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ ساری دنیا پہلے صنعتی انقلاب سے گذرے اور پھر سارے عالم کا مزدور طبقہ ایک جوابی ردِ عمل کے طور پر اس سب پر قبضہ کرتے ہوئے اُسے نئی تنظیم دیدے جس میں جمع وخرچ کا پورا توازن سامنے رکھ لیا جائے جس کے بعد انسانوں میں اقتصادی سرحدوں کا دور ختم ہو جائے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ جو جو ممالک صنعتی انقلاب میں سے گذرتے جائیں ان پر موقع آنے پر خود شناس مزدور قابض ہوتا جائے۔ بہرحال یہ انقلاب صنعتی انقلاب (جو سابقہ فیوڈل سوسائٹی کو ختم کرتے ہوئے عالمگیر شکل اختیار کر چکا ہو) کا نتیجہ اور مزدور طبقے کے ہاتھوں ہونے والا انقلاب تھا۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ اس وقت تک کی دنیا میں اس کا نام بھی موجود نہیں۔ یہ انقلاب اگر عملاً ممکن تھا تو اُسے امریکہ سے شروع ہو کر انگلستان سے ہوتے ہوئے جرمنی و فرانس کا رخ کرنا چاہیئے تھا اور مشرق میں اس کا مرکز صرف جاپان ہو سکتا تھا۔ مگر اس وقت تک کی حالت یہ ہے کہ یہی ممالک اس کے نام ونشان کو مٹانے کے درپے ہیں۔ گذشتہ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے انگلستان کے جنرل الیکشن میں ایک کمیونسٹ بھی کامیاب نہیں ہوا امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی کی حیثیت چور کی سی ہے۔

کے سبب اور دنیا میں مارکٹ کے محدود ہو جانے کے سبب سرا
طبقے کے کنٹرول کی حد سے نکلتی جائے گی۔ ادھر خود شناس
بے ملکیت مزدور جماعت "منظم سے منظم تر ہوتی جائے گی۔ یہاں
کثرتِ پیداوار کے چند ایک بحرانوں کے بعد یہی "خود شناس"
اپنی کثرت اور اپنی تنظیم کی قوت سے ایک انقلاب کرتا ہوا
ذرائع پیداوار اور پیداوار پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے بعد
بہشتِ شداد تیار ہو جائے گی جسے مارکس مذہبی بہشت کے بدل کے
پیش کرتا ہے۔ مارکس اور اس کی امت کے ابتدائی سب ممبرو
کے نزدیک یہ ایک "ازلی صداقت" تھی کہ جسے چیلنج کرنا سور
چاند کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ یعنے پہلے موجودہ صنعتی انقلا
کا عالمگیر ہونا اور پھر سرمایہ داری کے خلاف ایک نئی جوابی
خود شناس بے ملکیت مزدور جماعت۔ کا خود سرمایہ داری
ہاتھوں پیدا ہونا اور پھر اس کے بعد اس خود شناس طبقے کا ا
انقلاب کرتے ہوئے ساری دنیا پر قبضہ کرتے ہوئے اُسے
شداد بنا ڈالنا۔ مارکس و انیگلز کی پیغمبرانہ تصریحات میں خود شناس
بے ملکیت" کے علاوہ جو جو طبقات صنعتی سرمایہ داری کی مخالف
کر رہے ہیں وہ کسی طرح انقلاب جدید کے ہیرو نہیں ہو سکتے ا
لئے کہ وہ اصل میں انقلاب چاہتے ہی نہیں۔ وہ تو اپنی بچی کھچی
کو بچانے کے لئے یہ مخالفت کر رہے ہیں۔ لہذا انقلاب کے لئے

چین میں قحط سالی اور سابقہ گورنمنٹ کی ناکامی اور غربت نے ملکر ایک بے شعور حرکت کی۔ یہ بھی کسانوں کی حرکت تھے۔ آج اُسے مارکسی نبوت کی کامیابی کا نام دیا جا رہا ہے جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ موجودہ کمیونسٹ پارٹی درحقیقت عالم انسانی کے لئے تنظیم و تقسیم پیدا وار ضروریات کی بہم رسانی کا ایک متوازن سامان کرنا چاہتی ہے اور یہ مقصد جس ذریعہ سے بھی حاصل ہو جائے وہ اُسے استعمال کرے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کا یہی مقصد ہے تو پھر وہ مارکسی فریب بیان سے وفاداری کا ایک غلط بوجھ کیوں اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے یہ گندگی کا ڈھیر تو انھیں ساری تاریخ انسانی کے تمام قیمتی جواہرات سے محروم کر رہا ہے۔ آج تک انسانی معاشرتی و اخلاقی و روحانی تجربوں جو ذخیرۂ خیر نوع انسانی کے لئے جمع ہوا ہے نہ صرف یہ کہ مارکس انھیں اس سے محروم کر رہا ہے بلکہ اس سب سے ساری کائنات انسانی کی ضمیر کا پورا فتویٰ ان کے خلاف ہوا جا رہا ہے۔ لہٰذا عقلمندی تو یہ ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی میٹنگ کریں اور گذشتہ تیس پینتیس برس کے اقتصادی تجربے نے انھیں جن قیمتی اور عملی نتائج تک پہنچایا ہے، ان کی بالکل اصولی شکل معین کرتے ہوئے انھیں ساری انسانیت کے سامنے پیش کر دیں اور ساتھ ہی واضح لفظوں میں اعلان کر دیں کہ مارکسی

روس وغیرہ میں جو انقلاب ہوا وہ صنعت و حرفت کی کثرت پیداوار اور مارکٹ کے فقدان کا نتیجہ ہونے کے بجائے سو فیصدی اس سے مخالف حالات کی پیداوار ہے۔ وہ قحط زدگی فوجی بے اطمینانی اور کسانوں کی پریشانی کا نتیجہ تھا۔ اُسے کھسیانے پن سے مارکسی تصور کا انقلاب قرار دینا اور محض پراپاگنڈے کی مشنری سے دنیا کو ایسا باور کرانا مکاری و فریب کی بدترین مثال ہے۔ کسی بادشاہ نے اپنے چند باڈی گارڈوں کو ایک نافہ دار ہرن کی تلاش میں بھیجا۔ وہ ایسا ایک ہرن اپنے حیوان خانے میں رکھنا چاہتا تھا باڈی گارڈوں نے ذمہ تو اٹھا لیا مگر صحرا کا کونہ کونہ تلاش کرنے پر جب پوری ناکامی ہوئی تو شرم و ندامت کو چھپانے اور زندگی کو بچانے کے لئے ایک لومڑی کو پکڑ کر اُسے مختلف رنگوں سے پھول دار کرتے ہوئے مشکین ہرن کے نام سے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا اور بادشاہ سلامت نے خوش ہو کر اسے اپنے حیوان خانے میں داخل کر دیا۔ اور انھیں انعام و اکرام سے خوب نوازا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن جس دن بادشاہ کو اس مشکین ہرن کو دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اُسی دن رات کو یہ باڈی گارڈ اس لومڑی کو مختلف رنگوں سے پھول دار کرتے ہوئے صبح پیش کر دیتے رہے ہیں یہ ہے موجودہ کمیونسٹ پارٹی کے مارکسی انقلاب کی حقیقت مشرقی یورپ پر محض ایک فوجی ردِ عمل سے کمیونسٹ پارٹی نے قبضہ کیا

مارکس ازم کو نہیں چھوڑتے تو وہ قطعاً ہلاک ہوں گے۔ پوری تاریخ انسانی کے خیر کی نفی کرنے والے کی نفی ہونا ایک لازمی امر ہے۔

صرف اخلاقی و روحانی نصب العین پر عالمِ انسانی کا حقیقی اتحاد ممکن ہے اقتصادی مساوات پر اس کا کوئی امکان نہیں

اس سلسلے کی اصولی و بنیادی بات وہی ہے جو صدر میں بار بار عرض کی جا چکی ہے یعنے یہ بات کہ انسان حیوانی کائنات کے مقابل چونکہ صرف ایک مخصوص اخلاقی و روحانی شعور، احساس اور ارادے کا نام ہے لہذا اس کی انسانی تنظیم صرف وہ ہو سکتی ہے جو اس کے اسی مخصوص اخلاقی و روحانی شعور، احساس اور ارادے پر مبنی ہو۔ اس کے علاوہ جو جو تنظیمی کوششیں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں وہ انسانی قوتوں کی بربادی کے علاوہ اور کوئی پھل کسی صورت نہیں دے سکتیں۔ چہ جائیکہ وہ قافلہ انسانی کو اس کی حقیقی ترقی اور حقیقی منزلِ مقصود کی طرف بڑھا سکیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ اخلاقی و روحانی شعور، احساس

تخیل کو اُن کے اس تجربے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ موجودہ کمیونسٹ پارٹی اس سے کوئی تعلق رکھتی ہے، بلکہ وہ مذہب، اخلاق کی تمام قدروں کو تسلیم کرنے میں پوری انسانیت کے ساتھ شریک ہے، صرف ان سائنٹیفک نتائج کی روشنی میں ساری انسانیت کو دعوت دیتی ہے کہ وہ ان کے ساتھ اس اقتصادی توازن کو بحال کرنے میں پورا تعاون کریں۔ نیز سارے عالم میں چوری مار دھاڑ، ریلیں الٹنا وغیرہ وغیرہ جو اخلاق سوز حرکتیں یہ پارٹی کر رہی ہے اسے یک قلم بدلتے ہوئے محض اخلاقی ذرائع تک اپنے آپ کو محدود کرنے کا اعلان کردیں۔ یہ بھی اعلان کردیں کہ کمیونسٹ پارٹی کسی بھی ایسی عالمگیر انداز کی اور معقول مذہبی و اخلاقی و روحانی تنظیم کو لبیک کہے گی کہ جو انسان کی عالمگیر حیثیت، اور اس کے نوعی مساوات کو عملاً قائم رکھنے کے طریقوں کو چیلنج نہ کرے۔ موجودہ حالت میں تو کمیونسٹ پارٹی نے انسانیت کو دو گروہوں میں تقسیم کردیا ہے اور کمیونسٹ یعنی فسٹو اور داس کیپیٹل کے چند خیالی اور جھوٹے دعاوی کو ماننے والوں کے علاوہ باقی سب دنیا ان کے نزدیک گردن زدنی ہے اور حقیقت میں وہ خود گردن زدنی ہونے کا استحقاق اسی طرح پیدا کر رہے ہیں کہ جس طرح دنیا کے سارے فرعونوں اور شدادوں نے کبھی پیدا کیا تھا۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ اگر وہ

وقفہ ملا ہے، اُسے یہ یقین ہے کہ اس کے پاس جتنی قوتیں ہیں انھیں
صحیح ترین مواقع پر صرف کرنے سے رہی اس کا وہ سلسلہ حسن عمل بن
سکتا ہے جس پر اس کی ابدی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اب ایمانداری
سے بتایا جائے کہ ایسے گروہ کے لئے فلاحِ انسانی کا کونسا کام
کرنا ناممکن رہ جاتا ہے۔ بیشک مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس صراطِ
مستقیم پر نوعی حیثیت سے چلنے کا انسان کو ابھی نہایت ناکافی
موقعہ ملا ہے۔ ابھی فطرتِ انسانی اتنی ناتربیت یافتہ ہے کہ جماعتی
انداز پر یا نوعی انداز پر وہ اس صراطِ مستقیم پر زیادہ دیر تک گامزن
رہ سکے۔ اپنی فطرتِ سلیمہ کے صراطِ مستقیم سے یہی بدظنی اور یہی
ناتربیت یافتگی ہے جو انسانیت کے لئے ایک لغو ایک ہلاکت کی
راہیں کھول دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی گمراہی ہے کہ جس کے
باعث انسان کے مذہبی احساس کو صرف انفرادی زندگی کے
نہایت درجہ جزوی سے دائرے تک محدود کر دیا گیا ہے، جس کے
باعث اہلِ ہوا کی نگاہ میں مذہب و اخلاق و روحانیت رجعت
پسندی کے ہم معنے کر دئے گئے ہیں۔ لہٰذا فلاح و ترقی، نوعِ انسانی
کے صرف یہ معنے ہیں کہ انسان کی اس اپنی مخصوص نوعی صراطِ
مستقیم کی راہ میں جو جو رکاوٹیں حائل ہیں انھیں دور کیا جائے
اور تعمیر و تنظیم انسانی کے تمام اداروں کو صرف اسی رنگ میں
رنگا جائے اور اس کوشش میں عالم انسانی کے لئے جس تنظیم اور

اور ارادہ تمام کائناتِ انسانی کی وہ جاندار مشترک ہے کہ اُسے
ہر ہر مقام پر زیادہ سے زیادہ ترقی دیتے ہوئے پوری کائناتِ
انسانی کے باہمی نوعی رابطے کا ذریعہ نہایت آسانی سے اور
نہایت فطری انداز پر بنایا جاسکتا اور اس کی غایت تربیت و
ترقی کے ضمن میں انسان کے سارے معاشی و معاشرتی سوال بھی
قدرتی انداز پر حل ہوجاتے ہیں۔ اخلاق و روح کی تربیت و ترقی
کے لئے جو محض انفرادی یا محض النفسی انداز کی کوششیں اس وقت تک
تاریخ میں ہوئی ہیں، وہ اخلاق و روح کی نصب العینی حالت ہرگز
نہیں۔ اخلاق و روح کی نصب العینی حالت تو یہ ہے کہ اس کا مخصوص
شعور و احساس و ارادہ حیاتِ انسانی کی پوری کائنات اور تمام
مشاغلِ حیات پر محیط ہوجائے۔ لہذا اس حالت میں جہاں انسان کو
اپنی زندگی کی معاشی حدود پوری وضاحت سے محسوس معلوم ہونے
لگتی ہیں، وہاں ان کے سلسلے میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا یا
اس سلسلے میں غایت درجہ ایثار و قربانی کرنا اخلاقی و روحانی فرائض
کے اجزاء میں داخل ہوجاتا ہے۔ ذرا اس بات پر غور کرنے کی ضرورت
ہے کہ اگر ایک آدمی یا ایک گروہ کا یہ یقینِ جازم ہے کہ وہ ایک
خالق و مالک کے سامنے اپنے ہر ہر فعل کے لئے جوابدہ ہے، اُسے
یہ یقین ہے کہ یہ حیاتِ دنیا اس کا مستقل مقصود نہیں بلکہ مستقل مقصود
کے حصول کے لئے حسنِ عمل کا ایک سلسلہ مہیا کرنے کے لئے اُسے ایک

پیش کرتا ہے۔ خدا کرے گا کہ اس کی یہ کوشش سارے مشرق کے فوری احیاؤ اتحادِ جدید کی شکل اختیار کرلے گی۔

تیسری بات مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اخلاقی و روحانی شعور واحساس وارادے کی ہمہ گیری کے یقین کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی کوشش سے اقتصادی مساواتِ نوعِ انسانی کا خواب دیکھنا جنت الحمقا کے خیالی خواب سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ اگر کنیڈا اور امریکہ کے ایک باشندے کو یہ یقین نہیں کہ اس کا ہر ایثار وقربانی حقیقت میں اس کی اپنی حیاتِ ابدی کا نقد معا وضہ اپنے اندر رکھتا ہے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ محض جبر کے دباؤ کے ماتحت وہ زیادہ دیر تک صحرائے اعظم افریقہ کے جبشیوں اور صحرائے عرب کے بدوؤں کے لئے گیہوں مرغی، انڈے اور کپڑے کی پیداوار اور پارسل کرتا رہے۔ ہاں بلا شک خدا کے "اجرِ غیر ممنون" اور اخلاقی و روحانی شعور واحساس وارادے کی ہمہ گیری کے ماتحت وہ دس لاکھ برس بھی بلکہ علی الدوام اس عمل کو چلا سکتا ہے اور پوری دنیا رضا کارانہ تعاون واتحاد وایثار کی ایک دائمی کارپوریشن نہایت قدرتی انداز پر بن سکتی ہے۔

کیا کارل مارکس کو ساری دنیا کا خاتم النبیین جبراً منوانے والے کمیونسٹ کسی دوسرے کی بات بھی سننا جائز سمجھیں گے؟

جس شخصیت کا اسوۂ حسنہ سب سے زیادہ کام دے سکتا ہے وہ تنظیم اسلام اور وہ شخصیت محمد رسول اللہؐ ہیں۔ قران مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے "اے خدا پر یقین رکھنے والو سلامتی کے دائرے میں پورے کے پورے اور سب کے سب داخل ہو جاؤ" گویا عالم انسانی (کہ جس کی فطرت سلیمہ میں خدا کا اعتقاد موجود ہے) سے مطالبہ ہے کہ اپنے مخصوص نوعی شعور اخلاقی و روحانی اور اس کے احساس و ارادے کو صرف چند انفرادی اعمال تک محدود نہ کرو بلکہ اس میں پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو گھیر لو۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ محمدؐ اور آپ کے قریبی ساتھی اس مقصد میں کس درجے کامیاب ہوئے۔ ہاں انسان کی فرقہ پرست ذہنیت نے اس اسوۂ انسانی کو سمجھنے اور اجاگر کرنے کے بجائے اسے مستور کرنے اور چھپانے کی کوشش کیں۔ یورپ کی تو بارہ سو سالہ تاریخ محمدؐ و تاریخ محمدؐ پر کیچڑ ڈالنے میں گذری ہے اللہ کرے ہندوستان کا آریہ سماجی اس کی نقل کو شعار نہ بنالے بلکہ بت پرستی اور ذات پات کو ختم کرنے کے سلسلے میں اس نے جس حد تک قدم بڑھایا ہے اس سے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے قرآن کے اس عالمگیر دائرے تک آئے کہ جسے وہ "یہ ساری انسانی بستی ایک امت ہے اور میں تمہارا (ایک) خدا ہوں، لہذا صرف مجھی کو پوجو" کہکر اسے انسانیت کے لئے نصب العین کی حیثیت سے

انھیں مشترکہ اصولوں کو کامل اہمیت دیتے ہوئے ساری انسانی
بستی کے لئے انھیں کی قوت سے ایک سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظم
ونسق پیدا کیا جائے؟ یہ سوال آج سے دو ہزار برس پہلے کی اس
تاریخی فضا میں آپ سے نہیں پوچھا جا رہا ہے کہ جب ایک ملک دوسرے
ملک سے اور ایک قوم دوسری قوم سے اس طرح بیگانہ اور ناواقف
تھی کہ اس کی دنیا صرف اس کی اپنی چاردیواری ہوتی تھی کہ جس کے
باعث جہاں وہ اخلاقی و روحانی و معاشرتی اصولوں کو کچھ نہ کچھ
اہمیت دیتی تھی وہاں اس کا اپنا مادی ماحول اور نسلی امتیاز بھی
اس کے روحانی و اخلاقی و معاشرتی اصولوں کا ایک لاینفک جزو
ہو جاتا تھا اور اس طرح غیر شعوری طور پر ایک خاص وقت کے بعد یہی
ماحولی اور نسلی امتیازات اصل اخلاق و روحانیت کی جگہ لے لیتے تھے
بلکہ یہ سوال آج سنہ ۱۹۵۱ء کے متعلق آپ سے کیا جا رہا ہے کہ جب پوری
انسانیت کم از کم سیاسی و اقتصادی اعتبار سے اپنی پرانی نسلی و وطنی
حدود کو توڑ کر ایک ہونے کے منصوبے عملاً سوچ رہی ہے۔ مگر اس میں
اتنی اخلاقی و روحانی قوت نہیں کہ وہ اپنے پرانے نسلی و وطنی
تمدنوں کی بنیادوں کو بدل کر ایک عالمگیر تمدن کی طرف قدم بڑھائے
کیا آج انسانی بقا کی اس کے سوائے کوئی صورت ممکن ہے کہ انسان
کے سارے بنیادی اور مشترکہ روحانی، اخلاقی اور معاشرتی اصولوں
پر تو پوری انسانیت کو متحد کیا جائے مگر دوسرے درجے کے تمام

باب دوم

تمام اصل مذاہب سے مذہب کی جامع تر شکل پر متحد ہو جانیکی دردمندانہ اپیل

فصل اوّل

ہندوستان کی برہمیت اور آریت سے اپیل

سبق پڑھ تو اخوت کا عدالت کا شجاعت کا پھر لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(۱) عزیز بھائیو! کیا تمھیں یہ احساس ہے کہ ساری زمین پر پھیلی ہوئی انسانی بستی دراصل ایک ہی خاندان ہے اور اس کی فلاح صرف اس میں ہے کہ اس کے اندر نسل و وطن کے جس قدر تفرقے پیدا ہو چکے ہیں یا اب کئے جا رہے ہیں انھیں کا ملاً ختم کرتے ہوئے اُسے ان اخلاقی و روحانی و معاشرتی اصولوں پر متحد کیا جائے کہ جو تمام انسانیت کی وجہ جامع اور جزو مشترک بن سکیں اور

لاکھوں خداؤں اور لاکھوں فرقوں کی انارکی کے طوفان میں آگیا۔ دو ہزار برس بعد آج پھر اُسے آزادی کا دم لینا نصیب ہوا ہے۔ غیر ملکی سیاسی قبضے کے خلاف ایک عام جذبۂ ناراضگی پیدا ہوا جس نے ملک کے اندر ایک دفاعی اور منفی سا اتحاد وقتی طور پر پیدا کیا جس کے سامنے غیر ملکی اقتدار کے قدم اکھڑ گئے لیکن جب ایک مثبت معاشرتی تعمیر کا وقت آیا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت کے تمام لیڈروں اور اداروں کی یہ کوشش ہے کہ گذشتہ آٹھ نوسو برس سے یہاں جو جو معاشرتی و تمدنی تغیرات ایسے رونما ہوئے تھے کہ جو ایک طرف اس ملک کے لئے ایک غیر فرقہ وارانہ مشرق گیر معاشرت کی بنیاد دین سکیں اور دوسری طرف ہندوستان کے دونوں بازوں کو اس طرح کھولدیں کہ انڈونیشیا سے مراکش تک اس کے پروں تلے جمع ہوجائیں اور مغربی امپیرازم کی موجودہ دو حریف طاقتوں ۔ روس و امریکہ ۔ کی عالمگیری کے خلاف ایک قدرتی حصار قائم ہوجائے انھیں نیست ونابود کیا جائے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ماضی کی اخلاقی، روحانی، معاشرتی اور بالآخر سیاسی انارکی کو پھر رائج کردیا جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اس کا انجام اس ملک کے لئے اور بالآخر سارے مشرق کے لئے سوائے ایک کامل انارکی کے کیا ہوگا؟ ہندوستان مشرقی ممالک میں تنہا وہ ملک تھا کہ اگر وہ اپنی جدید معاشرتی تنظیم میں زمانہ قبل از تاریخ کے اوہام وخرافات Myths

مسائل کو انھیں مسلّمہ اصولوں سے پھوٹنے دیا جائے؟ کیا تم یہ بات نہیں دیکھ رہے ہو کہ سارے روحانی و اخلاقی اصولوں کی کامل نفی اور مکمل لامذہبیت کے اصول پر ساری انسانی بستی کو جبراً متحد کرنے کی ایک کوشش ماسکو سے شروع ہو کر ساری دنیا کو گھیر لینے پر مصروف ہے؟ خوب غور کرو کہ اگر اخلاق و روح و مذہب کی کامل نفی کرتے ہوئے صرف ایک اقتصادی مفروضے کی بنا پر ساری انسانیت کو متحد کرنے کا ایک امکان پیدا ہو سکتا ہے تو کیا اگر ہم تم مثبت روحانی و اخلاقی ملکات اور اصولوں پر صدق دل سے ایمان لاتے ہوئے انھیں کی بنیاد پر ایک عالمگیر تنظیم کی کوشش شروع کریں تو کیا ہم کامیاب نہ ہوں گے؟ میں کہتا ہوں کہ آج روح انسانی باہمی بداعتمادی کے باعث تنگ آکر چاروں طرف نظریں اٹھا اٹھا کر کسی ایسے ہی پیغام رحمت کو دیکھ رہی ہے اور ہندوستان عالم انسانی کا تنہا وہ مفروض ملک ہے کہ جس پر کسی ایسی تحریک کا آغاز ایک ابدی قرض محسوس ہوتا ہے۔ گذشتہ تین ہزار برس سے ہندوستان کروڑوں خداؤں اور کروڑوں گوتوں اور فرقوں کے تراشنے اور پوجنے کے ہلاکت انگیز مرض میں مبتلا رہا ہے۔ گوتم رشی نے ایک ٹھوس اخلاقیت کے ذریعہ ایک ہندوستان گیر معاشرتی یکسانی پیدا کی۔ مگر ہمارے اسلاف نے اُسے قائم نہ رہنے دیا بلکہ اس کی جڑیں اکھاڑ کر اس ملک سے باہر پھینک دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار برس کے لئے پورا ملک پھر

ہندوستانی کو حرف تقدیر سمجھنا چاہیئے کہ نیشنل کلچروں اور ان سے پیدا کردہ نیشنل فسطائیتوں کو ہٹلر و مسولینی اور ٹوجو کے ساتھ تاریخ نے ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا۔ غور کرنیکی بات ہے کہ جب ایسے فولادی ڈکٹیٹر نیشنل فسطائیت کو عالمگیر نہ کر سکے۔ اُسے نہ بچا سکے تو اب کس درجہ جہل اور کتنی بدقسمتی ہوگی کہ ہم کمال نادانی سے اس کا کوئی اور نیا تجربہ کریں یہی بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی جس کے باعث میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا تمھیں احساس ہے کہ یہ ساری انسانی بستی ایک برادری ہے۔

اگر تمھیں سچ مچ تاریخ انسانی کے موجودہ موقف کا اندازہ ہے اور تم سچ مچ میری صدر کی بات کو سمجھ گئے ہو تو اب میں تم سے ایک دوسرا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ مگر سوال پوچھنے سے پہلے تمہارے سامنے ایک مختصر سا سین پیش کر دینا چاہتا۔ اس کے تمام پہلوؤں کو سمجھ لینے کے بعد تمھیں میرے سوال کا جواب دینا آسان ہو جائیگا۔

فرض کیجئے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، سر رادھا کرشنن، بابو پرشوتم داس ٹنڈن، ڈاکٹر کھیرے شری گل ورکر، مسٹر ساورکر اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی پر مشتمل ایک وفد ساری دنیا میں دھرم پرچار کے لئے نکلا ہے۔ ان کے ہمراہ کالی ماتا، درگی ماتا، لکشمی ماتا، سرسوتی، مہادیو، شولنگ وغیرہ کی سونے چاندی کی مورتیاں ہیں کہ جو اپنے تاریخی رنگ میں ایک تیوہار کے لئے سجائی گئی ہیں ان کے پیچھے پیچھے ہنومان جی مع بندروں کی ایک بڑی فوج کے تاریخی رنگ میں چل رہے ہیں۔ پیچھے چلنے والے بندر دس دس کی ایک ایک ٹولی میں بٹے ہوئے ہیں اور

کی یہ ترتیب انارکی کو زندہ کرنے کے بجائے پوری تاریخ اخلاق و مذہب کو سامنے رکھ کر صدر میں عرض کئے ہوئے منصوبے پر عمل پیرا ہوتا تو وہ قدم اول پر تو صدر میں عرض کردہ علاقے۔ انڈونیشیا سے مراکش و الجیریا۔ کو ایک یک رنگ معاشرتی و اخلاقی واحدہ بنا لیتا مگر شاید آنے والی جنگ کے بعد یہی ماڈل نوعِ انسانی کے عالمگیر وفاق کو اختیار کرنا پڑتا۔ اس وقت معاشرتی و تعمیری اعتبار سے ہندوستان میں جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک مضبوط مرکز سارے صوبہ جاتی لسانی، فرقہ وارانہ تفرقوں کو دبا کر سارے ہند کے لئے ایک یکسان تمدن و معاشرت جبر کی قوت سے تعمیر کردے تو وہ اپنی آخری وسعت پر بھی ایک تنگ نظر نیشنل معاشرت و تمدن ہوگا جس میں موجودہ عالمگیر یکسانی کا عنصر خطرناک حد تک ناپید ہوگا۔ آج تو حالت یہ ہے کہ سیاسی و اقتصادی حد تک پوری انسانیت کوئی دن میں ایک ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اب اُسے مزید مضبوط کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ چاہیے اس کے مکمل بدل کے طور پر ایک تیسری اخلاقی و روحانی تنظیم چلائی جائے اور چاہیے تمام عالم انسانی کے مسلّمہ اخلاقی و روحانی و مذہبی اصولوں کو بطور ایک جامع ترمیم کے اس کے اندر داخل کیا جائے جن کی قوت سے نسلی و وطنی و طبقاتی امتیازات کو تحلیل کرتے ہوئے انسان کی عالمگیر حیثیت کو اور اس کی نوعی بقا کی مشترکہ ضرورت کو ایک ایک انسان کے ذہن نشین کرایا جائے، یہ بات ہر

تک عالم انسانی کو میسر ہے۔ اس سب کو سامنے رکھ کر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ تم نے اس مشغلے سے انسانیت کو اپنے مقام سے گرایا اور اس ساری غلط کاری کی بنا یہ ہے کہ تمھارے ہمارے آبا کسی دورِ تاریخی میں ان وہموں میں گرفتار رہتے تھے (مصر کی تاریخ، یونان کی تاریخ، یورپ کی تاریخ، عرب اور وسطِ ایشیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ چار ہزار برس کچھ ادھر بہی بیت پرستی، گوسالہ پرستی، درخت اور مناظرِ قدرت پرستی سارے عالم پر محیط تھی) اور دنیا نے تو ان اوہام کو خیرباد کہہ دیا مگر ہمارا ملک اور برادری ہے کہ وہ اس بلا میں ابھی تک گرفتار ہے۔ ان خرافات سے تاریخ اور تمدن کو تعمیر کرنے کی کوشش میں ہے اور ان مکروہ شعائر و اوہام سے جو اعتقاد و تصادم کرنے والا ہو اسے ملک بدر کرنے کی کوشش چاروں طرف جاری ہے۔ جو یہ بات دل سے نہیں چاہتے وہ بھی عوام کے خوف سے ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں۔ آج ہندوستان میں اگر کوئی آدمی چوری کرے تو شاید پولیس اسے گرفتار کر لے۔ خون کرے تو شاید وہ پھانسی چڑھا دیا جائے اور بس۔ لیکن یہ بات عین ممکن بلکہ ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی ایک پیپل کے پیڑ کے کاٹنے پر نہ صرف یہ کہ ہلاک کر دیا جائے بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس پیڑ کے انتقام میں ایک بستی جلا کر خاک کر دی جائے۔ ایک گائے کے ذبح کرنے کے شبہے پر ایک شہر کو خون سے لالہ زار بنا دیا جائے۔ یہ آج کی تاریخ

ہر ایک ٹولی ایک ایک پالکی اٹھائے ہوئے ہے کسی پالکی میں پیپل کا کوئی پودا ہے۔ کسی میں بڑھ کا پودا ہے کسی میں جو کا پینے کے لئے گائے کا گوبر ہے اور بعض کنڈوں میں گائے کا پیشاب بھی ہے اور سب سے آگے آگے دبلی پتلی درجن بھر گائیں بھی چل رہی ہیں۔ یہ حیوانی ماتائیں ہماری ملکی مذہبیت اور نیشنل ازم کا مشترکہ نشان ہیں۔ یہ ہے وہ سین جو میں تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اس پر خوب نظر جما کر دیکھو۔ اب یہ دھرم پرچارکوں کا وفد لیک سکس سوئٹزرلینڈ، فرانس، انگلستان، ماسکو اور ساری دنیا میں دھرم پرچار کے لئے نکلا ہے۔ اس پر خوب غور کر لیجئے یہ بھی معلوم رہے کہ بیسویں صدی کا دوسرا نصف شروع ہو چکا ہے۔ اب میرے ذیل کے سوالات کا جواب دیجئے۔

(الف) کیا اس دھرم پر دنیا کو متحد کیا جا سکتا ہے؟

(ب) کیا دنیا اُسے تسلیم کریگی یا اُسے انتہائی ذلت سے رد کریگی!

(ج) آئیے ایک خواب کے ذریعہ ہم یہ فرض کریں کہ کسی کرامت کے ذریعہ ان دھرم پرچارکوں نے دنیا بھر سے یہ دھرم منوا لیا۔

(د) اب ایمانداری سے یہ بتاؤ کہ اس دھرم کو ساری دنیا سے منوانے سے تم نے انسانیت کو اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے مقام پر قائم کیا یا اس اشرف و اعلیٰ مقام سے گرا کر اُسے قبل از تاریخ کی تاریکیوں میں لے پہنچایا؟ یقین و بصیرتِ انسانی کا جو ریکارڈ اس وقت

تک کی اقوام کی ایک چھوٹی سی اقوامِ متحدہ کی تنظیم دو اصولوں
پر کر لی جائے (الف) اقوام متحدہ میں یا آیندہ جنگِ عالمگیر
میں ان سب کی دفاعی پالیسی ایک ہوگی (ب) وہ ایک خدا ا
ایک انسانی بھائی چارے اور انسان کے خلافتِ ارضی کے اصول
پر حقوق و فرائض انسانی کو پھر مقرر کرتے ہوئے انھیں اصولوں پر
عالم انسانی کی تنظیم جدید کرینگے ۔ اس کے سوائے آج انسانی آبادی
کی ناہموار لہرا اور نامتوازن سوال کا بھی اور کوئی حل نہیں جس کے
لئے اکثر مشرقی ملک مجبور ہو رہے ہیں۔ یہ ہے وہ طریقِ عمل کہ
جسے اختیار کرتے ہوئے ہندوستان تاریخی قرض اور اپنے موجودہ
فرض کو پورا کر سکتا ہے۔ اور مشرقِ جدید کی وہ خدمت کر سکتا ہے
جو آج تک باقی مشرقی ممالک نے اس کے حق میں انجام دی ہے۔
خرافاتی تنگ نظریوں اور تاریخی تعصبات کے باعث ہمارا قدامت
پسند طبقہ چاہے شہاب الدین غوری، محمد بن قاسم کی سیاسی و فاتحانہ
آمد کو اور خواجہ معین الدین اجمیری اور حضرت سید علی ہجویری معروف
داتا گنج بخش لاہوریؒ جیسے بندگانِ خدا کی ہندوستان میں روحانی آمد کو نفرت
کی نگاہ سے دیکھے مگر وسیع عالمگیر انسانی مصالح کی نظر سے دیکھتے ہوئے
یہ آمد خدا کی رحمت تھی۔ سیاسی جرنیلوں نے اس ہزاروں کنبوں میں
بٹی ہوئی سرزمین کو اگر ایک تنظیمی واحدہ بنانے کی کوشش کی تو روحانی
مبلغوں نے اُسے کروڑوں خداؤں اور کروڑوں فرقوں (گوتوں) کی

جن کا اوپر ایک واضح اشارہ کیا گیا ہے جرم قرار دیں۔ گائے پرستی، گوبر پرستی، گوتر پرستی، پیپل پرستی، گنگا پرستی، جمنا پرستی، پریت پرستی اور عریاں اور حیاسوز نسوانی و مردانہ مورتیوں کی پوجا توہین انسانی ہے۔ مذہب انسانی نہیں۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لئے ہندوستان کے قدیم مذہبی جنون (تعمیر انسانی کا بنیادی پتھر مذہبی جنون ہے بشرطیکہ اسے صحیح راہ پر ڈال دیا جائے جس کے لئے گذارش ہے) کو ایک خدا، ایک انسانی بھائی چارے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے زرین اصولوں کی طرف کا ملاً اس طرح پلٹ دیں کہ جس طرح محمد رسول اللہؐ نے اپنی بت پرست اور اوہام پرست قوم کی بدوی قوتوں کو ان اصولوں کی طرف پلٹ دیا تھا جس کا نتیجہ تاریخ عالم کو یاد ہے۔ ہندوستان کو اگر کچھ کرنا ہے، اگر اُسے پھر اوہام کی گہری نیند میں نہیں سو جانا اور ہزاروں برس کی اپنی محفوظ طاقتوں کو صحیح تقدیر انسانی کی درستی پر لگانا ہے تو امت محمدیہ نے وحدت انسانی کے لئے تبلیغ و جہاد کے مشن کو جس مقام پر لا کر چھوڑا ہے، وہاں سے لیکر اُسے آگے بڑھے۔ ہندوستان کی سرزمین سے ہزار دو ہزار ایسے مبلغ بلا تردد مل سکیں گے کہ جو اس سبق کو پڑھکر اور اس کی ایک اچھی ٹریننگ لیکر پہلے تو روس و امریکہ کی کشمکش سے بچے ہوئے علاقوں میں پیغام امن لیکر گھس جائیں اور ساتھ ہی آج وقت ہے کہ ماضی کی خلافت تحریک کی طرح کم از کم انڈونیشیا سے لیکر البحر یا و مراکش

پورے مصر کی وادی پر چھائی تھی' یہی حالت وسطِ ایشیا کی تھی اور ابھی تیرہ سو برس کچھ اوپر بالکل یہی حالت عرب کی تھی۔ یہاں تک کہ محمدؐ کے آباو اجداد عرب کے سب سے بڑے مندر (موجودہ کعبہ وبیت اللہ) کے ۳۶۰ بتوں کو پجوا کر اپنا حلوئی مانڈا وصول کرتے تھے۔ لہذا جس طرح ایک خدا اور ایک انسانی بھائی چارے اور انسان کے بمقابل باقی دھرتی کی مخلوقات کے اشرف المخلوقات ہونے کے اصول تمام انسانی بستی کے مشترکہ فطری اصول اتحاد ہیں اور کسی عرب کی کوئی کینہ واری جائداد خاص نہیں بالکل اور بعینہ لاکھوں بتوں اور لاکھوں گوتوں اور فرقوں کا ناسور بھی صرف ہندوستان کے آریاؤں کی جدی وراثت نہیں۔ اس گناہ اور تفرقے میں پوری انسانی بستی کے سب کے آباو اجداد شریک رہے ہیں۔ یہ سب انسانی بستی کی مشترک جائداد رہی ہے' لہذا اسے رد کرتے ہوئے توحید' بھائی چارے اور انسانیت کے اشرف المخلوقات ہونے کے اصولوں پر اگر ہندوستانی برہمن آج اسی طرح قبضہ کرتا ہے کہ جس طرح اس پر صرف پونے چودہ سو برس پہلے مکے کے برہمنوں نے قبضہ کیا تھا اور اپنی تازہ تازہ جاگنے والی بستی کو اس خدائی رنگ میں رنگ کر ورلڈ سٹیٹ قائم کرنے کی کشمکش اسی طرح شروع کرتا ہے کہ جس طرح صدیق وفاروق نے شروع کی تھی' تو اسے حق پہنچتا ہے۔ اور اُسے بھی اللہ تعالیٰ وہی سرخروی بخشتا ہے کہ جو سرخروی اس نے محمدؐ کے مشن کو چلانے والوں

انار کی سے نجات دلاتے ہوئے توحید خدا اور اخوتِ انسانی کے انسانی مشن سے باندھنے کی جدوجہد کی۔ اب یہ علامات سوائے ہماری بدقسمتی، سارے مشرق کی نحوست اور عالم انسانی کے ابتلا کے اور کچھ نہیں کہ ان مقبولانِ خدا کی مساعی کے نتیجے کو اپنا نیا انسانی ورثہ قرار دینے کے بجائے اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اس کے اثرات کی نفی کرتے ہوئے پھر ان چار ہزار برس پہلے کے خرافات کو بنیادِ تمدن بنایا جائے کہ جو سوائے انسانی گراوٹ اور تفرقے کے نہ کبھی پہلے کوئی پھل دے سکے اور نہ اب دینگے

(۲)

انسانی بدقسمتی کا ایک بڑا سبب

انسانی بدقسمتی کا یہ ایک بڑا ناسور ہے کہ کوئی قوم دنیا میں یہ سمجھے کہ توحید خدا اور انسانی عالمگیر بھائی چارے اور انسان کی شرافتِ ارضی کے اصول کسی خاص ملک کی ملکیت تھے۔ جیسے یہ انتہائی جھوٹ ہے کہ ہندوستان کی آریائی شاخ کے برہمنی علمبردار یہ سمجھیں کہ گائے پرستی، دریا پرستی، پربت پرستی اور شجر و حجر پرستی صرف ان کے باپ دادا کی تنہا وراثت تھی۔ ہمیں تاریخ میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ مسیح کے راہبوں کی تبلیغ عمومی سے پہلے یہی حالت یونان کی تھی، یہی حالت سارے یورپ کی تھی، یہی حالت

تھا۔ دنیا کی مرکزی حکومت جب تک اس اعتقاد اور اس عمل کے ہاتھ میں نہ آئے اس وقت تک انسانی بدقسمتی دور نہ ہوگی اور یہ جبھی ممکن ہے کہ جب ایک طرف ایک خدا اور ایک عالمگیر انسانی بھائی چارے کے اصول کی عالمگیر تبلیغ ہو جائے اور جب مرکزی حاکمہ ہیئت کو اسی اصول کے ساتھ باندھ دیا جائے۔

آج ہندوستان اسی انقلاب کا داعی بنکر بڑی خدمت انسانی کرسکتا ہے مغربی اقوام گذشتہ دوسو برس کی لادینی کے باعث اس درجہ عیاش ہو چکی ہیں کہ اب اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی اول درجے کا اخلاقی انقلاب کرسکیں گی، بے بنیاد توقع ہے۔ موجودہ مسلم ممالک اور مسلم اقوام وہ ممالک اور وہ اقوام ہیں کہ جو گذشتہ پانچ پانچ اور چھ چھ سو برس سے شخصی بادشاہت سے بری طرح بندھی رہی ہیں، لہذا آج یہ اصول ان کے ہاں صرف ایک دھیما اعتقاد بن کر رہ گئے ہیں عملی کاروبار میں جن کا کوئی دخل نہیں۔ مگر ہمارا ہندوستان صدیوں کی غلامی اور غربت سے برباد ہو رہا ہے۔ ہزاروں برس سے بت پرستی سے وابستہ رہا ہے لہذا اگر اس کی اس بت پرستی میں ردِ عمل شروع ہوا اور غریبی نے اس کی قوتوں کو آج تک جس طرح محفوظ کر رکھا ہے، اگر ان محفوظ قوتوں نے اس کا ساتھ دیدیا تو آنے والی جنگ کے بعد شاید عالمگیر ریاست کا جواب اس حد تک تو ضرور قابلِ تعبیر ہو جائیگا کہ انسان اپنی اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ملکی اور نسلی اور

کو بخشی تھی۔ آج اگر صرف ملکوں اور قوموں کی غیر متوازن آبادی اور ان کی ضروریات کی غیر تسلی بخش مہیائی کے سوال کو ہی سامنے رکھا جائے تو ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ایک عالمگیر اخلاقی و روحانی ایسا انقلاب نہ کر لیا جائے کہ جو انسانی روح کو اور اس کی قوتوں کو خدائی رضا اور آیندہ زندگی کی دائمی کامیابی کے مقصد سے باندھ دے اس وقت تک یہ عالمگیر فساد ہرگز ختم نہیں ہو سکتا۔ ذرا اس سٹالن کی زندگی کو کہ جو صرف اپنے مرے ہوئے بیٹے کی صرف قبر کو دریافت کرنے کے لئے ہزاروں پونڈ انعام دینے کا اعلان کرتا ہے اور اپنی بیٹی کی شادی کی ایک گوند تیار کرنے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے اس ابوبکرؓ کی اور عمرؓ کی زندگی سے مقابلہ کر کے دیکھیے کہ جو ایک وقت دو قسم کا کھانا یا چھانے ہوئے آٹے کی روٹی اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ ایسی روٹی سلطنت اسلام کے سارے باشندوں کو نصیب نہیں ہوتی لہذا وہ اس کا کیا حق رکھتے ہیں۔ ہاں ہاں ہندوستان کے اس بدنام مسلمان بادشاہ سے بھی سٹالن کی زندگی کا مقابلہ کر لیجئے کہ جسے اورنگزیب کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ یہ اس کی تاریخ کا مسلمہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی دو وقت کی روٹی قرآن مجید کی کتابت کر کے کھاتا تھا اور اچھے اچھے باورچی اس لئے اس کے باورچی خانے سے بھاگ جاتے تھے کہ نہ تو انھیں اپنا ہنر دکھانے کو وہاں کوئی موقع ملتا تھا اور نہ ان کے لذت پرست معدے اور زبان کے لئے وہاں کوئی لذیذ غذاؤں کا سامان

کرتا ہوں ؎

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔

سچی محبت و سچی انسانی خیر خواہی کا ایک جذبہ تھا کہ جو یہ الفاظ کہلا رہا ہے۔ میں ان ہندو مسلم کارکنوں میں سے ہرگز نہیں کہ جو رواداری کے نام سے ایک دوسرے کے متعلق چکنی چپڑی باتیں کر لیا کرتے ہیں، مجھے تو اکثر اوقات ان باتوں کے تہ میں چھپی منافقت اور بداندیشی نظر آتی ہے۔ میرے نزدیک اس کے معنے یہ نہیں کہ تمہاری خامیاں تم میں باقی رہیں اور ہماری ہم میں باقی رہیں۔ یہ چھپی منافقت اتحادِ انسانی کا راستہ صاف کرنے کے بجائے اُسے تاریک کرتی ہے۔ حالانکہ انسان کی سچی بہبودی کی راہ صرف یہ ہے کہ تمام جعلی غیر فطری حدود یا بندیوں اور اوہام کو کلاً ختم کرتے ہوئے سچے اخلاقی و روحانی و معاشرتی اصولوں کو اپناتے ہوئے ہم تم دونوں صرف ہم ہو جائیں۔ ایک ہو جائیں اور اسی اصول پر ساری انسانی بستی ایک خاندان بن جائے جس کی فلاح کا ایک نظم و نسق اور ایک تعمیری انداز ہو۔ میں کہتا ہوں اگر ایسی زبانی زبانی رواداری اور ملی بھگت، گوتم رشی، حضرت مسیح اور محمدؐ اپنے اپنے ہم قوموں اور عام انسانیت سے کرتے تو کیا آج اصولی اتحاد عالم انسانی کا اتنا مواد بھی ہمارے ہاتھ آسکتا تھا کہ جو موجودہ وقت میں دستیاب

قومی حدود کو پھاند سکے۔ اس وقت تو نام جمہوریت کا دیا جا رہا ہے مگر حقیقت میں مختلف ملک اور مختلف قومیں اپنے اپنے ملکی، قومی اور پارٹی مفاد کے لئے ایک دوسرے کے خلاف ایک مکروہ مکاری کی جنگ کھیل رہی ہیں۔

کیا ہمارے راجندر بابو، ٹنڈن بابو، شری گل ورکر، شری ساورکر، ڈاکٹر کھرے اپنے ایک حساس بھائی کی اس گذارش پر دھیان دیں گے یا اپنی اپنی مہادیو سازی، مہادیو پرستی، گائے پرستی و پیپل پرستی، گنگا پرستی و جمنا پرستی کے دبے ہوئے ناسوروں کو جاری کرتے ہوئے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لئے ضائع کرینگے۔ افراد کی طرح اقوام کو بھی تاریخ میں اپنے اپنے جوہر دکھانے کا ضرور موقع دیتا ہے، اگر انھوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور اپنی صلاحیتوں کو صحیح مقصد کے ماتحت اور درست راستے پر استعمال کیا تو اللہ کے نزدیک مقبول بنکر وہ تاریخ پر ایک پائیدار اثر چھوڑ جاتی ہیں، جسے دیکھ دیکھ کر انسانی بستی اپنی آیندہ راہ درست کرتی ہے، لیکن اگر انھوں نے حسد و بغض و تنگ نظری و تعصب کی راہ لی تو بہت جلد اُن سے یہ موقعہ چھین لیا جاتا ہے یہ تاریخ کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ آج ہندوستان کے لئے یہی امتحان کا موقعہ سر پر آ پہنچا ہے۔

بیس برس سے میرے دل میں ایک مواد پک رہا تھا جسے آج اپنی برادری کے سامنے کھُل کر پیش کر دیتا ہوں اور ساتھ ہی گذارش

چشم و چراغ تھے۔ مولائے کریم ہندوستان کے تعصبات، خرافات اوہام کا خاتمہ کرتے ہوئے اس قوم کو قرآن کا حامل بنائے اور اسے خلافتِ ارضی کے اصول پر تنظیم انسانی کی راہ میں استعمال کرے۔ اس ملک کی جتنی تیاگی قوتیں ہیں وہ اوہام و وساوس میں خرچ ہونے کے بجائے سارے عالم انسانی کی نئی بیداری میں خرچ ہوں ان کا ایک ایک آشرم توحیدِ خدا اور اخوتِ انسانی کی ٹریننگ ہاوس بن جائے۔

(۳)

ہماری ملکی معاشرت کے دو خطرناک عناصر وجودیت Pantheism اور تناسخ

ہندوستان میں بت پرستی کے خلاف بھگت کبیر اور گرونانک کے زمانے سے لیکر آج تک کچھ نہ کچھ خالص ملکی زبان میں بھی خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جنھوں نے پورے ملک میں ایک انقلاب پیدا کرنے سے بہت پہلے چھوٹے چھوٹے فرقوں کی شکل اختیار کرکے عملاً فرقہ واریت کو ختم کرنے کے بجائے مزید فرقے پیدا کر دے ہیں۔ لیکن بہرحال بت پرستی اور کنبہ پرستی کے خلاف انھوں نے کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہے، مگر صدر کے دو مسئلوں۔ یعنے وجودیت اور تناسخ۔

ہو سکتا ہے۔ اور جس پر آسانی سے وحدتِ انسانی کو ایک عملی حقیقت
کی حیثیت سے تعمیر کیا جا سکتا ہے؛ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا
بلکہ اپنی اپنی قوموں اور پھر عام انسانیت کی ایک ایک خامی کو جڑ
ن کر سامنے کیا ' ان کی قبیلہ وارانہ اور نسلی تشخیصوں کو پاؤں تلے
روندا اور ایک عالمگیر انسانی بھائی چارے کی راہ صاف کی۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اس مہم کا سب سے آخری اور سب سے واضح او
ملی باب ہیں۔ انھوں نے اپنی اصلاحی مہم کو قدمِ اول پر ہی سارے
عالم انسانی کے سامنے پیش کیا۔ پرشین ایمپائر' رومن ایمپائر اور او
ی قوموں اور رئیسوں کو دعوت دی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عرب جن
یادہ وحشی کنبہ پرست اور بت پرست شاید ہی کوئی قوم ہوتی' اخ
نسانی کے ایسے رہبر و قرار پائے کہ تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے
سے قاصر ہے۔ کیا آج اس پیغام کو پھر ایک دوسری بت پرست ا
نبہ پرست قوم لیکر اٹھیگی اور موجودہ بحران زدہ اور اپنے لیڈرو
کے تفرقے اور خود غرضی کے بدولت بے لیس ہونے والی انسانیت
کی رہنمائی کرے گی؟ رحمٰن و رحیم اللہ سے میری دعا ہے کہ وہ توحید
را اور اخوتِ انسانی کی نئی جنم بھومی ہندوستان کو اور ہندوستان
برہمن کو بنائے۔ تاریخِ انسانی کی بت پرستی کے خلاف پہلے جہاد کر
نے والے حضرتِ ابراہیم اور اس جہاد کو آخری طور پر قومیت کے دائرے
نکال کر پوری تاریخ کو چیلنج کرنے والے محمدؐ بھی تو برہمن گھرانوں کے

(۴)
وجودیت (Pantheism)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز عینِ خدا ہے یا خدا کا ایک حصہ ہے یا ہر چیز میں خدا حلول کئے ہوئے ہے۔ اس کا صاف منطقیانہ تجزیہ کیا جائے اور اس پر سے اسرار و رموز کے پردے اُٹھا دئے جائیں تو اس کا قابلِ فہم خلاصہ صرف یہی ہے لیکن خالص اخلاقی و روحانی اعتبار سے دیکھا جائے تو اُسے تسلیم کرنے کے بعد نیکی و بدی، عذاب و ثواب اور خالق و مخلوق کا سوال کا ملاً بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے اور جذباتی طور پر انسان کی روحانی تسکین کا ذریعہ مظاہر پرستی یا اشراقی اور فلسفیانہ انداز پر سلسلۂ حرکت و عمل کو ایک تکلیف دہ لغویت قرار دیتے ہوئے سرے سے اپنی پوری ہستی کو بے شعور و بے ہوش کرتے ہوئے اپنے آپ کو کل میں ضم کر دینے پر منتج ہوتی ہے جو زوالِ نوعِ انسانی کا دیباچہ ہے۔ حالانکہ انسان نے تاریخ کائنات میں جس قوت سے عروج و ارتقا کیا ہے وہ صرف اس کی خاص اپنی قوتِ تمیز پر مبنی ہے۔ اس میں اس وقت تک جو خرابی ہے وہ یہ ہے کہ اس قوتِ تمیز کو عارضی سود و زیاں اور محض وقتی اور جذباتی نفع و نقصان میں انسان منحصر کر دیتا ہے جس کے باعث اس میں کمالِ خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے مجلسی و عمرانی فساد کی جڑ ہے

کے خلاف بہت کم کہا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ملکر پورے تمدنِ انسانی کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں در اصل مذہب کے دائرے کی چیزیں نہیں۔ مذہب تو ایک خالق و مالکِ با اختیار کے اعتقاد سے تعمیرِ انسانی کا آغاز کرتا ہے جس کے سامنے انسان اپنی بے لبیوں کو پیش کرتا ہوا اپنی بیماریوں، اپنی بے لبسول اور اپنی حاجتوں کا مداوا چاہتا ہے۔ جس سے وہ ہر قدم پر تسلی حاصل کرتا ہے۔ وجودیت و تناسخ حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں کہ جنھیں فلسفی لوگ سلسلۂ پیدائش کی تشریح کے لئے اسی طرح پیش کرتے رہے ہیں جس طرح گذشتہ دو سو برس سے یورپ نے کائنات کی تشریح کے لئے مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ وجودیت اور تناسخ کے مسائل، یونانِ قدیم اور مصرِ قدیم کی مشرک اقوام میں مختلف فلسفیانہ نظامات میں ہمیں صاف ملتے ہیں۔ یہ خیالات اس سے بہت پہلے کے ہیں کہ جب انسانی لبستی میں ایک ایسے خالق و مالک کا تصور و اعتقاد پیدا ہوتا ہے کہ جس کے سامنے انسان اپنے تمام اعمال کے لئے جواب دہ ہوتا ہے اور جس سے وہ تمام دکھوں کا علاج ڈھونڈتا ہے اور جس کی رضا جوئی میں وہ اپنی تمام بے اطمینانیوں کی تسکین پاتا ہے جس سے دعائیں کرنے میں اس کے دل کی ساری کلیاں کھل جاتی ہیں۔ لہٰذا ایک صالح عالمگیر تمدنِ انسانی کے پیدا کرنے میں یہ دونوں مسئلے جس طرح روکاوٹ بنتے ہیں، اسے وضاحت سے دکھانیکی ضرورت ہے۔

انسان کو ختم کر دینے کے ہیں۔ وجودیت کی عمرانی قدر و قیمت صرف یہی ہے۔ یہ اعتقاد عموماً قوموں اور ملتوں پر اس وقت دھاوا بولتا ہے کہ جس وقت وہ عرصہ دراز تک عملی کشمکش کرتے کرتے تھک جاتی ہیں اور عملی قوتوں کے بجائے ان میں خیال و وہم کی قوتوں کا زور ہو جاتا ہے۔ اور انکی حالت ذیل کے شعر کے مصداق ہو جاتی ہے ؎

دل چاہتا ہے اب تو پس فرصت کے رات دن
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اصولاً یہ خیال فلسفے شعرا و موسیقی کے کوچے سے انسانیت میں داخل ہوتا ہے اور پھر بتدریج مذہب کے مقام پر قابض ہو کر ایک طرف عمل و حرکت اور دوسری طرف قوتِ تمیز کو پراگندہ کرتا ہوا انسانی معاشرے میں انارکی پیدا کر دیتا ہے۔ اب اخلاقی و روحانی سانچے میں ڈھلے ہوئے یکساں اعمال کے بجائے یام مارگی اور اباحتی انداز کی انارکی پیدا ہوتی ہے اور انسان کا خود شناس و خدا شناس شعورِ نیک و بد جو اس سے قدم قدم پر حسنِ عمل اور جہاد فی سبیل اللہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ پس افیونی کی ایک پینک ہو کر رہ جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس حالت کو روحانیت کے کمال کا درجہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ مذہب کا آغاز خدا کی ہستی اور اس کے سامنے جوابدہی کے ایک زندہ یقین اور اس کی رضا جوئی کے لئے ایک غایت درجہ سلجھے ہوئے سلسلۂ حسنِ عمل اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہوتا ہے۔

لیکن جس طرح مذہب انسان کی قوتِ تمیز کی تربیت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی مخصوص اخلاقی و روحانی قوتوں کی شکل میں اس کی قوتِ تمیز کو صرف کرتا ہوا انھیں اُجاگر کرتا ہے اور پھر انھیں حیاتِ ابدی کے نصب العین سے باندھتا ہوا انسان کی وقتی اور جذباتی ضرورتوں کی مہیا ئی اسی ٹھوس اخلاقی و روحانی بصیرت کے ماتحت کرتا ہے جس کے باعث انسانی بستی بلاشک ایک ابد لقا اور باہمی نیکی پر تعاون کرنے والی اور بدی کو مٹانے والی مخلوق کی حیثیت سے ایک دوسرے سے راضی برضا ہو جاتی ہے، جس کے باعث اس کے اندر ایک طرف ایک ذمہ دارانہ رنگ حرکتِ عمرانی باقی رہتی ہے تو دوسری طرف ہنگامی اور جذباتی نفع و نقصان کا احساس بالکل دب جاتا ہے نہیں بلکہ فساد و خود غرضی کی طرف سے اس کا منہ نوعی انداز کے ایک دور اندیش تعاون کی طرف پلٹ دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ غایت درجہ اخلاقی و روحانی تربیت کی حالت میں انسان کی اخلاقی و روحانی قوتیں کمالِ یکسانی عمل اور کمالِ یکسانی سود و زیاں کے یقین تک انسان کو پہنچا دیتی ہیں لہٰذا ان کے توسط سے جو شیرازۂ انسانی پیدا ہو سکتا ہے، اس کی رو سے تمام انسانی بستی کا اقتصادی نظم و نسق بھی بالکل ایک ہو سکتا ہے۔ گویا مذہب جو تعمیرِ انسانی کا حقیقی ادارہ ہے اس کی جان قوتِ تمیزِ نیک و بد اور شعورِ عذاب و ثواب ہے، لہٰذا اُسے ختم کرنے کے معنے خود

کی ایک بے ایمان وحاسدانہ کشمکش میں مبتلا کرنے کے بعد اُسے محض کھانے پینے کے حیوانی داعیۂ کی سطح پر لانے کے بعد اُسے تمام روحانی دور اندیشیوں سے محروم کرتا ہوا لاشعوریت محض کے سراب میں نیست ونابود کرتا ہے۔ ایک صالح عالمگیر تنظیم انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے اور حیاتِ ابدی کے قابلِ حصول نصب العین ہونے کے اعتقاد کا پوری وضاحت سے موجود ہونا بنیادی ضرورت ہے، جو صرف مذہب مہیا کرتا ہے اور جس کی سب سے واضح مثال محمدؐ کی تنظیم انسانی ہے جس کا مرکزی نقطہ ان کا اشرف المخلوقات ہونے خُدا کے سامنے اپنے تمام ڈھکے چھپے اعمال میں جواب دہ ہونے اور نوعِ انسانی کے باہمی برادرانہ رنگ میں مربوط اور نوعی انداز پر خلیفۂ خدا ہونے کا اعتقاد ہے۔

انسان کے اشرف المخلوقات یا خلیفۂ خدا ہونے کا اسلامی مفہوم

قرآن مجید میں انسان کے اس کائنات میں ظاہر ہونے کا قصہ یوں بیان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ فرشتوں کے سامنے ظاہر کرنا چاہا تو یہ اعلان کیا کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب" پیدا کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے انسان کے

جس کی سب سے واضح مثال محمدؐ اور ان کا عالمگیر معاشرہ پیش کرتے ہیں
افسوس ناک واقعہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں سے دوسری صدی کے
آغاز سے ہی یونانی فلسفے اور عملی پست ہمتی کے باعث ایک خیالی گروہ نے
اسی اعتقاد میں پناہ لینے کی کوشش شروع کردی تھی اور پانچویں صدی
میں ایک ایسا وجودی مصنف مسلمانوں میں پیدا ہوا کہ اس نے پورے عزم
کے ساتھ مذہب کو محض ظاہرداری کا لقب دیکر پوری تاریخ مذہب
کو وجودی افیون سے بدل دینے کی جان توڑ کوشش کردی۔ گو علمائے
اسلام نے اُسے یکسر دین و مذہب کا دشمنِ اعظم قرار دیا مگر پھر بھی ایک
گروہ نے نہایت منافقت کے ساتھ آج تک اس کی تصنیفات کو اور
تعلیم کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرۂ محمدی اور ملتِ انسانی
کے اس دشمنِ اعظم نے یہاں تک دعویٰ کردیا کہ تمام مذاہب کے بانیوں
نے اپنا اپنا علم اس کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ گویا وجودیت تنزل اور
خیال پرستی کا شعبہ ہے۔ بہرحال وہ اور اس کا فلسفہ مذہب کا جزو ہرگز
نہیں نہ اُسے عمرانِ انسانی کے عالمگیر منصوبے سے کوئی اخلاقی و روحانی
یا تاریخی ربط ہے۔ وہ درحقیقت انسان کی سنجیدہ اخلاقی و روحانی
جدوجہد اور مقدس جہاد فی سبیل کی راہ کو روک کر اسی طرح انسانیت
کو انفسیت (subjectivity) کی خیالی و وہمی بھول بھلیوں میں
لیکر برباد کرتا ہے جس طرح مادے کے احکم الحاکمین ہونے کا اعتقاد
انسان کو وقتی طور پر نہایت درجہ اخلاق سوز اور محض طبقاتی انداز

(۴)

وجودیت (Pantheism)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز عینِ خدا ہے یا خدا کا ایک حصہ ہے یا ہر چیز میں خدا حلول کئے ہوئے ہے۔ اس کا صاف منطقیانہ تجزیہ کیا جائے اور اس پر سے اسرار و رموز کے پردے اٹھا دئے جائیں تو اس کا قابلِ فہم خلاصہ صرف یہی ہے۔ لیکن خالص اخلاقی و روحانی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسے تسلیم کرنے کے بعد نیکی و بدی، عذاب و ثواب اور خالق و مخلوق کا سوال کا ملاً بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے اور جذباتی طور پر انسان کی روحانی تسکین کا ذریعہ مظاہر پرستی یا اشراقی اور فلسفیانہ انداز پر سلسلۂ حرکت و عمل کو ایک تکلیف دہ لغویت قرار دیتے ہوئے سرے سے اپنی پوری ہستی کو بے شعور و بے ہوش کرتے ہوئے اپنے آپ کو کل میں ضم کر دینے پر منتج ہوتی ہے جو زوالِ نوعِ انسانی کا دیباچہ ہے۔ حالانکہ انسان نے تاریخ کائنات میں جس قوت سے عروج و ارتقا کیا ہے وہ صرف اس کی خاص اپنی قوتِ تمیز پر مبنی ہے۔ اس میں اس وقت تک جو خرابی ہے وہ یہ ہے کہ اس قوتِ تمیز کو عارضی سود و زیاں اور محض وقتی اور جذباتی نفع و نقصان میں انسان منحصر کر دیتا ہے جس کے باعث اس میں کمال خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے مجلسی و عمرانی فساد کی جڑ ہے

کے خلاف بہت کم کہا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ملکر پورے تمدن انسانی کو تہ و بالا کردیتے ہیں۔ یہ دونوں در اصل مذہب کے دائرے کی چیزیں نہیں۔ مذہب تو ایک خالق و مالکِ با اختیار کے اعتقاد سے تعمیر انسانی کا آغاز کرتا ہے جس کے سامنے انسان اپنی بے لبیوں کو پیش کرتا ہوا اپنی بیماریوں، اپنی بے لبسول اور اپنی حاجتوں کا مداوا چاہتا ہے۔ جس سے وہ ہر قدم پر تسلی حاصل کرتا ہے۔ وجودیت و تناسخ حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں کہ جنھیں فلسفی لوگ سلسلۂ پیدائش کی تشریح کے لئے اسی طرح پیش کرتے رہے ہیں جس طرح گذشتہ دوسو برس سے یورپ نے کائنات کی تشریح کے لئے مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ وجودیت اور تناسخ کے مسائل، یونان قدیم اور مصر قدیم کی مشرک اقوام میں مختلف فلسفیانہ نظامات میں ہمیں صاف ملتے ہیں۔ یہ خیالات اس سے بہت پہلے کے ہیں کہ جب انسانی لبستی میں ایک ایسے خالق و مالک کا تصور و اعتقاد پیدا ہوا ہے کہ جس کے سامنے انسان اپنے تمام اعمال کے لئے جواب دہ ہوتا ہے اور جس سے وہ تمام دکھوں کا علاج ڈھونڈتا ہے اور جس کی رضاجوئی میں وہ اپنی تمام بے اطمینانیوں کی تسکین پاتا ہے جس سے دعائیں کرنے میں اس کے دل کی ساری کلیاں کھل جاتی ہیں۔ لہذا ایک صالح عالمگیر تمدنِ انسانی کے پیدا کرنے میں یہ دونوں مسئلے جس طرح روکاوٹ بنتے ہیں، اُسے وضاحت سے دکھانیکی ضرورت ہے،

انسان کو ختم کر دیتے ہیں۔ وجودیت کی عمرانی قدر و قیمت صرف یہی ہے۔ یہ اعتقاد عموماً قوموں اور ملتوں پر اس وقت دھاوا بولتا ہے کہ جس وقت وہ عرصہ دراز تک عملی کشمکش کرتے کرتے تھک جاتی ہیں اور عملی قوتوں کے بجائے ان میں خیال و وہم کی قوتوں کا زور ہو جاتا ہے۔ اور انکی حالت ذیل کے شعر کے مصداق ہو جاتی ہے ؎

دل چاہتا ہے اب تو بس فرصت کے رات دن
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اصولاً یہ خیال فلسفے، شعرا ور موسیقی کے کوچے سے انسانیت میں داخل ہوتا ہے اور پھر بتدریج مذہب کے مقام پر قابض ہو کر ایک طرف عمل و حرکت اور دوسری طرف قوتِ تمیز کو پراگندہ کرتا ہوا انسانی معاشرے میں انارکی پیدا کر دیتا ہے۔ اب اخلاقی و روحانی سانچے میں ڈھلے ہوئے یکساں اعمال کے بجائے بام مارگی اور اباحتی انداز کی انارکی پیدا ہوتی ہے اور انسان کا خود شناس و خدا شناس شعورِ نیک و بد جو اس سے قدم قدم پر حسنِ عمل اور جہاد فی سبیل اللہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ بس افیونی کی ایک پینک ہو کر رہ جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس حالت کو روحانیت کے کمال کا درجہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ مذہب کا آغاز خدا کی ہستی اور اس کے سامنے جوابدہی کے ایک زندہ یقین اور اس کی رضاجوئی کے لئے ایک غایت درجہ سلجھے ہوئے سلسلۂ حسنِ عمل اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہوتا ہے۔

لیکن جس طرح مذہب انسان کی قوتِ تمیز کی تربیت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی مخصوص اخلاقی و روحانی قوتوں کی شکل میں اس کی قوتِ تمیز کو صرف کرتا ہوا انھیں اُجاگر کرتا ہے اور پھر انھیں حیاتِ ابدی کے نصب العین سے باندھتا ہوا انسان کی وقتی اور جذباتی ضرورتوں کی مہیا ئی اسی ٹھوس اخلاقی و روحانی بصیرت کے ماتحت کرتا ہے جس کے باعث انسانی بستی بلاشک ایک ایار لقا اور باہمی نیکی پر تعاون کرنے والی اور بدی کو مٹانے والی مخلوق کی حیثیت سے ایک دوسرے سے راضی برضا ہو جاتی ہے، جس کے باعث اس کے اندر ایک طرف ایک ذمہ دار یک رنگ حرکتِ عمرانی باقی رہتی ہے تو دوسری طرف ہنگامی اور جذباتی نفع و نقصان کا احساس بالکل دب جاتا ہے نہیں بلکہ فساد و خود غرضی کی طرف سے اس کا منہ نوعی انداز کے ایک دور اندیش تعاون کی طرف پلٹ دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ غایت درجہ اخلاقی و روحانی تربیت کی حالت میں انسان کی اخلاقی و روحانی قوتیں کمالِ یکسانیٔ عمل اور کمالِ یکسانیٔ سود و زیاں کے یقین تک انسان کو پہنچا دیتی ہیں لہٰذا ان کے توسط سے جو شیرازۂ انسانی پیدا ہو سکتا ہے، اس کی رو سے تمام انسانی بستی کا اقتصادی نظم و نسق بھی بالکل ایک ہو سکتا ہے۔ گویا مذہب جو تعمیرِ انسانی کا حقیقی ادارہ ہے اس کی جان قوتِ تمیز نیک و بد اور شعورِ عذاب و ثواب ہے، لہٰذا اُسے ختم کرنے کے معنے خود

کی ایک بے ایمان و حاسدانہ کشمکش میں مبتلا کرنے کے بعد اُسے محض کھانے پینے کے حیوانی داعیۂ کی سطح پر لانے کے بعد اُسے تمام روحانی دور اندیشیوں سے محروم کرتا ہوا لاشعوریتِ محض کے سراب میں نیست و نابود کرتا ہے۔ ایک صالح عالمگیر تنظیمِ انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے اور حیاتِ ابدی کے قابلِ حصول نصب العین ہونے کے اعتقاد کا پوری وضاحت سے موجود ہونا بنیادی ضرورت ہے جو صرف مذہب مہیا کرتا ہے اور جس کی سب سے واضح مثال محمدؐ کی تنظیم انسانی ہے جس کا مرکزی نقطہ ان کا اشرف المخلوقات ہونے خُدا کے سامنے اپنے تمام ڈھکے چھپے اعمال میں جواب دہ ہونے اور نوعِ انسانی کے باہمی برادرانہ رنگ میں مربوط اور نوعی انداز پر خلیفۂ خدا ہونے کا اعتقاد ہے۔

انسان کے اشرف المخلوقات یا خلیفۂ خدا ہونے کا اِسلامی مفہوم

قرآن مجید میں انسان کے اس کائنات میں ظاہر ہونے کا قصہ یوں بیان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ فرشتوں کے سامنے ظاہر کرنا چاہا تو یہ اعلان کیا کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب" پیدا کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے انسان کے

جس کی سب سے واضح مثال محمدؐ اور ان کا عالمگیر معاشرہ پیش کرتے ہیں
افسوس ناک واقعہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں سے دوسری صدی کے
آغاز سے ہی یونانی فلسفے اور عملی پست ہمتی کے باعث ایک خیالی گروہ نے
ہی اعتقاد میں پناہ لینے کی کوشش شروع کردی تھی اور پانچویں صدی
میں ایک ایسا وجودی مصنف مسلمانوں میں پیدا ہوا کہ اس نے پورے عزم
کے ساتھ مذہب کو محض ظاہرداری کا لقب دیکر پوری تاریخ مذہب
کو وجودی افیون سے بدل دینے کی جان توڑ کوشش کردی۔ گو علمائے
اسلام نے اُسے یکسر دین و مذہب کا دشمنِ اعظم قرار دیا مگر پھر بھی ایک
گروہ نے نہایت منافقت کے ساتھ آج تک اس کی تصنیفات کو اور
تعلیم کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرہ محمدی اور ملت انسانی
کے اس دشمنِ اعظم نے یہاں تک دعویٰ کردیا کہ تمام مذاہب کے بانیوں
نے اپنا اپنا علم اس کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ گویا وجودیت تنزل اور
خیال پرستی کا شعبہ ہے۔ بہرحال وہ اور اس کا فلسفہ مذہب کا جزو ہرگز
نہیں نہ اُسے عمرانِ انسانی کے عالمگیر منصوبے سے کوئی اخلاقی و روحانی
یا تاریخی ربط ہے۔ وہ درحقیقت انسان کی سنجیدہ اخلاقی و روحانی
جدوجہد اور مقدس جہاد فی سبیل کی راہ کو روک کر اسی طرح انسانیت
کو انفسیت (Subjectivity) کی خیالی و وہمی بھول بھلیوں میں
لیکر برباد کرتا ہے جس طرح مادے کے احکم الحاکمین ہونے کا اعتقاد
انسان کو وقتی طور پر نہایت درجہ اخلاق سوز اور محض طبقاتی انداز

لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ جب تک ان دونوں نقطوں کو انسانی بستی ملحوظ نہ رکھے وہ کسی صورت اور کسی رنگ میں ایک پائیدار عالمگیر انسانی معاشرہ بنا نہیں سکتی۔ کیوں؟ ذرا جواب سنئے۔

اس لئے کہ اگر انسان کو یہ یقین دلایا جائے کہ اس کے لئے موجودہ ایثار کے بدلے کوئی پائیدار بار لا موجود نہیں اور یہی دنیا کی زندگی اس کا سارا جمع کھاتہ ہے تو پھر اس سے اخلاقی عزیمتوں اور روحانی جانبازیوں کا مطالبہ کرنا اس کی فطرت کے خلاف کھلا جہاد ہے جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ اس اعتقاد کے بعد اس کے سارے ادارے اور اس کی ساری تنظیمیں صرف ہوا و ہوس کی ایک گرم بازاری اور باہمی جبر و تشدّد کے مسلسل سلسلے رہجاتے ہیں۔ اب اگر اُسے یہ کہا جائے کہ موجودہ زندگی ایک مصیبت لاطائل ہے جیسا عام ہندوستانی مذہبی تاریخ کے بہت سے بابوں کا خلاصہ ہے یا یہ کہا جائے کہ زندگی کی ساری دوڑ دھوپ صرف مایا کا جال ہے یا یہ کہا جائے کہ وہ محض ایک گناہ گارانہ تنزل ہے تو صاف ظاہر ہے کہ پھر جتنے روحانی و اخلاقی احساس رکھنے والے لوگ ہوں گے وہ سوائے عملی کاروبار سے کنارہ کشی کرنے کے اور کیا کریں گے، جس کا نتیجہ یہ ہمیشہ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ عملی کاروبار کی ساری باگ ڈور صرف ہوس کار لوگوں کے ہاتھوں میں رہجائے گی۔ یہ صورتِ حال بھی فسادِ دائمی ہے۔ اسکے مقابل

متعلق اپنے ناقص علم کی بدولت یہ الزام لگایا کہ "بار خدایا کیا تو ایسے شخص کے پیدا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے کہ جو زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا" اس پر اللہ تعالیٰ نے تمام ماحول کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرشتوں سے پوچھا کہ بھلا ان ان (چیزوں) کے نام (اورگُن) تو بتاؤ" فرشتے اس سوال کا جواب دینے سے لاجواب رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے یہی سوال پوچھا تو اس نے اس کا فر فر جواب دیا جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے کہا کہ کیا میں نے تمہیں نہ بتایا تھا کہ میرا علم (یعنے میری مصلحتیں) تم سے کہیں وسیع ہے۔ یہ تخلیق انسانی کا ابتدائی تصور ہے جو اخلاقی رنگ میں قرآنِ کریم انسان کے دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد پورے قرآن میں ایک طرف خدا پر اور حیاتِ اخروی پر اور اخلاقی فرائض و واجبات پر ایک عالمگیر مجاہدانہ اعتقاد اور قدم قدم پر حیاتِ دنیا کو آنی و فانی اور حیاتِ اخروی کو باقی و دائم بتانے کے ساتھ ساتھ ساری کائنات کے متعلق ہر ہر لمحہ یہ یقین دیا جاتا ہے کہ اس کا ذرہ ذرہ تمہارے بس کے اندر پیدا کیا گیا ہے سورج سے لیکر ذرّے تک اور زمین سے لیکر آسمان تک ایک ایک چیز کا اشارہ ہوتا ہے اور بتایا یہ جاتا ہے کہ اس سارے سلسلے کو تمہارا مسخر کر دیا گیا ہے۔ جسے تم استعمال کر سکتے ہو۔ اب ایک دور اندیش اور انسانی بصیرت رکھنے والا انسان یہ کہنے کے

و مانع صلاحیتوں کا کوئی پائیدار شیرازہ ناممکن ہے۔

تناسخ

ہماری معاشرتِ قدیم کا دوسرا فلسفیانہ مسئلہ کہ جس نے بقا و امید کی رگوں کا ہمیشہ سے خون چوس لیا ہے وہ فلسفہ تناسخ ہے۔ یہ مسئلہ بھی ہمیں قدیم یونانی اور مصری تمدن میں ملتا ہے یہ درحقیقت فلسفۂ جبریت کا ایک حصّہ ہے جسے مذہب کے اندر کھینچ لیا گیا ہے۔ مذہب جو درحقیقت انسانی قوائے حیات کی اخلاقی و روحانی تنظیم کا حقیقی ادارہ ہے اُسے ایک خاص ایماندارانہ جد و جہد کے دور کے بعد بالآخر فلسفیانہ اباحتوں کا ڈھنگل بنا دیا جاتا ہے اور پھر اس کی ابدی مگر نہایت درجہ واضح عملی حقائق کو اسی بھنگ دھتورے کے نیچے ہمیشہ کے لئے دبا دیا جاتا ہے۔ اسی حیثیت سے جبری فلسفے کا یہ مسئلہ بھی ہندوستانی معاشرتِ قدیم میں جگہ پا گیا ہے۔ اُسے خدائے خالق، خدائے رازق، خدائے کریم کے اعتقاد کے ساتھ جمع کرنا ناممکن ہے اور ادھر یہ ایک ناقابلِ انکار حق ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے علیحدہ کر دیا جائے تو پھر اس کے سامنے رونے اور گڑگڑانے اس سے دعائیں مانگنیں اس سے اپنی خامیوں کو دور کرنے کی التجائیں کرنے، اس کے سامنے سر عجز و نیاز جھکا کر اپنے تمام چھپے روگوں اور دکھوں کا مداوا تلاش

یہ صورتِ حال کس درجہ انسانی جامع صلاحیتوں اور اس کے حیاتِ ابدی کے جذبے سے ربط رکھتی ہے کہ ایک طرف اس کو اس بات کا حق الیقین دلا دیا جائے کہ یہ زندگی اور اس کے تمام لذائذ محض آنی و فانی ہیں۔ دوسری طرف سے ایک نوعی انداز کی ایماندارانہ جد و جہد اور مقدس جہاد فی سبیل اللہ کے فرائض سے اُسے اس طرح باندھ دیا جائے کہ وہ زندگی کے ہر قطرۂ خون کو ایمانداری کے ساتھ حسنِ عمل کے سلسلے میں خرچ کرنے کے لئے مجبور ہو اور تیسری طرف اُسے یہ یقین دلا دیا جائے کہ وہ اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے اور زمین سے آسمان تک اور سورج چاند سے لیکر ایک ذرّے تک خشکیوں اور صحراؤں سے لیکر دریاؤں اور سمندروں تک ہر ہر چیز اس کے لئے مسخر ہے اور وہ انھیں اس حیاتِ آنی میں اپنی خدمت میں اور اپنی نوعی فلاح کے لئے صرف کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔ اکثر صورتوں میں اس تصرف فی الکائنات کو اس پر بطورِ فرض کے عاید کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس مخلوق کی محض آنی و فانی زندگی کا یہ حال ہے اس کی باقی و دائمی زندگی کیا ہوگی۔ جب تک انسانی جامع صلاحیتوں اور اس کی کہیں نہ ختم ہونے والی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس فریم ورک اور اس ضابطے کا پابند نہ کر لیا جائے اس وقت تک اس کے فساد کا خاتمہ نہ ہوگا بہرحال وجودیت یا مادیت کے اصول پر انسان کی عالمگیر جامع

ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ہماری زندگی کی ایک تاریک نامرادی کی رات بھی
اس وقت تک بسر نہیں ہوسکتی کہ جب ہم گڑگڑا کر اس کے سامنے واویلا
نہ کرلیں۔ یہ تو صرف جذباتی اور غیر منطقیانہ جواب تھا۔ اصل جواب
یہ ہے کہ یہ سلسلے ہمیشہ سے یوں ہی چل رہا ہے۔ اس کا نہ کوئی آغاز
ہے نہ انجام۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں خدا کی ہستی کی کونسی
گنجائش اور ضرورت رہجاتی ہے؟ اور پھر اس کائنات کا اور ہمارے
سلسلۂ زندگی کا اس سے کیا تعلق باقی رہجاتا ہے؟ اس کے علاوہ
اس اصول کو تسلیم کرنے کے بعد انسان کے اختیار و کوشش اور جدو
جہد کے کیا معنے رہجاتے ہیں؟ اب تو نعوذ باللہ ایک طرف خدائے
مجبور، دوسری طرف انسانِ مجبور اور تیسری طرف کائناتِ مجبور کی تین
متوازی لائنیں ازل سے ابد تک چلی جارہی ہیں۔

کیا اس اصول پر تاریخِ انسانی کا کوئی اخلاقی و معاشرتی و روحانی
واقتصادی و قانونی و سیاسی ادارہ ایک دن کے لئے بھی چلانا ممکن
ہے۔ پوری انسانی تاریخ کا ایک ایک قانونی، معاشرتی و معاشی و سیاسی
ادارہ اس کھلے ہوئے عملی یقین پر مبنی ہے کہ انسان مجبور نہیں بلکہ اپنے
سلسلۂ حرکت و عمل میں مختار ہے اور ہر ہر کام میں بذاتِ خود ذمہ دار
ہے وہ اپنی بگڑی کو بنا سکتا ہے اور صالح کہلا سکتا ہے۔ وہ اپنی بنی کو
بگاڑ سکتا ہے اور سوسائٹی کے سامنے مجرم اور بعض وقت گردن زدنی
اور سولی پر لٹکا دینے کے قابل قرار پاتا ہے۔ ہمارا معاشی، معاشرتی، اخلاقی

کرنے اور اپنی غیر مطمئن روح اور پریشان دل کے لئے اطمینان
مانگنے اور سچ مچ یہ سب چیزیں حاصل کرنے کی تمام واقعاتی راہیں
ہمیشہ کے لئے بند کر دی جاتی ہیں بلکہ اخلاقی و روحانی زندگی
کی تکمیل کے لئے محض ایک منطقیانہ اصول کی حیثیت سے بھی خدا کو
تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جیسا کہ ابھی عرض کیا جاتا ہے۔

تناسخ کا خلاصہ مفہوم

اس کا خلاصہ اور بے لاگ مفہوم یہ ہے کہ انسان کی موجودہ
پوری زندگی اور اس کی تمام حرکت و عمل اس سے پہلی زندگی کے
اعمال کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اچھا تو پہلی زندگی اور
اس کے اعمال کس کا نتیجہ ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے جنم اور
اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں؟ پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ کس کا نتیجہ ہیں؟
تو جواب پھر وہی ہوتا ہے۔ یہ سوال و جواب صرف دو باتوں تک انسان
کو پہنچاتے ہیں۔ (الف) ابتدا میں خدا نے زندگی کو ایک خاص
ترکیب دیکر اُسے چالو کر دیا تھا بعد کا سارا سلسلہ صرف اسی کا نتیجہ ہے
حالانکہ یہاں پر وہ سوال بالکل اسی طرح موجود ہے اور اس کا کوئی
جواب نہیں سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے
اپنے اختیارِ خاص سے چالو کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جس خدا نے اُسے
باختیارِ خاص چالو کیا تھا وہ اب کس طرح اور کس بنیاد پر اس سے لاتعلق

سے لبریز کر دیتا ہے کبھی اس کے خوف کو اُمید سے بدل دیتا ہے، کبھی اپنی یاد میں اُسے شانت کرتے ہوئے تمام "نقصانوں اور ناکامیوں کا بڑے سے بڑا نقد بدلا ہاتھوں ہاتھ دیدیتا ہے

(ج) زندگی کا اور کائنات کا ایک ایسا سلسلہ کہ جسے انسان ہر آن بدل کر اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کی ایک طے شدہ گارنٹی اپنے پاس رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے سارے مشاغل ہی "آج سے کل کو بہتر بناؤ" کے اصول پر چل رہے ہیں جہاں خامی و ناکامی کی صورت میں پھر خدا کا ہاتھ اس کی امداد کرنے کو ہر وقت موجود ہے۔

ذرا انسانی تاریخ عمران کے ساتھ اُس جبریت کو بھی مطابق کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اِس نورانی و ذمہ دارانہ اختیار و تغیر کو بھی مطابق کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور پورے عزم سے یہ فیصلہ کر لینے کی ضرورت ہے کہ انسان جیسی نخلی مخلوق کی ڈانواں ڈول نیا کو کس لنگر سے باندھنے کی ضرورت ہے۔ وہ جو ہر آن اس کا ساتھ دے یا وہ جو اتنا بھاری ہے اور حقائق حیات سے اتنا غیر منطبق ہے کہ جو خود کشتی ہی کو غرق کر دے سہ

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بلاشک تناسخ مذہب کا جزو نہیں بلکہ فلسفۂ جبر و قنوطیت

وروحانی لا اور آرڈ انسانی فطرت کے اس کھلے ہوئے یقین پر مبنی ہے۔ اس کھلے یقین کا ایک دن کے لئے انکار کر دو اور پھر نتائج دیکھو کہ انسانی نظم کہاں رہتا ہے۔

اب خونِ حیات کے اس جامد کر دینے والے فلسفۂ جبر کے مقابل ذیل کے تین نورانی اصولوں کو دیکھو کہ وہ ایک صالح اور عالمگیر تمدنِ انسانی کی کیسی پختہ بنیاد مہیا کرتے ہیں۔

(الف) ایک ذمہ دار وخودمختار انسان کہ جو اپنے تمام سلسلۂ حرکت و عمل میں اپنے ضمیر کے طعنے سوسائٹی کے مواخذے اور خدا کے عذاب و ثواب کے سامنے جواب دہ ہے۔

(ب) ایک رحیم وکریم، کرپالو اور دیالو خدا کہ جو انسان کے ہر ہر حرکت وعمل کو دیکھتا ہے، اس کے پاس اس کا پورا حساب کتاب ہے، وہ اس کے تمام اچھے برے اعمال میں ثواب و عذاب کا ایک متعین منصوبہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب انسان اپنی تمام خام تدبیروں میں ناکام ہو کر ہر چہار طرف صرف بے بسی، تباہی، تاریکی اور ابدی ہلاکت کو اپنے ارد گرد گھورتا ہوا محسوس کرتا ہے اور ایک نہایت اضطرار اور پرلے درجے کی بے بسی میں پناہ کے لئے چلاتا ہے تو خدا کا وہ دستِ رحمت کہ جو ہزار ماں سے زیادہ نرمی اور ممتا اپنے اندر رکھتا ہے، وہ غیب سے نکل کر اس کے ڈوبتے جہاز کو سہارا دیتا ہے۔ کبھی اس کے دل کو شانتی

امید تاباں پر انسانی حیات کا جہاز طوفانوں کے سامنے اپنی حرکت کو جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ نہ ہو تو عین منجدھار میں مایوس ملاح اپنی کوشش کو ختم کرتے ہوئے قافلۂ حیات کو سمندر کی تہ میں پہنچا دیں لیکن عین اس وقت جب اسی سہارے اور اسی امید پر قافلۂ حیاتِ انسانی صحراؤں اور جنگلوں دریاؤں اور سمندروں کی مشکلات پر قابو پا کر اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے جان جوکھوں میں ڈالے ہوتا ہے کہ بے عمل اور خیال پرست فلسفیوں کا ایک گروہ آگے بڑھ کر اس جبریت کا اپدیش دینا شروع کرتا ہے اور کچھ عرصے کے مسلسل اپدیش کے بعد تھکے ہوئے ملاح اور قافلہ سالار اپنی اپنی پر جوش رجزوں کو دھیما کرتے کرتے یک قلم سعی و عمل کے آزاد خیال سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور بالآخر سارے قافلے پر ایک مایوسی چھا جاتی ہے نہ معلوم ہندوستان کی سرزمین پر کتنی دفعہ اس جبریت نے اپنا سکہ جمایا اور اس ملک کی حرکتِ عمرانی کو ناممکن کر دیا۔ لہٰذا مذہبی زندگی کے سارے عملی کاروبار میں سے اس کے سارے اثر کو کاملاً ختم کر دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے مقابل ٹھیک خدائے کریم و رحیم، انسان ذمہ دار و صاحب عزم و ارادہ و اختیار اور اختیاراً قابلِ تغیر کائنات کے اعتقاد کو ہر پہلو سے زندۂ جاوید کر دینے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ خدائے قدیر کہ جو ایک طرف عادل و منصف ہے اور اس لحاظ سے انسانی حرکت و عمل پر ہر آن اس کی کڑی نگرانی ہے اور کڑی

(Pessimism) کا مسئلہ ہے، جسے تنزل کے زمانے میں بے عمل فلسفی مذہبی زبان میں بیان کرتے ہوئے ملتوں پر حاوی کر دیتے ہیں اور جب تک ملتیں ان کے اس سامری جیسے جادو کو اپنے صحیح عمل اور پختہ اخلاقی شعور و عزم سے توڑ نہیں دیتیں اس وقت تک ان کا پھر صحیح طور پر میدانِ جہاد میں اترنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس فلسفیانہ جبریت کے مقابل تمام قدیم سے قدیم مذہبی کتابوں کو دیکھا جائے تو انکی ساری بنیاد ہی نیکی وبدی کی روشنی میں تمام اعمالِ انسانی کی ذمہ داری خود انسان پر ڈالنے کا اعتقاد ہے اسے ختم کر دیا جائے تو ساری مذہبی کتابیں اور تمام مذہبی ادارے باطل و بیکار ہو جاتے ہیں مذہب کا اخلاقی پہلو تو یہ ہے مگر اس کا اعتقادی یقینی اور جذباتی پہلو ہمیشہ سے ایک ایسے خالق کا یقین رہا ہے کہ جس کے سامنے انسان اپنی ناکامیوں شکستوں مصائب اور بے اطمینانیوں کو رو رو کر پیش کرتا ہے اور اپنی ناپائیدار حیات کی کامل بے بسی کا علاج حاصل کرتا ہے۔ مذہب کے سدا بہار باغ کو پانی دینے والی یہ نہر خشک کر دی جائے تو انسان کے اعتقاد، یقین، جذبات اور اطمینان کا بار ور درخت ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائے جس کے بعد اوسط درجے کی انسانی زندگی تو ہمیشہ کیلئے مایوسیوں کا ایک تاریک غار بن جائے ہوا وہوس کے طوفان کے بعد فرد کی ناکام زندگی صرف اسی شجرۂ طیبہ سے وہ روشنی حاصل کرتی ہے کہ جو انسانی بستی کے لئے ایک مثالی زندگی کا کام دیتی ہے۔ جو انسانی معیار پر حقیقی زندگی کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ ایسی کبھی نہ ختم ہونیوالی

بچا کر کھانے پینے کا کچھ نہ کچھ سامان کر لیتا ہے۔ لہذا کہاں کا معاشرہ اور کس کی تنظیم محض حیوانی مطالبات کے دباؤ کے نیچے غایت درجہ بے ترتیبی سے محض چوروں کے سے کردار تک انسان کا پورا سلسلۂ عمل محدود ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں زندگی کے تمام آراموں کو تیاگنے اور محض جنگلوں میں ایک مجبور سی زندگی پر قانع ہونے کی جڑھوں میں اعتقاد کی یہی بے ترتیبی کارفرما رہی ہے۔ مذہب نے مجاہدانہ حسنِ عمل کی جو جو تعلیم مختلف وقتوں میں دی، اُسے ایسے ہی فلسفوں کے ماتحت ہزاروں برس سے دبا دیا گیا۔ حالانکہ فطرتِ انسانی صرف مذہبِ کامل کی نگرانی میں پھل پھول سکتی ہے۔ اس کا حال جد و جہد اور اس کا مستقبل کامیاب ابدی زندگی ہے۔

خدائے عادل کیونکر تسلیم کیا جائے

(تناسخ کی منطقیانہ بنیاد)

مذہب میں تناسخ کے فلسفیانہ اعتقاد کو کھینچنے کا سہارا خدا کی صفتِ عدل کو بنایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر خدا کو عادل مان لیا جائے تو پھر گناہوں کو معاف کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ وہ صرف ایک صفتِ عدل سے متصف نہیں بلکہ دیالو، کرپالو، عفو و غفور و غفار، سلام، مومن، وہاب وغیرہ بھی ہے

سزائیں ہیں، اس کے ساتھ وہ کریم و رحیم ہے کہ ہمیں دست مادر بنکر آڑے وقت میں ہر سہارا دینے کے لئے ہر وقت اپنی آنکھا ماما لئے ہوئے تیار رہے۔ وہ انسان کے جو اپنے تمام اچھے برُے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ ایس پر اس معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ وہ کائنات کہ جو ہر مرحلے پر انسانی تسخیر میں ہے اور جس کی قوتوں اور ذخیروں کو اپنے اپنے ضرورت کے مقام پر صرف کرنے کا انسان کو پورا اختیار ہے، انسان کے صالح اور پائیدار معاشرے کی جان ہے۔ ان تین باتوں میں سے ایک کو بھی ختم کر دینے سے انسانی معاشرہ بربادی کے منہ میں آجاتا ہے۔ ذرا خدائے قادر و عادل کے اعتقاد کو ختم کردو اور انسان کے اختیار کو باقی رکھو تو دیکھو کہ یہ ساری دنیا کس طرح درندوں کا ایک بھٹ معلوم ہونے لگیگا۔ خدائے عادل و رحیم کے خیال کو باقی رکھو مگر انسان کو مجبور مان لو تو دیکھو کہ کس طرح ساری بستی ایسی بوڑھی بیواؤں کی بستی بن جاتی ہے کہ جن کی ساری اولاد مرچکی ہے اور اب مزید اولاد کی کوئی امید نہیں لہٰذا انتظارِ مرگ میں گھر سے جاڑے کے زمانے میں ہولسے نیچ کر کہیں دھوپ تاپ رہی ہیں۔ اب خدائے رحمٰن و عادل، انسانِ مختار و ذمہ دار کے اعتقاد کو مان لو مگر پوری کائنات کے حیوانات و نباتات و جمادات پر انسان کے حقِ تصرف و تسخیر کی اخلاقی سند کو تسلیم نہ کرو اور پھر انسانی نفسیات اور اس کے عمل کا جائزہ لو۔ صاف معلوم ہوگا کہ وہ محض چوروں کی طرح ایک دوسرے سے آنکھ

شفائے کامل کا نسخہ بخش دیا تو یہ عین حق ہوگا جس کی تصدیق
ہماری زندگی کے کاروبار کا ہر ہر واقعہ کر رہا ہے۔ البتہ اس
سوال کا ایک پہلو ایسا ہے کہ جس پر یہ اصول منطبق ہوتا بظاہر
دکھائی نہیں دیتا۔ اور وہ ہے۔

انسان کا حقوق انسانی کے بارے میں ظلم

اس کا بظاہر دو ٹوک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
انسانوں کو جو حقوقِ حیات دے رکھے ہیں اگر کوئی انہیں ظلم و زیادتی
کرتا ہے تو وہ اس کی سزا ضرور پائیگا۔ اس معاملے میں خدا' خدائے
عادل ہے۔ کم از کم اسلام کی ظاہری تعلیم اس بارے میں یہ ہے کہ
اس قسم کی ظلم و زیادتی میں انسان کا معاملہ انسان سے اور اپنے معاشرہ
سے ہوگا چاہے معاشرہ اپنے خدا کے اخلاقِ رحیمانہ کا اتباع کرتے
ہوئے اپنے ظالم کو معاف کر دے اور چاہے اس سے تلافیٔ مافات
کا تقاضا کرے اور اس سے ہر پہلو سے اس نقصان کو پورا کرائے۔ لیکن
اس واضح' ظاہر کا ایک گہرا باطن بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ
اپنی صفتِ عدل کے ٹھیک مقام پر قائم رہتے ہوئے بھی جزا و سزا کے
وقت اگر مظلوم کو اس کی مظلومیت کا کئی گنا زیادہ بدلا دے دے
اور مظلوم برضا و رغبت اپنے ظالم کو معاف کر دے تو اس میں صفتِ
عدل کا تقاضا سو فیصدی اپنے مقام پر موجود ہونے کے باوجود بھی

لہذا اس کی بعض صفتوں کو بعض سے علیحدہ کرکے صرف انہیں کی روشنی میں اپنے لئے نظاماتِ زندگی تجویز کرنا ہلاکت انگیز غلطی ہے درحقیقت مذہب کے نام سے جو تفرقہ قائم ہوتا ہے، وہ اسی تفرقے کا پھل ہے۔ ذرا فرض کیجئے کہ اگر ہندوستانی آریائیت ایک ایسا نظام قائم کرے کہ جو خدا کی صفتِ عدل کے سہارے چلے اور عیسائیت ایک ایسا نظام بنائے کہ جو محض خدائے رحیم پر زور دے تو یہ دو متوازی نظام کب تک ایک دھرتی پر چل سکیں گے؟ لہذا خدا کی صفات کے بعض پہلوؤں کو لے لینا اور بعض کو نظر انداز کرنا ایک بنیادی کجی پیدا کر دیتا ہے جو آگے چل کر فساد پیدا کر دیتی ہے۔ اب میں ان دونوں پہلوؤں کا یکجا عمل عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص سالوں ناشکرا رہا اور اسی انداز پر زندگی گذارتا رہا لیکن یک قلم کسی خاص سانحے کے اثر سے اس کی سوئی ہوئی فطرتِ صالحہ بیدار ہوگئی اور اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنی گذشتہ غفلتوں کی صدقِ دل سے معافی چاہی اور خدا نے اس کی توبہ کو قبول کرتے ہوئے اُسے اپنا مقبول بندہ بنا لیا تو اس میں کسی کا کیا بگڑا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے گناہ خدا کا تو کوئی نقصان کرتے نہیں۔ وہ درحقیقت ہماری اپنی فطرت کو مسخ کرتے ہیں، لہذا اگر ہم نے اس بات کو سمجھ لیا اور اپنے حقیقی اور مامتا سے لبریز عادل طبیب و حکیم سے اپنے مرض کی دوا چاہی۔ آیندہ کے لئے بادپرہیزی سے توبہ کی اور حیاتِ انسانی کی معین کردہ حدود کے اندر رہنے کا اس سے وعدہ کیا اور اس نے ہمیں

کوئی اور نقص ہوتا ہے۔ ایک شخص خالص امیرانہ ماحول میں پیدا ہوتا اور دنیاوی آرام و آسائش کے سارے اسباب اپنے لئے چاروں طرف مہیا پاتا ہے۔ ایک ابھی پیدا بھی نہیں ہوتا کہ اس کا باپ مرجاتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کی ماں مجبوراً اُسے تاریک و تنہا کٹیا میں سُلا کر محلے میں چکی پیسنے پر مزدوری پر چلی جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو بچے کو روتے روتے نڈھال پاتی ہے۔ محض جذباتی رنگ میں یہ مناظر کسی طرح خدائے رحیم و عادل و قادرِ مطلق کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتے۔ مگر میری گذارش ہے کہ یہ محض سطحی جذبات کو ابھارنے والا سوال ہے جس میں نہ تو کوئی باخبری ہے اور نہ کوئی مغز اور سنجیدہ انسانی منطق ہے۔ کیوں اور کیسے؟ ذرا اپنے ابھرے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کیجئے اور جواب سنئے

اب ذرا اس آخری مثال کو لیجئے اور اس کی بظاہر بدقسمتی سے پہلی مثال کی ظاہری خوش قسمتی کا مقابلہ کر کے دیکھیے کہ خالص انسانی دوراندیشی اور اس کے حیاتِ ابدی کے نصب العین کو سامنے رکھتے ہوئے ان دونوں میں کون خوش قسمت ہے اور کون سچ مچ بدقسمت ہے۔ اب ذرا اتنی بات کا اضافہ کر لیجئے کہ یہ بیوہ عورت نہایت درجہ کی شاکر، صابر اور اپنے مولا سے راضی برضا طبیعت رکھنے والی ہے، لہٰذا جب وہ چکی چلا رہی تھی، تو اپنے مولا اور اپنے معبود کو یاد کرنے میں دل سے لگی ہوئی تھی اور رحمت رب

اللہ کی صفتِ رحمت اپنی بے پایاں وسعت کو پوری طرح استعمال کر دیتی ہے اور اس اعتقاد کے تسلیم کرنے سے معاشرے میں فساد آنے کے بجائے امن و عدل کے یکساں عمل کے ساتھ رحمت کی حیات پرور شعاعیں کائنات کو ایک نور زار امید و فلاح بنا ڈالتی ہیں۔ مگر یہ گنجایش تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے کہ جو موت کی گھنٹی بجنے سے پہلے خدا کی طرف سچا رجوع کر دیں۔ خدا کی سچی غلامی کا اعتقاد جازم ہونے کے بعد خدا اپنے غلاموں کو ہر قید و بند سے آزاد کراتے ہوئے صرف اپنے بندِ غلامی میں ہمیشہ کے لئے حریصانہ طور پر محفوظ رکھنے کے گر خوب جانتا ہے۔ "وَسِعَتْ رَحْمَتِيْ كُلَّ شَيْءٍ"

یہ ہے ان دونوں فلسفیانہ مسائل کی ٹھوس حقیقت اور یہ ہے ان کے مقابل خالص مذہبی موقف۔

انسان کے پیدائشی نقائص اور ماحولی مظلومیت کی توجیہ

تناسخ کو مذہب میں رائج کرنے کا منطقیانہ پہلو تو صدر میں بیان کر دیا گیا ہے مگر اس کا ایک خالص جذباتی پہلو بھی جہاں اس کے کیس کو انسانی جذبات کے سہارے مضبوط کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک بچہ قدرتاً اپاہج پیدا ہوتا ہے۔ بعض نابینا پیدا ہوتے ہیں۔ بعض میں

بیدار کرتے ہوئے معلوم کیجئے کہ ٹھوس انسانیت کے معیار پر
خوش قسمت کونسا گھرانا نکلا۔ اسی طرح ایک مادرزاد اپاہج
ایک مادرزاد اندھے وغیرہ کے کیس کو اور ان کے مقابل ایسے
ہی ان کے ایک ایک تندرست و بینا پڑوسی کو بھی رکھ کر اسی
حقیقی انسانی خوش قسمتی کے معیار سے ان کی قسمتوں کو ماپو تو صاف
معلوم ہوگا کہ ان نقصانوں اور ان فائدوں ان قابلیتوں اور
ان ناقابلیتوں کا انسان کی حقیقی خوش قسمتی کے معیار پر کوئی وزن
وقدر نہیں انسانی حقیقی سعادت و شقاوت اور سچی خوش قسمتی و
بدقسمتی کے معاملے میں اس ظاہری کامیابی و ناکامی کی کوئی حیثیت
نہیں۔ لہذا انسانی زندگی کے دور اندیش نصب العینی پہلو سے یہ
کوئی منطقیانہ اور واقعی بنیاد ہی نہیں محض جذبات کی غیر فطری
اور بعض وقت غیر اخلاقی ابھار کا رخ بدلنے کا ایک نفسیاتی بہانہ
ہے اور کچھ نہیں۔ اس کے مقابل خدائے رحیم و کریم و عادل و بااختیار
اور انسان مختار اور خدا کے سامنے قدم قدم پر جواب دہ ہونے کا
اصول ہی وہ اصول ہے کہ جس پر سنجیدہ اور جامع اخلاقی و روحانی
حرکت ممکن ہے۔ اسی پر انسانی معاشرہ اپنی ہمہ گیری کیساتھ تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

بت پرستی کے ایک نفسیاتی عذر کا تسلی بخش جواب

بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ انسان جب ایک ایسی ذات

راحت پہنچانے والے جو مکے دم بدم اس کے دل کو شانت کر رہے تھے جب اس نے اپنی مزدوری پوری کر لی تو خدا کا شکریہ اس نے اس بات پر ادا کیا کہ خدا نے اُسے سوائے کسی کی محتاجی کے اپنے ہاتھوں اپنی روزی کمانے کے قابل بنایا ہے۔ وہ اسی شکر اور غیرت کے جذبے سے لبریز جب گھر پہنچتی ہے تو بچے کا رونا اُسے بے بس نہیں کرتا، بلکہ وہ دعائیں دیتی ہوئی اُسے اپنی چھاتی سے لپٹا لیتی ہے اور بالآخر اس کے یہ اعمال اور یہ دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ لہٰذا جب یہی بچہ جوان ہوتا ہے تو وہ رحمت و شفقت و محنت و ایثار و ناداری کا ایک نمونہ ہوتا ہے۔ عمر بھر اس کی زندگی غایت محنت و غایت ایثار و ناداری سے گذرتی ہے اُسے امیر ہونے کی تمنا ہی نہیں نہ اُسے اس کا موقعہ ملتا ہے۔ اب اس کے مقابل پہلے امیر صاحب زادے کی حالت بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ وہ اپنے عام احوال میں ایسا ہی ہے کہ جیسے امیر ابن امیر عموماً ہوتے ہیں یعنی جنھیں ہوش آنے سے پہلے ہی یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ وہ چند آدمیوں پر حکومت کرنے، انھیں اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوانے اور قدم قدم پر ان کی بے آبروئی کرنے کا پیدائشی حق رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی انھیں یہ خیال بھولے سے بھی کبھی نہیں آتا کہ اپنی بقائے حیات کے لئے انھیں خود محنت کرنا چاہیئے۔ اب ذرا انسانی عینک لگا کر اور انسانی احساس و ذمہ داری کو

کو سامنے رکھ کر جذبۂ عبودیت کو ایک مرکزیت دینا یا اس کی تسکین کا سامان کرنا عموماً جائز سمجھا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں بھی تصورِ شیخ اور بعض صورتوں میں گور و پرستی تک رائج کر دی گئی ہے ہندوستان میں بعض گھٹیا سلسلے تو باقاعدہ اپنے پیروں کی تصویریں تک رکھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ ہیں کہ جو ناچ رنگ اور رقص و موسیقی سے اپنے خیال میں تسکین حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ بت پرستی کی گھٹیا صورت (چاہے وہ وجودی فلسفے اور اشراقیت کے اس اعتقاد پر مبنی ہو کہ چونکہ خالق و مخلوق عین یکدیگر ہیں لہذا اس کے کسی ایک جزوی مظہر کو پوجنے یا فرطِ محبت سے اس میں فنا ہو جانے سے اس کے کل کا وصال و اتصال نصیب ہو جاتا ہے اور چاہے وہ عوام کے اس عامیانہ اعتقاد پر مبنی ہو کہ ہر ہر غیر معمولی نفع بخش اور غیر معمولی خطرناک چیز ایک ایک مستقل دیوی دیوتا ہے کہ جو یا تو مختلف گوتوں اور فرقوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے یا تقسیم عمل کے اصول پر یہ سب انسان کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں) تو سرے سے انسان کے اشرف المخلوقات اور اس کے خدا کے جامع و مانع خلیفہ اور نائب ہونے کے اصول کو ختم کر جاتی ہے؛ رہا ترقی یافتہ مذہبی بت پرستی کا یہ منصوبہ کہ چونکہ ایک بے مثال ہستی کا تصور قائم کرنا ناممکن ہے (اس شبہے میں بہت بڑے بڑے فلسفی تک شریک ہیں) لہذا اپنی توجہ کو یکسو کرنے کے لئے کسی نہ کسی مثالی صورت کا سامنے ہونا ضروری ہو جاتا ہے سو

جامع الصفات کا تصور کرنے میں ناکام ہوتا ہے کہ جو اس سارے سلسلۂ ہست و بود کی خالق ہے جس کے سامنے ہستی کا ذرہ ذرہ اور انسانی لبتی کا فرد فرد اپنے حرکت وسکون اور قول وفعل کے لئے جواب دہ ہے جس سے وہ بقائے حیات کا سامان پا رہا ہے جس کی طرف ہر وقت رجوع رکھنا اور جس کی رضاجوئی کو حیاتِ ابدی کے کامیاب حصول کی واحد گارنٹی جاننا اس کے لئے ضروری ہو تو ایسی حالت میں وہ اپنے جذبۂ عبودیت کو تسکین دینے کے لئے بت پرست ہوجاتا ہے جس چیز کو وہ غیر معمولی طور پر نفع بخش یا غیر معمولی خطرناک سمجھتا ہے اس کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے ۔ یہ بت پرستی کی گھٹیا حالت ہے ہمارے ہندوستان میں وہ ساری دنیا کی اقوام سے زاید ہے ۔ غالبًا وجودی فلسفے کے خالق ومخلوق کے عین یکدگر ہونے کے اعتقاد نے بھی اسے خوب بڑھانے کا کام کیا ہے ۔ اس لئے کہ پڑھے لکھے لوگ تو اسی اعتقاد کے ماتحت بت گری وبت سازی کے جواز کے قائل ہو گئے ہیں ۔ لیکن ایک ایسا گروہ بھی ہے اور وہ غالبًا معقول تعداد اور ٹھوس مذہبی جذبات ورجحانات رکھتا ہے کہ جو صرف اس لئے بت پرستی کو جائز رکھتا ہے کہ ایک بے مثال خدا پر دلی توجہ کو جمانا اور جذبہ بندگی کی تسکین کا اسی طرح سامان کرنا قریبًا ناممکن ہے لہذا توجہ کو قائم کرنے کے لئے کسی نہ کسی مثالی تصور کا سامنے ہونا ضروری ہے ۔ اسی نفسیاتی عذر کی بنا پر کسی نہ کسی تمثالی صورت

توجہ کو مرکوز کرنے سے حاصل ہوا اور چاہے کسی من موہن مورتی پر
دل کو جمانے سے حاصل ہو حقیقتِ عبادت ہے۔ مگر یہ خیال عبادت
کی حقیقت سے کمالِ نادانی اور نہایت درجہ سطحی تجزیے پر مبنی ہے
بلاشک تکلیف دہ اور پریشان کن خیالات میں ایک شیرازے کا پیدا
ہو جانا انسان کے لئے ایک بڑی راحت ہے اکثر اوقات ساری
جسمانی راحتوں سے بڑی چیز ہو جاتی ہے، مگر یہ نہ تو انسانی فطرت
کے تجزیۂ صحیح اور نہ عبادت کے صحیح مفہوم تک پہنچاتی ہے۔

فطرتِ انسانی کا تجزیۂ صحیح اور اس کا عبادتِ خدا سے فطری تعلق

(ب) انسان کی فطرت کا تمام داخلی تجزیہ اور اس کے تمام
خارجی اعمال و مشاغل ہمیں صاف بتلاتے ہیں کہ یہ مخلوق نہایت
درجہ مختصر ہونے اور غایت درجہ نو عمر ہونے کے باوجود بے شمار ایسی
صلاحیتیں رکھتی ہے کہ جو باقی سلسلۂ تخلیق کی کسی نوع میں اس درجے
پر اور اس جامعیت کے ساتھ موجود نہیں۔

(ج) مزید دقتِ نظر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں
باقی سلسلۂ کائنات سے مقابلہ کرتے ہوئے متعین کیا جائے تو یہ ممتاز
انسانی صلاحیتیں، وہ صلاحیتیں ہوں گی جو اخلاقی و روحانی صلاحیتیں

اس عذرِ بت پرستی و بت سازی کے مفصل تجزیے کی ضرورت ہے جو
ذیل میں کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مذہبی حقائق کا بیان ہے لہذا
اس سلسلے میں صرف وہ باتیں بیان کروں گا کہ جو میرے مشاہدے
اور ٹھوس تجربے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی بات یہ عرض کر دوں کہ اپنی عمر
کے ۲۹ برس کے آغاز تک وجودی اشراقیت کے کوچے میں محبت
کے ایک بے پناہ دباؤ کے ماتحت گھوما ہوں لہذا خیالی سلسلے کی وہ کڑیاں
کہ جو کسی سپینوزا یا کسی شنکراچاریہ کے نظامِ فکر و استدلال میں پائی
جاتی ہیں، وہ میرے لئے بھی ویسی ہی ایک نفسیاتی سیر و مشاہدے
کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جیسی ان کے لئے تھیں۔ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ
کے فضل نے بعض اسلامی صوفیا کے ذریعہ اُس خیالی کوچے سے اس واقعاتی
کوچے میں پہنچایا کہ جسے ایک واقعہ مان کر اپنی نوعی تقدیر کو اسی واقعاتی
اعتبار سے ہیں سمجھتا ہے اور اس پر ایمانداری سے عمل پیرا ہوتا ہے۔
اب میں اس ترقی یافتہ اور سوچی بوجھی ہوئی بت پرستی کا تجزیہ اور
اس کی خامیاں عرض کرتا ہوں۔

(الف) اس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں عبادت کا صحیح
مفہوم ہی متعین نہیں کیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ
انسان کے منتشر اور باہمی متضاد راہوں پر دوڑ جانے والے خیالات
میں ایک شیرازہ پیدا کرنا ہی عبادت ہے اور خود ہی اپنی غرض بھی ہے
لہذا وہ چاہے کسی منطقیانہ اصولِ موضوعہ کو مان کر اس پر اپنی

کہلاتی ہیں، باقی باتوں میں وہ اور انواع تخلیق سے ملتا جلتا ہے۔
ظاہر میں تو ان مخصوص انسانی صلاحیتوں کو اخلاق و روح کے دو سادہ عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جاسکتا ہے، مگر معاشرے اور ماحول کے ربط میں انھیں اپنی عملی شکل میں دیکھا جائے تو یہ بیشمار قسموں میں بٹ جاتی ہیں۔ مثلاً رحم، شفقت، اخلاص، صبر و تحمل، استقلال، بہادری، جد و جہد، عزم، اخلاص، ایثار، محنت، دیانت، عدل، صداقت، وفا اور سب سے بڑھکر ایک ابدی حیات کی ابدی فارغ البال راحت کی متوور تلاش کہ جو اس سارے سلسلۂ فرائض و حقوق کو رضا کارانہ اپنے اوپر حاوی کرنے کی روح ہے۔

(د) ادھر ان تمام زرین قوتوں اور ان کے تمام فطری و عملی تقاضاؤں کے نہایت درجہ ظہور کے باوجود جب ہم انسانی معاشرے کو لگاتار فساد کے اندر الجھا ہوا پاتے ہیں تو ہماری انسانی صوابدید ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس فسادِ مسلسل کے عمیق اسباب کی تلاش کریں۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ قوتیں موجود تو ہیں مگر عملاً ابھی ان کی اتنی تربیت نہیں ہوئی کہ انسانی معاشرے کا تمام کاروبار صرف انھیں سے چلایا جاسکے۔ لہذا ان مخصوص انسانی امتیازی قوتوں کی نا تربیت یافتہ حالت میں ان کے فرائض حیات کی بجا آوری کے لئے انسانی وہ قوتیں آگے بڑھ آتی ہیں کہ جو انسان میں اور حیوانات وغیرہ انواعِ تخلیق میں مشترک ہیں اب جب ان بندروں کے ہاتھ افلاطون کی لائبریری کا کام سپرد ہوا

اپنے خزانوں کے منہ کھول دے کہ جن کی غذا ساری کائنات زیرو بالا میں ہرگز موجود نہیں ہماری ان مخصوص صلاحیتوں کی غذا اور تربیت کے خزانوں کا پتہ نہ تو "ایک کُل میں سارے شخصی امتیازوں کو ختم کرتے ہوئے اپنے آپ کو فنا کردو" کی وجودی اشراقیت میں پتہ چلتا ہے اور نہ ساری" کائنات ایک ہی غیر شعوری مادے کے کھیل کی جولانگاہ ہے" کے تاریک غار میں پتہ چلتا ہے۔ اس کا پتہ اپنی ان جامع صلاحیتوں اور ان کے ان جامع احتیاجوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرتے ہوئے جامع جمیع کمال ذاتِ برحق کے سامنے عجز و نیاز سے جھکنے اور گڑگڑانے سے ہوتا ہے۔ اپنی ان مخصوص صلاحیتوں ہی کو اپنے سارے معاشرے کے کاروبار کا سنگِ بنیاد بنانے سے ان قوتوں کی اکسرسائز اور مشق و تمرین کا سوال حل ہو جاتا ہے اور ایک ذات جامع جمیع صفات و منزہ عن نقص و زوال کے سامنے اپنا سر نیاز لگاتار جھکانے اور اس سے اپنی تقویت چاہنے سے ان کی غذا کا سوال حل ہو جاتا ہے۔ اور یہ ضرورت نہ تو کسی منطقی مفروضے اور نہ اپنے ہاتھ سے گھڑی ہوئی مورتیوں سے پوری ہوتی ہے' وہ تو ہم سے ہزار گنا ناقص و نامراد و بے بس ہیں' لہذا ان کے سامنے جھکنا اور انھیں مقدس سمجھنا خود ہماری بربادی کا موجب ہے اور کچھ نہیں جس طرح ہماری بے شمار اخلاقی و روحانی قوتیں ہیں کہ جن کی تربیت و بقا کے لئے عالم و النفس و آفاق میں کوئی سرچشمہ موجود

ہوتا ہے کہ اگر ہم انھیں قوتوں کو معاشرے کے کاروبار کا واحد ذریعہ بنانے کی کوشش کریں تو انھیں مشق و تمرین اور اکسرسائز دیکر بالبدہ کرنے کا سوال تو ایک حد تک حل ہو جائے گا۔ مگر ان کی غذائے صالح کیا ہے اور اُسے کہاں سے مہیا کیا جائے اس سوال کا جواب کائناتِ زیر و بالا کی پوری پیمائش کے باوجود انسان حل نہیں کرسکتا۔ یہی مقام ہے اور یہی سوال ہے کہ جسے ایک جامعِ جمیع صفاتِ کمال ہستی کی عبادت اور قرب اور رضاجوئی سے حل کیا جاسکتا ہے اور پورے نوع انسانی کے لئے حل کیا جاسکتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ حل شدہ صورت میں موجود ہے صرف ہمیں اسے پورے نوع پر حاوی کرنے کے لئے کچھ اپنی زندگی کی قطع و برید کرنا ہوگی اور کچھ ٹھیک اس کی جامع و مانع روح و شکل کو سمجھتے ہوئے اسے ایک عملی نظامِ روح و اخلاق و معاشرت کی حیثیت سے متعین کرنا ہوگا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بت پرستی کے سلسلے کی آخری رکاوٹ میں گرفتار افراد کی اکثریت شاید ابھی تک میرے جواب کو نہیں سمجھی ہوگی۔ لہذا مجھے ان سے کھل کر یہ عرض کرنا ہے کہ عبادت کا مفہوم صرف یہی نہیں کہ ہم اپنی منتشر خیالات اور برباد کن اور متضاد جذبات کے لئے کسی معروضے کی بنا پر ایک شیرازہ پیدا کریں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے اور صرف یہ ہے کہ ہم اپنی جامع و مانع صلاحیتوں کے لئے غذائے صالح مہیا کرنے کے لئے جامع جمیع صفات خالق برحق سے فی الواقع ایک زندہ ربط پیدا کریں جو ہماری ان مخصوص صلاحیتوں کی تکمیل کے لئے

اول درجے کے اخلاقی و روحانی و معاشرتی انقلاب کے لئے یہی
مواد اصولاً درکار ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم
کے باوجود اکثر مسلم ممالک کا رجحان ہندوستان کی طرف نہایت
امید افزا اور غایت درجہ دوستانہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہاں
کسی نہرو کی آج اس سے زیادہ آو بھگت کر سکتے ہیں کہ جتنی وہ
آپس میں ایک دوسرے کی کریں۔

روحانی ترقی و اطمینان کی سب سے واضح اور آسان راہ

میں ذیل میں اللہ تعالیٰ کے ایسے ننانوے نام دیتا ہوں کہ
جنھیں سمجھ بوجھ کر مسلسل جاپنے سے ایک طرف تمام بت پرستانہ
وہمیات کا قلع و قمع ہو جاتا ہے تو دوسری طرف طبیعت میں نہایت
درجہ اطمینان پیدا ہوتا جاتا ہے تیسری طرف اخلاق میں نہایت پختگی
آنا شروع ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ہمارے ہزار در ہزار آشرموں
میں ایک تحریک کی طرح صرف اتنی لہر پیدا ہوگئی تو موجودہ دور کی
بے چین انسانی روح کے لئے ہزاروں اطمینان کی راہ بتانے والے
مبلغ پیدا ہو جائیں گے۔ ضرورت یہ ہے کہ انھیں پوری طرح سمجھکر
مسلسل جاپ کیا جائے اور اللہ تعالےٰ سے ہر بار اور لگاتار یہ دعا

نہیں اسی طرح ہمارے معبود کی بے شمار صفاتِ کمال ہیں کہ جن کے ذریعہ ہمارے یہ قوائے حیات بالیدہ ہوتے ہیں۔ ہم اپنے مجموعی احتیاجوں اور رنجشوں کو اس کی ذاتِ جامع صفاتِ کمال کے روبرو رکھ کر جب ان احتیاجوں اور رنجشوں کا ازالہ چاہتے ہیں یا انھیں پورا کرنے کی دعا مس کرتے ہیں تو ہماری حقیقی بالیدگی اور تربیت شروع ہوتی۔ یہ ہے ہماری فطرتِ جامع کی ایک جامع صفاتِ کمال ذاتِ برحق کی معبودیت سے کلی مطابقت اور اسی کو شرک تہ وبالا کر دیتا ہے۔ اس ذاتِ جامع سے اپنے سامانِ بقا کے حصول کا عملی عقیدہ ایمان کہلاتا ہے اور انھیں جامع مخصوص انسانی صلاحیتوں کو اپنے انفرادی و اجتماعی کاروبار کا ذریعہ بنانا عمل صالح کہلاتا ہے اور انسانی لبستی کی عالمگیر صلاح اسی ایمان اور اسی فریم ورک کے عمل صالح کو غایت تربیت دیتے ہوئے ہمہ گیر کر دینا تحریک خلافت کا منتہا ہے۔

کیا گلے کے برہمنوں اور ۳۶۰ بتوں کے نام کی آمدنی کھاتے والے پجاری گھرانے کے بعد اس تحریک خلافت کو اپنی اصولی شکل میں چلانے کے لئے ہندوستان کے برہمن آگے بڑھیں گے ؟ آثار تو پچاس فیصدی محسوس ہوتے ہیں۔ صرف تعصب نے اور سو فیصدی بے جا تعصب نے ایک روک پیدا کر رکھی ہے۔ ورنہ صدیوں کی غربت کے ساتھ شدید مذہبی رجحان (جسے اپنا صحیح راستہ معین کرنے کا ہزاروں برس سے موقعہ ہی نہیں آیا) یہاں کے عوام کا سارا ذخیرۂ حیات رہا ہے۔ اور کسی

چھ لاکھ کے قریب مرید پیدا کرلئے تھے اس نے جب پیری مریدی شروع کی تو اس کے پاس رہنے تک کو کوئی اچھا خاصہ مکان تک نہ تھا مگر جب مرا تو نہ معلوم کتنا روپیہ کتنی جائداد اور کتنی سالانہ آمدنی چھوڑ کر مرا۔ میں اس کی صرف اس مسجد کا حال جانتا ہوں کہ جو اس نے اپنی رہائش گاہ کے پاس تعمیر کرائی تھی اس کا شہتیر مچھلی کی ہڈی کا تھا۔ اور نہ معلوم اس کی زیب و زینت پر کتنی لاگت آئی تھی۔ اس کے مقابل میں نے خلیفہ ابوبکرؓ خلیفہ عمرؓ ہندوستان کے بادشاہ اورنگزیب کی مالی حالت کا اوپر کہیں تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ قرآن مجید حق کے مبلغ کا ایک سلوگن جگہ جگہ یہ بیان کرتا ہے "اے قوم میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ اور بدلہ خدا کے ہاں ہے"

بہرحال اگر تمہیں دنیا میں کوئی مشن انجام دینا ہے تو مسلمانوں کو دیکھنے اور اس پر اعتراض کرنے کے بجائے اپنے مولا پر نظر رکھو اور اپنے فرض پر نظر رکھو اور جو ہو سکتا ہے کر گذرو

اللہ تعالیٰ کے عرض کردہ ننانوے نام مع معنے کے نیچے درج ہیں

اللہ (یہ صرف نام ہے اس ذات کا جو سب چیزوں کی پیدا کرنیوالی اور سارے اچھے گنوں کی جامع ہے) رحمان (بار بار کرپا کرنے والا) رحیم (لگاتار کرپا کرنے والا) ملک (سچا بادشاہ) قدوس (بہت پوتر) اسلام (شانتی دینے والا)

کی جائے کہ اپنے ناموں کی برکت سے وہ پڑھنے والے کے دل کو ہردنے کو اور آتما کو تمام غموں سے پاک کرکے شانتی سے بھرپور کردے، ان کے سارے روگوں کا خود علاج کرے اور انھیں ایمانداری اور خدا پرستی کی سچی زندگی گذارنے کے قابل کردے، ان کے دل کو ان کے من کو بدی کی طرف سے ہٹالے۔ میں ٹھوس تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ انسان کے دل، اس کے نفس اور آتما کو تمام تاریکیوں سے پاک کرکے انھیں شانتی نور اور سچے وشواس (یقین) کیلئے اس سے زیادہ صحیح نسخہ انسان کی پوری تاریخ میں موجود نہیں۔ مگر یہ سن کر اکثر لوگوں کو حیرانی ہوگی کہ اسی کا اپنی صحیح شکل میں خود ہماری اسلامی خانقاہوں تک میں نشان نہیں بلکہ اس کے مقابل قبر پرستی و پیر پرستی کا ایک قہر روحانیت کے نام سے مسلط ہے۔ میرے نزدیک مسلمانانِ ہند کی موجودہ تکالیف کی روحانی بنیاد یہی شرک ہے مسلمان یہاں بھیڑوں کی طرح چھوٹے موٹے صوفیانہ حلقوں میں مثل بھیڑ بکریوں کے تقسیم کرلئے گئے ہیں جن کی اون، کھالوں اور بعض وقت گوشت پر اسلام کے نام پر برہمنیت کرنے والے ہزاروں مگرمچھ پل رہے ہیں عجب نہیں کہ کوئی ایسی لہر اٹھتی دیکھ کر یہ لوگ اپنی اپنی پیری مریدی کی مزید دوکان آرائی کے لئے سامان پائیں مجھے خوب یاد ہے کہ شمالی ہند کے ایک ہوشیار پیر نے "اللہ اکبر" کے قدوسی اور قرآنی و اسلامی نعرے کے ساتھ "یا رسول اللہ" اور "یا محمد" کا نعرہ اضافہ کرکے

باعث (ابھارنے والا) شہید (گواہی دینے والا) حق (سب سے زیادہ پائیدار) وکیل (کام بنانے والا) قوی (طاقت والا) متین (پختہ مضبوط) ولی (دوست) حمید (تعریف کے لائق) محصی (ہر چیز کو شمار میں رکھنے والا) مبدئ (بنانے والا) معید (لوٹانے والا) محی (زندہ کرنیوالا) ممیت (مارنے والا) حی (سدا زندہ رہنے والا) قیوم (سب چیزوں کا قائم رکھنے اور قائم کرنے والا) واجد (پالنے والا) ماجد (بڑی شان والا) واحد (ایک) احد (ایسا ایک کہ جس جیسا دوسرا نہیں) صمد (سب سے بے نیاز جس کے سب محتاج ہیں) قادر (شکتی والا) مقتدر (اقتدار والا) مقدم (پہلے کرنے والا) موخر (پیچھے کرنے والا) اوّل (سب سے پہلا) آخر (سب سے آخر) ظاہر (سب پر حاوی) باطن (سب سے پوشیدہ) والی (مالک) متعالی (بلند) بَرّ (نیکی کرنے والا) تواب (بندوں پر توجہ کرنے والا) منعم (انعام دینے والا) منتقم (بدی کا بدلا لینے والا) عفو (معاف کرنے والا) رؤف (ماننا والا) مالک الملک (سب ملکوں کا مالک) ذی الجلال والاکرام (خطرناک بڑھائی والا مگر ساتھ ہی مہربانی والا) رب (ضرورتوں کا پورا کرنیوالا) مقسط (انصاف کرنے والا) جامع (جمع کر دینے والا) غنی (لاپرواہ) مغنی (دوسروں کو لاپرواہ کرنے والا) معطی (دینے والا) مانع (نہ دینے والا) ضار (بدکاروں کو نقصان دینے والا) نافع (نفع دینے والا) نور (سب کو روشنی پہنچانے والا) ہادی (رہنمائی کرنے والا) بدیع (عجیب ڈھنگ پر پیدا کرنے والا) باقی (سدا رہنے والا) وارث (ہر ایک خوبی کا تنہا وارث)

مومن (امن دینے والا) مہیمن (حفاظت کرنیوالا) عزیز (غالب) جبار (مجبور کرنے والا) متکبر (منکار کرنے کے لائق) خالق (پیدا کرنے والا) باری (اس کے معنی بھی پیدا کرنے والے کے ہیں باریک فرق ہے) مصوّر (تمام چیزوں کی صورت بنانے والا) غفار (بخشنے والا) قہار (بدوں اور بدکاروں کو توڑنے والا) وہاب (بن مانگے دینے والا) رزاق (روزی دینے والا) فتاح (مشکلات کا کھولنے والا) علیم (سب کچھ جاننے والا) قابض (روک دینے والا) باسط (کھول دینے والا) خافض (متکبروں کو جھکا دینے والا) رافع (گرے ہوؤں کو اٹھانے والا) مُعِز (عزت دینے والا) مذل (ذلت دینے والا) سمیع (سب کچھ سن لینے والا) بصیر (سب کچھ دیکھ لینے والا) حَکم (فیصلہ کرنے والا) عدل (حق دار کو حق پہنچانے اور حق دلانے والا) لطیف (ایسی مہربانی کرنے والا جو دکھی اور محسوس بھی نہ کی جا سکے) خبیر (ہر بات سے خبردار رہنے والا) حلیم (اونچے حوصلے والا بردبار) عظیم (جس کی بڑھائی ہر ایک کے دل میں عزت پیدا کر دے) غفور (معاف کرنے والا) شکور (جب کوئی اچھا کام کرے تو اس کا سراہنے والا) علی (بلند مرتبے والا) کبیر (بہت بڑا) حفیظ (حفاظت کرنے والا) مقیت (طاقت پہنچانے والا) حسیب (سب کے کرموں کا حساب رکھنے والا) جلیل (بڑی شان والا) کریم (سخاوت کرنے والا) رقیب (نگرانی کرنے والا) مجیب (دعاؤں کا سننے والا) واسع (سب سے زیادہ وسعت رکھنے والا) حکیم (حکمت اور دانائی رکھنے والا) ودود (دوستی اور محبت کرنے والا) مجید (بزرگی والا)

متاثر ہیں وہ اُسے محض فلسفیانہ انداز کا ایک فکری موضوع بنا کر
فلسفیانہ انداز کے جبری سے نظامات میں بار لینے کی کوشش میں رہیں -
ساری دنیا میں موجودہ دور کے مسلمان کی پستی کا یہی بنیادی سبب ہے -
لہٰذا یہ عین تقاضائے قدرت معلوم ہوتا ہے کہ اس جامع توحید کو کامل
طور پر اپنانے کے لئے کوئی تازہ دم قوم آگے بڑھے اور اس کے جھنڈے
کو تھام کر دنیا کی رہنمائی کرے۔ جب اسی خدا پرستی کی کامل روح کو ہم اپنی
اقتصادی زندگی پر حاوی کرنا چاہتے ہیں تو اس سے اصولاً دو چیزیں
پیدا ہوتی ہے - ایک ایماندارانہ حلال کی روزی خود کمانا اور دوسرا خدا
پر بے پناہ وشواس۔ جسے قرآن توکل کہتا ہے۔ ان دو چیزوں کے
کامل طور پر پیدا ہو جانے کے بعد ذخیرہ سازی کی فرد کو ضرورت ہی نہیں رہتی
اُسے پوری کائنات اپنے تعمیری منصوبے سے بالکل ہم آہنگ محسوس
ہوتی ہے۔ خدا کی امداد اس سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے کہ جتنا
ایک چھ ماہ کا بچہ اپنی ماں کی چھاتی کو قریب سمجھتا ہے۔ جو خدا کا
مسخر ہو جاتا ہے کائنات اس کی قدرتاً مسخر ہوتی ہے۔ سر دست صرف
اس قدر تشریح ضروری ہے - اگر خدا نے چاہا تو "عالم انسانی کے حقوق
شہریت اور عالمگیر ریاست" کے اصول پر بھی کبھی دس تیس صفحات
ایسے لکھدے جائیں گے کہ جو ہر ہر انسانی معاشرے اور ملک میں قابلِ
عمل ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ ابتدائی مرحلے پر چند متعین ادر سب
انسانوں کے لیے واجب القبول چند ایسے اصول معین کرنے ہوں گے

رشید (اپنی ذات سے ہی ہدایت یافتہ) صبور (استقلال اور صبر والا)
یہ ننا ویں نام ایسے ہیں کہ جنھیں شردھا کے ساتھ سمجھ کر ان
کا سدا جاپ کرنے والا اور صدر میں لکھی ہوئی دعا اس کے ساتھ
کرنے والا اپنی روح اور اپنے اخلاق اور ان کی قوتوں کو بے انتہا
ترقی دے سکتا ہے۔ بے انتہا شانتی پا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو تمام
آلودگیوں سے بچا کر ایک چھوٹی سی نور کی دنیا بنا سکتا ہر کام میں خدا
اس کا ساتھی ہو سکتا ہے اسے بدی و بدکاری سے بچا سکتا ہے۔ مگر
شردھا اور دل کی لگن اور عملی وشواس ضروری ہے۔ جو بلا شک ہر اوسط
درجے کے انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے بشرطیکہ اُسے
لگاتار گناہ اور خدا کے انکار سے انسان برباد نہ کر چکا ہو۔ مذہب
کی جڑ یہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر اسی توحید کے بچے وشواس کے
ساتھ انسان عبادت کی وہ شکل بھی شروع کر دے کہ جسے نماز کہتے
ہیں تو پورے معاشرے کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک خدا کے
متعلق یہ اعتقاد پاک نہیں جاتا اس وقت تک نماز صرف ایک سوشل
فنگشن بن کر رہ جاتا ہے۔ نماز اصل میں توحید کی روح کو پورے معاشرے
میں گونا دینے کا ذریعہ تھا۔ مگر اب توحید محض ایک زبانی عقیدہ ہے
جس کا مفہوم ہی معلوم نہیں ہاں صوفیوں میں اس کے چند سطحی اعتبارات
موجود ہیں علما میں اس کے چند قانونی اور رسمی یا معاشرتی پہلو باقی ہیں
اس کے ساتھ جو لوگ موجودہ دور کے سیاسی اور معاشرتی انقلابات سے

کے سارے ذخیروں اور ماحول میں اپنی انفرادی و نوعی بقا کے لئے تصرف کرنے کی صلاحیت اور حق دونوں رکھتا ہے لیکن پہلے دو قدموں کو جانے سے پہلے جو تصرف وہ کائنات میں کرتا ہے وہ صرف ہوس و حرص کا فساد ہے ہدایت و فلاحِ انسانی کا نقطۂ عدل یہ ہے کہ انسان ان تینوں تعلقات کو اسی رنگ میں دیکھے اور اسی باہم مربوط شکل میں اس کے تمام اعمال باہم پیوستہ ہوں۔

(ب) اس کی ضلالت یہ ہے کہ وہ اعتقاداً اس ترتیب کو دیکھنے کے ناقابل ہو جائے اور عمل میں اس ربط باہمی کو نظر انداز کر دے۔

(ج) اس کی ہلاکت و مغضوبیت یہ ہے کہ وہ اپنے اصلی رابطہ حیات یعنی رابطۂ مع اللہ کو منقطع کر دے اس کا انکار کر دے۔

جب انسان فطری حالت پر قائم نہیں رہتا اور اس کا رشتہ اپنی اصل سے کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اب خواہشاتِ نفسانی اس کا محرکِ اعمال بننا شروع ہوتی ہیں۔ یہ شرک کا آغاز ہے اور جب یہ رشتہ قاطبتہً منقطع ہو جاتا ہے تو پھر محرک تام صرف ہوائے نفس رہ جاتی ہے۔ یہ شرکِ تام ہے۔ فطری حالت، حالت توحید تھی اور یہ فطرت سے روگردانی حالتِ شرک ہے۔

توحید و شرک کی اصل یہی ہے۔ توحید خیر و فلاح کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہے اور شرک شر و فساد کی ساری کائنات کا جامع ہے بلکہ خالص اخلاق کے درجے پر جن باتوں کو خیر و شر یا نیکی اور بدی

کہ جو تمام مذاہب کے ماننے والوں کو اصولی شکل میں اتحادِ عمل کیلئے آمادہ کر لیں، اس کے بعد بتدریج مذہب اپنی کامل شکل میں انسانی بستی کو ایک واحدہ بنانے کا کام کر سکیگا۔

اب مذہبی ادارے کے تاریخی عمل کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

مذہبی ادارے کے تین مرکزی اصول

تمام اہل مذاہب کیلئے ایک لمحۂ فکری

انسانیت یعنے مذہب اپنی اصل کے لحاظ سے شعوری رابطہ مع اللہ کا نام ہے۔ یہ رابطہ اصولاً روحانی ہے۔ دوسرے قدم پر جب اسی رابطے کو تعلقاتِ انسانی پر حاوی کیا جاتا ہے تو وہ چیز پیدا ہوتی ہے کہ جسے عملی اخلاقیت کہا جاتا ہے اور تیسرے قدم پر جب اسی رابطے کی روشنی اور رہنمائی میں انسان اپنے تعلق کو باقی کائنات سے مربوط کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ چیز اُسے محسوس ہوتی ہے کہ جسے شرافتِ انسانی کہا جاتا ہے۔ جسے محمدؐ رسول اللہ کی زبان میں خلافتِ خداوندی کہا جائیگا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ انسان اس کائنات کی سب سے اشرف مخلوق ہے اور وہ خدا کا خلیفہ ہے اور اس کا نائب ہے۔

(الف) اور اس شرافت و نیابت کے باعث وہ کائنات کے

پروگرام ایک دوسرا انداز لیئے ہوا اور اس کی ترتیب الو پیتھک سسٹم پر ہو جب اس کا اخلاقی پروگرام ایک دوسرا انداز لیئے ہو۔ اور اس کا مصنف کوئی ہومیو پیتھ ہو اور جب اس کے جسمانی فرائض ایک اور جداگانہ انداز لیئے ہوئے ہوں اور ان کا مولف کوئی نیچر کیور یا یونانی یا آیروید ک انداز لیئے ہوئے ہو تو غور کیجئے کہ تقدیر انسانی کیا خاک سلجھے گی وہ تو اور الجھیگی اور جب اندرونی تقدیر انسانی یوں اُلجھ گئی تو اب اگر اس یرقان زدہ قافلۂ انسانی کو ساری کائنات زیرو بالا صرف اضداد کی جنگ نظر آئے تو کونسی تعجب کی بات ہوگی اب اگر ہزاروں کارل مارکس پیدا ہوجائیں اور نظام ہستی کو ایک شاعرانہ صنعتِ تضاد بنا دیں تو کیا بعید ہے۔ ہاں تو اگر دین کامل صرف یہ ہے کہ انسان کا روحانی رابطۂ مع اللہ، اخلاقی فرائض انسانی اور جسمانی فرائضِ ارضی کو اسی فطری وحدت میں رکھا جائے کہ جس میں انھیں خدائے فطرت نے مربوط پیدا کیا تھا۔ اب اگر اسی فطری ترتیب کے بحال کرنے پر ہی تقدیر انسانی کا انحصار ہے تو پھر ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ تاریخ کی روشنی میں مذہبی ادارے کہ یہ اجزاے ترکیبی کس طرح کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ نوع انسانی کی عملی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم جس نتیجے پر پہنچینگے وہ محض ایک علمی کوشش بن کر رہ جائیگا۔ وہ ہمیں۔ کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو" کی تحکم آمیز اصولی امریت پر برضا و رغبت لبیک کہنے کے

کہا گیا وہ مقامِ روح پر صرف توحید وشرک کے تفصیلی اجزا ہیں
توحید وشرک کی اصل یہی ہے جب خواہشات پرستی کی اندرونی
بیماری کا خارجی دنیا پر اثر پڑتا ہے تو بت پرستی کی ہزاروں
شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلے تبانِ انفس تھے اور دوسرے تبانِ
آفاقی ہیں۔ پہلے اصل تھے دوسرے فرع ہیں۔ پہلوں سے دوستی
وروا داری رکھنا اور دوسروں کی مخالفت کرنا منافقت ہے۔

(ذرا ہمارے علما وفقہا اس فقرے کو غور سے ملاحظہ فرمالیں)
دوسروں سے رواداری برتنا اور پہلوں کی خیالی مخالفت کرنا
مداہنت ہے اور عملی کائنات پر ابلیس کے لشکر کو قابض کرنے
کے لئے راستہ صاف کرنا ہے (ذرا ہمارے علمبردارانِ روحانیت
بھی متوجہ ہوں) بہر تقدیر جس طرح حیاتِ انسانی نام ہے روح
وجسم کے مجموعے کا اور پختہ اخلاقی احساس کا اسی طرح اس کی
تقدیر کا صحیح چارٹر صرف وہ ہوسکتا ہے جس میں یہ تینوں چیزیں
ایک نظم رکھتی ہوں اور ایک لڑی میں پروئی ہوں۔ انسانی دینِ
کامل یہی ہے۔ اگر روح کو جسم سے یا جسم کو روح سے یا اخلاق
کو جسم وروح سے علیحدہ علیحدہ کرکے ایک ایک جزو پر انسان کا
اطلاق حرام ہے تو پھر تقدیرِ انسانی بھی یہ ہے کہ روح وجسم واخلاق
کا پروگرام ایک وحدت میں منتظم ہو۔ ورنہ فساد وبدامنی کے سوائے
کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ جب ایک انسان کے لئے روحانی فرائض کا

روایات اور مذہبی شخصیتوں سے تعلق رکھتی ہے اور چونکہ ہم صرف تاریخ کی روشنی میں نوعِ انسانی کا مجموعی عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے آپ کو تاریخ کا پابند کرینگے۔ تاریخ کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں انسانی اکثریت کا عمل مذہبی یہ تھا کہ وہ ہر اس منظرِ فطرت کو پوجنے لگتی تھی کہ جو اُسے امید پرور یا خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پوجا کی فہرست میں ہمیں جمادات، نباتات اور حیوانات سب ملے جلے نظر آتے ہیں۔ تاریخ میں مذہبی عمومیت کی جو پہلی شکل ہمیں نظر آتی ہے وہ یہی ہے۔ البتہ یہ دور جوں جوں انارکی سے نکل کر تنظیمی شکل اختیار کرتا جاتا ہے توں توں ہمیں مظاہرِ کائنات کی پوجا کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے ہیروز کی پوجا بھی تاریخِ انسانی کا جزو بنتی نظر آتی ہے اور اس کا سب سے آخری دور وہ ہے کہ جس میں ہمیں نیشنل ہیروز سے کہیں زیادہ مذہبی اہمیت کے لوگوں کی پوجا کا پتہ چلتا ہے۔ یعنے ایسے نیکوکار انسانوں کی پوجا کرنے کا آغاز ہوتا ہے کہ جن کے واسطے سے نہ یہ کہ انسان کی اپنی غرضیں یہاں اس دنیا میں پوری ہوتی ہیں بلکہ عاقبت میں وہ خدا کے ہاں انسانوں کے گناہوں کا کفارہ کر سکتے ہیں۔ ابتدا میں مظاہرِ قدرت اور بعد میں نیشنل ہیروز اور آخر میں مذہبی مقدس ہستیوں کی ملی جلی پوجا کا یہ دور ہمیں سینٹ پال کے رومن امپائر کو عیسائی بنانے پر منقطع نظر آتا ہے۔ اس سے آگے ہمیں انسانی تاریخ پر ایک نمایاں انقلاب یہ نظر آتا کہ مظاہرِ قدرت کی

یہ قانونی پابندی اس لئے ضروری ہے تاکہ گمراہ افراد کی گم کردہ راہی کو صرف انھیں کی ہستی تک محدود کر دیا جائے اور باقی نوع کو ان کے شر سے بچا لیا جائے۔ لہٰذا اگر عالم انسانی میں چند معین روحانی و اخلاقی اصولوں پر اتفاق پیدا ہو جائے تو پھر ان اصولوں کا عملی اجرا ایک لحاظ سے ایک تحکم آمیز آمریت ہو گا۔ ان چند حقائق کو واضح کرنے کے بعد میں مذہبی ادارے کے تاریخی عمل کا تجزیہ عرض کرتا ہوں۔

مذہبی ادارے کا تاریخی عملِ ارتقا

ان سطور کو پڑھنے کے وقت ہمیں مذہبی روایات اور مذہبی شخصیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے محض تاریخ کی روشنی میں انسان کی تقدیرِ مذہبی کو دیکھنا چاہیئے۔ یعنے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ نوعِ انسانی نے بحیثیت مجموعی مذہبی احساس کی کیا کیا تعبیریں کی ہیں اور مذہبی تعلیم کو کس کس انداز پر قبول کیا ہے۔ ٹھوس تاریخی نقطۂ نظر سے ہم تاریخ کو تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) دورِ اول وہ ہے کہ جب ہم انسان کو تاریخ کے دھندلکے میں گپھاؤں اور غاروں سے نکل نکل کر وادیوں میں ڈیرا ڈالتے دیکھتے ہیں۔ اس وقت انسان کے الہام نوعی کی کیا شکل تھی۔ اس سوال کو ہم نہیں چھیڑیں گے۔ اس لئے کہ یہ صورت تاریخ کے بجائے مذہبی

شروع کریں۔ خالص مذہبی روایات و مذہبی تشریح کے پیشِ نظریہ طریقِ کار سرتاسر غلط معلوم ہوتا ہے۔ میں خود سالوں ان کے اس طریقِ کار کو ان کی شخصی دوکان آرائی سمجھتا رہا جس کے لئے انھوں نے یہ سارا بکھان کیا تھا۔ مگر تاریخ کی روشنی میں ہمیں سوئے ظن کے اسباب غیر صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی اس کوشش نے کم از کم ایک چوتھائی انسانیت کو مظاہر پرستی کے گڑھے سے اٹھا کر صرف ایک نصب العینی انسان کی پوجا تک پہنچا یا یہ صرف نصب العینی انسان ہی کی پوجا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اخلاقی و روحانی فرائض کا ایک واضح احساس صاف کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بلاشک یہ تاریخ انسانی کا دوسرا دور ہے۔ اور ترقی یافتہ دور ہے اس دور میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ساری کائنات کے مقابل اپنی نوعی شرافت کا پورا احساس ہوگیا ہے۔ البتہ چونکہ ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے پوجنے کا نہ صرف جواز بلکہ ضرورت تک موجود ہے۔ لہذا اس درجہ میں انسان سے انسان کا اور انسان سے خدا کا پورا پورا تعلق متعین کرنا مشکل ہے یہی سبب ہے کہ ہمیں عیسائیت کے آغاز میں انسان کے سیاسی معاشرتی مظاہر اور اس کے اخلاقی و روحانی تصورات دو علیحدہ علیحدہ حلقوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا عیسائیت کا انقلاب اخلاقی و روحانی تصورات کا محض انفرادیت کے حلقے کا انقلاب تھا وہ تمام قوائے حیاتِ انسانی کا جامع و مانع

پوجا اور نیشنل ہیروز کی پوجا کو گناہ سمجھکر صرف ایک انسانِ کامل کی پوجا ایک تاریخی قوت بن جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اور مقدس شخصیتیں بھی دوسرے اور تیسرے درجے پر پہنچتے ہیں۔ یہ دوسرا دور ہے اور پہلے دور سے قطعاً ایک واضح ترقی یافتہ قدم ہے سینٹ پال سے پہلی دنیا یورپ ہو یا ایشیا ہمیں لاکھوں دیوی دیوتاؤں اور ہزاروں قومی ہیروز کی پوجا کی ایک آماجگاہ معلوم ہوتی ہے۔ ان میں بیچ بیچ میں مذہبی شخصیتیں بھی ہمیں پھبتی دکھائی دیتی ہیں۔ بہرحال سینٹ پال کے وجود سے انسانِ کامل کی پوجا کے جس دور کا آغاز ہوتا ہے وہ تاریخ انسانی کے عام دھارے کا ایک حصہ ہے۔ وہ پرانے عہدنامے کی طرح ایک کنبے کا ایک خفیہ قسم کا غیر تاریخی ریکارڈ مطلق نہیں بلکہ وہ تاریخ کے عام پھیلاؤ کو انارکی کی پراگندگی سے ایک وحدت کے دھارے کی طرف سمیٹتا ہے اور پوری کامیابی سے سمیٹتا ہے۔ اس کے حدود اربعہ گو یورپ تک محدود تھے۔ مگر اب یہ افراد کی کنسرن نہیں تھی بلکہ ایک تاریخی قوت تھی۔ خالص مذہبی روایات کے پیشِ نظر عام دنیا کے مذہب آج تک سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی اس جرأت کی کوئی وجہ نہیں پاتی کہ حضرت مسیح نے تو اپنی مساعی کو صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود قرار دیا تھا اور خود کو شریعت موسوی کا احیا کنندہ ظاہر کیا تھا تو پھر پیٹر پال کا کیا حق تھا کہ وہ ایک طرف انکی تعلیم کو علیحدہ مستقل مذہب کی حیثیت دیں اور دوسری طرف اسے ساری دنیا کے سامنے پیش کرنا

طور پر یہاں تک تھا کہ اپنے مرض الموت میں آپ نے جو دعائیں مانگی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اے اللہ میری قبر کو پوجا کا بت نہ بننے دیجیو۔ ایک اور موقع پر یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر پھٹکار بھیجے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا دیا۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر جہاں مختلف نبیوں کا ذکر آتا ہے وہاں قرآنِ کریم صرف ان کا نام لینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ "بھائی" کا لفظ ساتھ لگا دیتا ہے۔ مثلاً اس قسم کی درجن سے زاید آیات ہیں کہ "وہ وقت یاد کرو کہ جب نوح نے کہ جو اپنی قوم کا بھائی تھا اپنی قوم سے یہ کہا" "قوم عاد کے بھائی ہود پیغمبر کا واقعہ یاد کرو" "قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا" "مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا" غرض کہ بانیانِ مذاہب کو خدائیت کے مقام سے ہٹا کر عبودیت اور بھائی چارے کے مقام پر کھڑا کیا جاتا ہے اور اس طرح ایک طرف خدا اور بندوں کے درمیان سے سب حجابات کی نفی کر دی جاتی ہے تو دوسری طرف عالم انسانی کے باہمی تعلق کو صرف بھائی چارے کی اس مساوی بنیاد پر لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ جہاں نسل و قوم و رنگ و وطن اور غریب و امیر کی سب بنیادیں عملاً منہدم کر دی جاتی ہیں۔ لیکن عالم انسانی کی اس حرکتِ عمرانی کے متعلق جو چیز بنیادی توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہؐ کی کوشش تمام عالم انسانی کی ایک دعوتِ عمومی کی حیثیت سے سامنے

وظیفۂ حیات مطلق نہ تھا اس نے دنیا کے ایک بڑے حصے میں شرافت انسانی کا ایک جماعتی احساس پیدا کیا۔ تاریخ مذہب کے دوسرے دور کا عیسائیت ہی سے آغاز ہوتا ہے اور عیسائیت پر ہی خاتمہ ہوتا ہے عیسائی ممالک و مسلم ممالک کو چھوڑ کر باقی ممالک میں اب بھی مظاہر کائنات کی پوجا اور انسانِ کامل کی پوجا کے ملے جلے تصورات کار فرما ہیں ہندوستان ان تصورات کا مرکزی منبع ہے ایشیا و افریقہ کے اکثر حصوں میں یہ تصورات اب بھی حاوی ہیں۔

(۳) تاریخ کا تیسرا دور وہ ہے کہ جس میں مظاہر قدرت کی پوجا کے عدم جواز کے ساتھ ساتھ انسان کے انسان کو پوجنے کے اعتقاد کو بھی باطلِ مطلق قرار دیا جاتا ہے۔ اور صرف ایک رب العالمین کی پوجا کو ہر انسان کا بنیادی فرض قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی مخالفت انسان کا سب سے بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ انسان کے باہمی نوعی تعلق کی بنیاد صرف بھائی چارے اور مساوات کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس بھائی چارے میں خود بانیانِ مذاہب بھی شریک ہیں وہ خود بھائی چارے کی سطح سے ایک نقطہ زاید نہیں۔ تاریخِ مذہب کے اس دور کے قافلہ سالار محمد رسول اللہؐ ہیں جن کی وحی والہام کا یہ ٹکڑا "میں صرف تمہارے جیسا ایک بشر ہوں مجھے یہ الہام ہوا ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے" اعتقاد کی ایک نئی دنیا لئے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے پوجا کے لائق نہ پہلا کوئی نبی ورسول تھا نہ میں ہوں۔ یہ تردد محمدؐ کو ذا

کیا علم ہو گا۔ اور جب اس بے تمیزی کی حالت میں اس کا سچ مچ ان پر قبضہ ہو جائے تو فساد کے سوائے اس کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے انسانی کائنات کی مسلسل جنگیں اسی فساد کے سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان کی آخری کڑی آنے والی جنگ معلوم ہوتی ہے کہ جس میں ساری کائنات کو بالجبر و الاکراہ شریک کرنے کی جبریہ کوشش ہو رہی ہیں۔ تاکہ کسی شاعر کا یہ شعر صحیح ثابت ہو جائے۔ ؎

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تیری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

عجیب تر بات یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا یہ بحرانِ اعظم کارل مارکس کی امت کے دنیا پر قابض ہو جانے کے خوف کا نتیجہ ہے اس دشمنِ انسانیت کی امت کا نظم تاریخِ انسانی کے سارے روحانی و اخلاقی مثبت ملکات کی کلی نفی اور سارے رزائل اخلاق کی عالمگیر تنظیم سے ہوا ہے۔ اب اگر عالمِ انسانی کے سارے مذہبی طبقات عالمگیر نظم انسانی کا مرکزی ادارہ مذہب کو بنانا چاہتے ہیں تو پھر انھیں تعصبات شخصی مفاد و طبقاتی مفاد اور فرقہ وارانہ خود مرکزیت اور چند نیشنل ہیروز کے پوجنے پجوانے کے سارے اوہام کو چھوڑ کر کم از کم توحید و اخوت و خلافتِ ارضی و انسانی کی محمدی تعبیر کو اپنی اصل شکل میں لینا ہو گا۔ اور اسے ایک عالمگیر ادارے کی شکل دینا ہو گی، موجودہ دور کی مسلم اقوام میں موجودہ دور کی

آتی ہے اور وہ آج تک کے تمام بانیانِ مذاہب کی ان تمام مساعی سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے کہ جن پر ابتدائی مراحل میں صرف افراد کی انفرادی اصلاحِ نفسی کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ان علمی و فلسفیانہ مساعی سے بھی جدا ہے کہ جو یونانِ قدیم و ہندوستان کے مختلف سکولوں میں بڑے بڑے اخلاقی و روحانی اصولوں کی علمی خدمت کرنے کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ محمد رسول اللہؐ کے ہاں ایک خدا کا اعتقاد صرف فرد کے روحی سکون کا ایک انفرادی مرکز نہیں بلکہ یہ عالمِ انسانی کے عمرانِ عمومی کا سنگ بنیاد بھی ہے۔ یہاں اخوت کا اعتقاد دنیا کی کسی روٹری کلب کا کبھی کبھار کا زبانی اعتراف اور لیکچر نہیں بلکہ وہ سارے باہمی کاروبار کا سنگِ بنیاد بھی ہے۔ یہاں شرافتِ انسانی کا اعتقاد صرف فرد کے انفرادی عزتِ نفس کا حصہ نہیں بلکہ وہ حقیقت میں نوعِ انسانی کی خلافت و نیابت خداوندی بھی ہے کہ جس پر متمکن ہونے کے بعد انسان اپنے حقیقی مفاد کے لئے ساری کائنات مادی و حیوانی کو اپنی خدمت کے نقطے پر سمیٹ سکتا ہے۔ مگر یہ حق اُسے صرف خدا کے بندے کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور ضرورت کی حد تک دیا گیا ہے۔ خواہشات نفسانی کے بندے کی حیثیت سے اُسے تصرف فی الکائنات کا حق نہیں دیا گیا۔ اس حیثیت سے اس کا تصرف فی الکائنات فسادِ محض ہے۔ جس خواہشات کے بندے کو اپنے فرضِ منصبی اور اپنے مصرفِ حیات ہی کا علم و یقین نہ ہو اُسے ذخائر کائنات کے مصارف کا

اس وقت صرف عام اہلِ مذاہب سے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر وہ توحید واخوت وخلافتِ ارضی کے اصول کو اس انداز پر لیں کہ جس انداز سے تاریخِ انسانی کے مجاہد ومحسنِ اکبر محمد رسول اللہؐ نے انھیں عملی شکل میں پیش کیا تھا تو بلاشک ایک عالمگیر حرکتِ تعمیری شروع ہو سکتی ہے اور روحِ انسانی جس قسم کے ایک زندہ اخلاقی نصب العین کی تلاش کر رہی ہے، وہ سامنے آجاتا ہے۔

توحید، اخوت و شرافت کے تین اصول

دینِ کامل ہیں

انسان کا وہ دینِ کامل کہ جس کے قبول لینے کے بعد یہ دنیا جنت بن جاتی ہے اور ابلیس کے لشکر کو جس کے بعد انسانی برادری میں دخل دہی کا موقع نہیں رہتا، صرف یہی تین اصول ہیں بلکہ سچ پوچھو تو صرف توحید ہے کہ جسے اعتقاد کے مقام پر توحید کہا جائے گا۔ نوعِ انسانی کے عملی کاروبار اور باہمی تعلق کے مقام پر اخوت کہا جائے گا اور تصرف فی الکائنات کے مقام پر اُسے خلافتِ ارضی کا اصول کہا جائے گا۔ ہاں تو یہ یقین جانئے کہ انسان کا دینِ کامل یہی ہے۔

چند ایسی ہی اقوام کے شامل ہوجانے سے آج کے موقف میں کوئی بڑا خیر نہیں ہوسکتا۔ موجودہ مسلم سوسائٹی اور موجودہ اسلامی روایات کی ترتیب ہرگز محمدی تعبیر و تعمیر نہیں بلکہ موجودہ مسلم سوسائٹی اور موجودہ ترتیب روایاتِ اسلامی صرف ملوکیت کی تخلیق ہے جو خلافتِ ارضی کے نوعی نصب العین انسانی کو ختم کرنے کے بعد کی تنظیم ہے۔ بلاشک جب تک دنیا پر ملوکیت کا غلبہ تھا اس وقت تک مسلم ملوکیت اُن سے افضل تھی، اس نے بارہ سو برس تک نظمِ انسانی کے توازن کو بحال رکھا۔ لیکن آج جب کہ شخصی اقتدار کے غلبے کا جنازہ نکلا جاچکا ہے اور جمہوریت نے تمام افرادِ انسانی کے مساوی حقِ حیات کو اصول کی حد تک تسلیم کرا لیا ہے تو مسلم فیوڈل دنیا کے وہ چھوٹے چھوٹے سوزاک زدہ رئیس زادے جو ستر ستر بے نکاحی عورتیں اپنے اپنے گھروں میں ڈالے ہوئے ہیں، یا وہ خانقاہی اوہام پرست کہ جن کے وضو کا بدنا اگر ٹوٹ جائے تو وہ وضو کرنا چھوڑ دیں یا وہ فقہا کہ جن کا دین چند معاشرتی مسائل اور چند عباداتی فقہی مسائل تک محدود ہے۔ عالمِ انسانی کی فلاح کا فرض کیا ادا کرسکتے ہیں۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے نظم و ترتیب پر ایک دفعہ محمدی انداز کا جائزہ لینے اور سرِ نو ترتیبِ ملت و تنظیم اصولِ دین کی توفیق دیدے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ اس کے متعلق بعد میں چند جچی تلی باتیں عرض کیجائینگی

کرنے والے علی الاطلاق باطل ہیں اسی طرح اور اسی انداز میں محض عالم النفس کی اصطلاحات میں حیاتِ انسانی کی پوری تشریح کرنے والے بھی مطلقاً بر خود غلط ہیں وہ بھی لامذہب ہیں۔ اس انفسی کائنات میں جو کیفیات انسان دیکھتا ہے وہ ہرگز نہ تو مقام روح سے تعلق رکھتی ہیں نہ وہ نعوذ باللہ ماہیتِ خدا ہیں نہ اُن سے رابطۂ مع اللہ کا کوئی پتہ چلتا ہے۔ اس وقت اس کی مزید تشریح کا یہ مقام نہیں۔ صرف اتنی بات بتا کر اس ضمنی بات کو ختم کرتا ہوں کہ روح کی ایک بلند ترین رصدگاہ میں بیٹھا ہوا یہ باتیں عرض کر رہا ہوں ۱۹۳۰ء میں دنیا کے ہر تعلق کو چھوڑتا ہوا اُس دنیا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ان اکیس برسوں میں کیا کچھ دیکھا اور فریب نگاہ کی کتنی دنیائیں سامنے آئیں اور گذرتی گئیں۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ انشاء اللہ حالات نے مساعدت کی تو انسانی برادری کو اس سلسلے کے ہزار دو ہزار رنیڈ مبلغ دیکر مروں گا۔ ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ حیاتِ انسانی کا وہ پہلو کہ جو اُسے اپنے خدا سے وابستہ کرتا ہے وہ روحانی پہلو ہے۔ اور یہ ایک حق الیقین ہے اور تجربے کی لیبارٹری میں بیٹھ کر یہ عرض کر رہا ہوں کہ توحیدِ خدا کا وہ اعتقاد کہ جسے محمد رسول اللہ نے تلقین کیا ہے وہ انسان کے روحانی ارتقا کا آخری نقطہ ہے۔ آپ مشرکانہ افکار و خیالات کی جس قدر نفی کرتے جائیں

ان تین اصولوں کی پوری حیاتِ انسانی سے مطابقت

یہ تین اصول ہی درحقیقت دینِ کامل ہیں۔ باقی سب انکی تفصیل ہے۔ ذرا حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں سے انکا انطباق دیکھئے

(۱) حیاتِ انسانی کا ایک وہ پہلو ہے کہ جو اُسے اپنے خالق و مالک سے وابستہ کرتا ہے یہ پہلو حیاتِ انسانی کا روحانی پہلو ہے۔ انسانیت کی روحانیت ہرگز وہ نہیں کہ جس میں خدا سے ایک زندہ تعلق میں بندھ جانے کے بجائے محض اندرونی قواکی مختلف قسم کی مشقیں کی جاتی ہیں۔ اور جس میں انسان ہزاروں برس سے گرفتار ہے اور آج بھی مختلف جنگلوں، خانقاہوں اور غاروں میں مصروف عمل ہے ان لوگوں کی دنیا صرف وہ دنیا ہے کہ جسے انفسی دنیا (Subjective world) کہا جا سکتا۔ یہ دنیا عالم خلق کا داخلی پہلو ہے۔ عالمِ خلق کے ظاہری اور خارجی پہلو کو عالم آفاق (objective world) کہا جاتا ہے۔ ساری دنیا روحانیت کی خدمت میں علی الاعلان عرض کر رہا ہوں کہ روحِ انسانی عالم انفس و عالمِ آفاق دونوں سے بلند مقام پر واقع ہے۔ لہٰذا جس طرح حیاتِ انسانی کی تشریح صرف عالمِ آفاق کی اصطلاحات میں

کے سارے روحانی تجربے بھی اتنا وزن نہ رکھیں کہ جتنا ان سطور کا ہے۔ بعض وقت خیال آتا ہے کہ اگر دنیا کے سارے روحانیتی دو تین ہفتے کے لئے ایک جا جمع ہو کر محض تجربے کی بنا پر اس معاملے کو طے کریں تو فیصلہ ہو جائے۔

(۲) حیاتِ انسانی کا دوسرا پہلو وہ ہے کہ جو اُسے اپنے ابنائے جنس سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ پہلو حیاتِ انسانی کا اخلاقی پہلو ہے۔ اس کی اساس و بنیاد اخوت و بھائی چارے کا اعتقاد ہے۔ اعتقاد کی سطح پر وہ بھائی چارہ ہے اور عمل کی سطح پر مساوی درجے کا تعاون ہے۔ ارسطو نے انسان کو حیوانِ مدنی بتایا ہے۔ حیوان کا لفظ تو اشرف المخلوق پر چسپاں نہیں آتا البتہ وہ مدنی الطبع ضرور ہے اس کا عمران و آبادانی حیوانی عمران و آبادانی سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی بقائے حیات کے لئے زیادہ تعاون کا خواستگار ہے۔ یہ بھائی کا بھائی سے تعاون ہے جو نفع و نقصان کو اصولاً سب کے لئے یکساں تقسیم کرنے کا خواستگار ہے۔ موقعہ آنے پر صرف ایثار کا مطالبہ کرتا ہے۔ آقا و غلام حاکم و محکوم خادم و مخدوم کا تصور فطرتِ انسانی کو مسخ کرتا ہے۔ انسانی تعلقات کی اساس نوعی اخوتِ انسانی کا اعتقاد ہے۔ عملاً وہ مساوی استحقاقِ حیات اور مساوی سود و زیاں کا حامی تو (اور) ہے۔ انسان کی اس انسانی اخوت کی اساس اخلاقی و

اسی قدر ایک طرف آپ انفس و آفاق کے گڑھے سے نکلتے جائینگے تو دوسری طرف اپنے خدا سے آپکا تعلق ایک پختہ شعور و احساس بنتا جائے گا۔ صرف اور محض یہی مقام ہے کہ جہاں پہنچکر انسان حقیقت میں "میں شہادت دیتا ہوں کہ معبود صرف ایک اللہ ہے وہ اس مقام پر صرف اکیلا متمکن ہے اس معاملے میں اس کا کوئی ساجھی نہیں تمام ملک اسی کا ہے سب تعریفوں کا صرف وہی سزاوار ہے۔ مارنا اور جلانا صرف اسی کی صفت ہے اور وہ ہر چیز پر غلبۂ تام رکھتا ہے" انسان کہہ سکتا ہے اس سے پہلے اس کلمے کا دھرانا محض تقلید ہے۔ (یہ مقام محتاط اہل ظاہر کا ہے) یا پھر خود فریبی و منافقت و مداہنت ہے۔ بلا شک اس مقام پر ساری بد بال شرک فی "الا لاہ" میں سمٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور سارے خیر ایک نقطۂ توحید فی الالہ میں مندرج محسوس ہوتے ہیں اور ایک ہمہ گیر یقین بنکر اس کے ظاہر و باطن پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ گویا انسان کی روحانی تکمیل کے لئے توحید کامل کا اعتقاد کافی ہے اور وہ بلا شک تعلیم محمدی میں اس درجہ موجود ہے کہ اس سے آگے اس کا امکان و ضرورت دونوں ناپید ہیں۔ پھر مقرر کہدوں کہ میں مشاہدے کے کوچے کا انسان ہوں سنی سنائی محض اعتقادی انداز کی علمی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ مجھے شبہ ہے کہ محض علمی و منطقی انداز پر شاید اس کتاب کا تسلسل بھی چنداں دلکش نہ ہو۔ لیکن خالص یقین کے اعتبار سے شاید سو دو سو برس

مضر سمجھتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کائناتِ فطرت کی مختلف اشیا کی طرف اشارے کرتا ہوا فرشتوں سے انکا مصرف دریافت کرتا ہے۔ فرشتے ان اشیا کی حقیقی قدر و قیمت اور مصرف بتانے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فطرتِ انسانی کی نمودِ اول (آدم) سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ذرا ان معترضین کو ان اشیا کے نام بتاؤ..... اس سارے قصے کا اخلاقی نتیجہ یہ ہے کہ ساری کائنات حضرتِ انسان خدا کیلئے ہے خلاصتہً ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان ذخائرِ قدرت کو اپنی حیاتِ دنیا کے تسلسل کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اسے اس کا اخلاقی استحقاق ہے۔ ہر ادنیٰ چیز اعلیٰ چیز کی خادم ہے، فطرتاً محکوم ہے۔ حیاتِ نباتی نے جمادات پر تصرف کیا۔ حیوانات نے نباتات پر اپنی گذراوقات کی اور انسان ان تینوں کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ اور یہ اس کا نوعی حق ہے۔ تمام وہ افرادِ انسانی کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی صوابدید سے اس کائنات میں پیدا کیا ہے وہ اس کائنات میں مساوی استحقاقِ حیات رکھتے ہیں۔ اس استحقاق کی شرط محنت و عمل ہے اور کچھ نہیں۔ ذخیرہ سازیاں اور بلا محنت کھانا دونوں کفر کے اجزا ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح عمل و نظمِ انسانی کا سارا نوعی سلسلہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

توحید، اخوت و خلافت کی مربوط عملی شکل

صدر کی تشریح کو اب اس کی معیاری اور مربوط شکل میں دیکھئے

روحانی قدروں میں سب افرادِ انسانی کی مساوی شرکت ہے۔
یہ بھائی چارہ خونی رشتہ نہیں جو کائناتِ انسانی میں کائناتِ حیوانی کا باقی ماندہ اثر ہے۔ اسلئے کہ جب ان اخلاقی و روحانی فرائض کا تقاضا ہو تو خونی اخوت کو کاملاً نظر انداز کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ یہی ہجرت الی اللہ اور انقطاع ما سویٰ ہے۔ محمدی بھائی چارے میں ہمیں اس کی ہزاروں بے مثال مثالیں ملتی ہیں، بلکہ عملاً یہ تحریک اسی بھائی چارے کا ایک نظام تھا۔ لہذا اس سلسلے میں بھائی چارہ اعتقاد ہے تعاون عمل ہے اور مساوی سود وزیاں پھل ہے۔
(۳) حیاتِ انسانی کا تیسرا تعلق وہ ہے کہ جو اسے اپنے خدا اور ابنائے جنس کے علاوہ باقی کائنات سے وابستہ کرتا ہے۔ اسے جسمانی تعلق یا ماحولی تعلق کہنا درست ہے۔ اس تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ اعتقاد کے پہلو میں وہ انسان کے نوعی طور پر سب کائنات سے اشرف و اعلیٰ ہونے پر مبنی ہے۔ اس کی زبان میں انسان نوعی طور پر خلیفۂ خدا ہے۔ عملی سفرِ حیات کے دوران میں وہ ساری کائنات کے ذخائر کو اپنے مصرف میں لا سکتا ہے۔ ذخائرِ فطرت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ خدمتِ انسانی میں صرف ہوں۔ چنانچہ جہاں پر قرآنِ کریم تخلیقِ آدم کا قصہ بیان کرتا ہے وہاں کا سین یہ ہے کہ خدا فرشتوں سے کہتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنے ایک نائب کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ فرشتے اس عمل کو بے سود بلکہ

اتحاد کریں کہ جو (الظاہر) تم ہم سب میں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنے ایک اللہ کے سوائے کسی کو نہ پوجیں اس کے ساتھ کسی کو شریک کریں اور ایک دوسرے کو خدا نہ بنالیں" کائناتِ انسانی کے روحانی و اخلاقی اتحاد کی اساس اُس دن بھی یہی تھی اور آج بھی یہی ہے۔ اس تشریح کے پیش نظر نوعی حیاتِ انسانی کی تمام قوتیں اور صلاحتیں ایک باہم مربوط انسانی سلسلے میں منظم ہو جاتی ہیں جہاں بیک وقت فرد کی انفرادی اصلاح و ترقی و تکمیل کے ساتھ ساتھ جماعتی توازن و تعاون ایک طبعی و فطری بات ہو جاتا ہے۔ ابتدائے تخلیق سے اس وقت تک انسان کی انفرادی یا جماعتی زندگی میں جو جو شر و نقص و فساد ہے وہ قطعاً صرف انسانی زندگی کے انھیں تین پہلوؤں۔ روحانی۔ اخلاقی و مادی۔ پر توحید و اخوت و خلافتِ ارضی کے اصول کے عدم انطباق کا پھل ہے۔ انسانی زندگی کے ان تین پہلوؤں کو کامل طریق سے پہچاننے اور ان پر توحید و اخوت و خلافتِ ارضی کے اصولوں کو کامل طریق اور مکمل شکل میں حاوی کر دینے سے نوعی طور پر تقدیرِ انسانی بدل جاتی ہے خادم و مخدوم کا تصور ایک سراب انگیز بطلان معلوم ہونے لگتا ہے۔ آج کی دنیا میں انسان کو ایک دوسرے کا آقا کہلانے میں کچھ شرم سی آنے لگی ہے۔ مگر مذہب و اخلاق کے کوچے سے لیکر سیاست و معیشت کے کوچے تک خادم اور سرونٹ کہلانا ایک اخلاقی عزیمت اور ایک بڑی خوبی سمجھی جانے لگی ہے۔ جو یا نہایت درجہ مکر ہے اور

تکمیلِ توحید۔ تمام افراد کا اللہ تعالیٰ سے اپنی فطرت کے لحاظ سے بلا واسطہ تعلق ہے۔ وسائط شرک ہیں۔ یعنے شخصی واسطے وغیرہ۔ اس تعلق کی استواری کے لئے فرائضِ روحانی کا ایک سلسلہ ہے جسے سب کو ومہ کو مساوی درجہ ماننا ہوگا۔ اس سے رابطۂ مولا کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ انسان میں فطرتاً اس کی صلاحیت ہے۔ عذاب و ثواب کی بنیاد یہی صلاحیت ہے۔

اخوت۔ نوعی طور پر کائناتِ انسانی کے افراد کا باہمی تعلق مساوی درجے کا تعاون ہے اور اس کی بنا اخلاقی و روحانی بھائی چارہ ہے یہ بھائی چارہ اخلاقی و روحانی احساس پر مبنی ہے۔ خونی رشتے پر مبنی نہیں

شرافتِ انسانی۔ انسان کائناتِ زیر و بالا کی اشرف ترین مخلوق ہے اور ذخائرِ کائنات پر انہیں نوعی طور پر تصرف بقدرِ ضرورت کا حق ہے ربالعالمین کی ربوبیت میں سارے انسان مساوی استحقاقِ حیات رکھتے ہیں اگر یہ اصول عملاً انسانی بستی اپنے اوپر حاوی کرے تو ایمانداری سے دیکھا جائے کہ فساد کی گنجائش کہاں ہے؟۔ اب اگر اہلِ مذاہب سچ مچ کسی وقت بھی مرکزی حق کو پانے کی کوشش کریں گے تو اس کی ابتدائی اور بنیادی شکل صرف یہی ہو سکتی ہے۔ کائناتِ انسانی کا اتحاد صرف اسی انداز اور اسی اصول پر ہو سکتا ہے۔ محمد رسول اللہؐ نے جب اپنے آخری ایامِ حیات میں قیصر و کسریٰ اور ان کے نمایندوں کو دعوت الی اللہ کے خطوط لکھے تو اس میں آپ قرآن کی ایک آیت لکھ دیتے تھے کہ جس کا مفہوم یہ ہے۔ "اے اہلِ مذاہب آؤ ایک ایسے کلمے پر

تو پھر انسان کسی نہ کسی آقا کو تراش لیتا ہے۔ اپنے آپ کو بچوانے والے بتوں کا اتنا گناہ نہیں کہ جتنا پوجاری کا ہے۔

(ب) ابھی انسان اپنے ابنائے جنس کے باہمی تعلق کی نوعیت نہیں سمجھ سکا مساوات و اخوت کا لفظ بلاشک صدیوں سے دھرایا جا رہا ہے مگر یہ بھی صرف شاعری و گرمیٔ محفل کیلئے ہے عملی تصور ابھی جزو اعتقاد و عمل نہیں بن سکا۔ لہذا اگر ماضی میں بیسوں مخدوم اور آقا ایسے ہوتے تھے کہ جنہیں خادموں اور غلاموں کی تلاش ہوتی تھی تو جمہوریت کے دور نے لاکھوں پبلک سرونٹ اور خادم قوم پیدا کر دئے ہیں کہ جنہیں یا تو آقا معلوم ہی نہیں اور یا ان کی تلاش ہے یہ سر تا سر مکر ہے یا جہل ہے اور کچھ نہیں۔ اپنی روحانی تکمیل میں ہر پہلو اور ہر حیثیت سے خدائے واحد کو کافی جانو اور اسی حیثیت سے اس سے باہم مربوط ہونے کی کوشش کرو۔ اپنی حاجات کی عقدہ کشائی صرف اسی سے چاہو تو آقائیت و غلامیت کا سوال دائماً حل ہو جائے گا۔ اس اساسِ انسانی کے طے ہو جانے کے بعد تمام نوعِ انسانی کے مساوی حقِ حیات کو ایک اصل جازم کی طرح اپنی زندگی پر حاوی کرو تو نوعی فساد ختم ہو جاتا ہے۔ اور کائناتِ فطرت کے خزانوں میں سے مایحتاج پر نظر رکھو۔ اور ضرورت کی حد تک کائناتِ فطرت کی ہر چیز کو استعمال کرنے کا عنداللہ اپنے آپ کو مستحق سمجھو تو ایما ندارانہ کسب معیشت کا سوال

غایت درجہ جہالت ہے۔ بھائی صاحب جتنا گناہ آقا کہلانے میں ہے اتنا ہی گناہ خادم و سرونٹ کہلانے میں بھی ہے۔ آج کی دنیا میں لاکھوں انسان مختلف روپ دھارے ہوئے جاتی سیوک اور خادم قوم وغیرہ وغیرہ القاب، گو اخلاقی اہمیت کے ساتھ اختیار کئے ہوئے مختلف سوسائیٹوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن سے کوئی پوچھے کہ اگر سارا عالمِ انسانی یہی رنگ اختیار کرلے تو مخدوموں کی دنیا کہاں سے لاؤگے۔ وہ چیز کبھی اخلاقی عزیمت نہیں بن سکتی کہ جو یک وقت ساری انسانی بستی کا فرض نہ بن سکے۔ خدا کے کوچے میں یا اخلاق و روحانیت کے کوچے میں چور بازاری طرفداری اور کنبہ پروری ندارد ہے۔ صرف پست ہمتی سے مکاری اور مکاری سے فساد رونما ہو رہا ہے۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے کہ "انسان اپنی رگِ شیطنت کو خوب جانتا ہے۔ چاہے عذرِ لنگ کی ایک دنیا تیار کرلے"۔ عالمِ انسانی کے ایک نیچا ہرا ادنیٰ ترین فرد کی زندگی پوری انسانی بستی کی زندگی سے اس طرح باہم مربوط ہے کہ اگر وہ اپنے مخصوص موقف سے گر جائے تو ساری سوسائٹی میں فساد شروع ہو جائے۔ ان سب کے باوجود بھی اگر غلامانہ ذہنیت موجود ہے تو صرف اس لئے کہ (الف) حقیقی آقا کی آقائیت اور اس کے تعلق کی صحیح نوعیت کے معاملے میں ابھی انسان صرف شاعری کر رہا ہے۔ وہ اپنے حقیقی آقا سے ابھی مربوط نہیں ہوا۔ بلکہ سرے سے اس نے اس تعلق کی نوعیت ہی معین نہیں کی۔ لہذا جب عملاً اس خلا کو پُر کرنے کا وقت آتا ہے

پر نیک راہ پہ صرف کرتا ہے۔ مگر وہ حضرت عیسیٰ کے خدا کا بیٹا ہونے کا قائل نہیں۔ بلکہ اس کا یقین ہے کہ حضرت مسیح بھی اس کے بھائی تھے۔ بھائی کے درجے کے علاوہ اور کوئی قدوسیت کسی شخص کے لئے تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اس کا قائل ہے کہ حضرت مسیح نے خدا کے منشا کو پورا کرتے ہوئے حق کی تبلیغ کی اور آخرکار اسی کے لئے جان بھی دیدی۔ وہ یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ حق کے لئے جینا اور مرنا اس کے لئے بھی ویسا ہی فرض ہے جیسا حضرت مسیح کے لئے تھا۔ وہ اس اعتقاد پہ اپنے عملی کردار کی بنیاد رکھے ہوئے ہے۔ وہ حق کے لئے مرنا بھی چاہتا ہے۔ یہ اس کی اعتقادی و عملی زندگی ہے۔

(۲) ایک دوسرا آدمی ہے کہ جو یہ بے باک عقیدہ نہیں رکھتا۔ مگر ویسے اچھا آدمی ہے۔ جب موقع لگے نیکی کرنے سے نہیں چوکتا۔ رسمی انداز کی عبادتیں وغیرہ خوب کرتا ہے۔ مگر مقام عزیمت کو اپنے دائرہ عمل سے خارج جانتا ہے۔ حق ہی کے لئے جینے حق ہی کے لئے مرنے کو وہ اپنا عملی نصب العین حیات نہیں بلکہ ان اعمال کے متعلق وہ اس بات کا قائل ہے کہ اس آخری مرحلے کے اعمال ہیں اس کیلئے اس کے پیرو مرشد فرض کیجئے، حضرت عیسیٰ اپنے اعمال صالح سے کفارہ کردیں گے اس لئے حق ہی کیلئے مرنا اس کا بنیادی فرض نہیں بلکہ یہ فرض حضرت مسیح جیسے چند مخصوص اشخاص کا تھا۔ اب سوال عرض ہے۔

بھی حل ہو جاتا ہے۔ فساد کہاں ہے؟ صرف بے ایمان کے
دل اور دماغ میں چھپا ہے کہ جہاں سے ہر ہفتہ عشرہ کے بعد
باہر آکر انسانی بستی پر ڈاکا ڈال لیتا ہے۔

علمائے عیسائیت سے گذارش

ایک سوال

تقدس مآب پوپ، ان کے تمام اول درجے کے لفٹینٹس
اور باقی علمائے عیسائیت سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔
مناظرہ کرنے والے عموماً منافق ہوتے ہیں اور خدا کی قسم میں منافق
نہیں۔ صرف فلاحِ انسانی کے احساس نے مجبور کر دیا ہے۔ سوال عرض ہے
(۱) فرض کیجئے کہ ایک شخص خدائے وحدہٗ لاشریک کو وحدہٗ
لاشریک ہی مانتا ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ ہر انسان سچے رجوع الی اللہ
کے بعد بلا واسطہ شخصی اپنے مولا کی رضا کو حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کو
نوعی طور پر اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ اور اپنی قوتوں کو مسلم الثبوت طور

اور جناب پیرانِ پیر حسین ابن علی کو سارے ابنائے جنس کا کارساز ماننے اور منوانے والو۔ ان کے اسوۂ حسنہ پہ گامزن ہو کر زندگی کے ہر قطرۂ خون کو راہِ حق و صداقت میں صرف کرنے کے بجائے انھیں اپنا کارساز بتاتے ہوئے انھیں پوج پوج کر ایک طرف اپنی دنیاوی مرادوں کو پورا کرنے والو اور دوسری طرف انھیں قیامت میں اپنے تمام کفریات کا کفارہ سمجھنے والو! جو آندھیاں دنیا میں اُٹھ رہی ہیں ممکن ہے وہ صرف تمھیں کو نیست و نابود کرنے کے لئے ہوں۔ بہت بڑا امکان ہے کہ تمھارے کنبے کے ہاتھوں میں ایک انچ زمین ساری دنیا میں باقی نہ رہے۔ تمھاری سیادت کا دار و مدار "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کو ساری دنیا میں پھیلانے پر تھا۔ تم نے اُسے چھوڑ دیا لہٰذا اس حیثیت سے جو جو امتیاز تم سے متعلق تھا وہ ایک ایک کر کے تم سے چھینا جا رہا ہے

ہاں تو علمائے عیسائیت اگر کائناتِ انسانی کو خدائے حقیقی کے اعتقاد پر ایک نظمِ جدید دینے میں ہم نوا ہونے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں تو وہ توحید و اخوت و خلافتِ ارضی کے اس نظمِ جدید کو غور سے ملاحظہ کرتے ہوئے میرے صدر میں اٹھائے ہوئے سوال کا خدا پرستانہ جرأت سے جواب دیں ؂

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ہاں میرے پیارے بھائیو! میری گذارش آپ سے یہ ہے کہ ان
دونوں میں سے کون سچا مومن باللہ ہے اور مستحق رضائے الٰہی ہے
اور اپنے عمل و اعتقاد سے قسمت انسانی کے توازن کو بحال کر
رہا ہے جب تک انسانی برادری کا ہر مذہبی عالم اس سوال کو صحیح
انداز میں طے نہیں کرتا وہ اللہ کی ناراضگی کے اس طوفان سے
بظاہر بچ نہیں سکتا۔ بچنے کا کوئی استحقاق نہیں رکھتا کہ جو طوفان
اس وقت دنیا پر آرہا ہے۔ انسان کو صرف نیکی اور تقویٰ پر سارے
عالم میں ایک ہونا ہے اور صدر کا سوال اسکے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔
علمائے عیسائیت کے سامنے اس سوال کو رکھنے کے علاوہ
میں اس سوال کو امتِ اسلامیہ کے سامنے بھی انھیں لفظوں میں
رکھتا ہوں۔ علماء ہی نہیں بلکہ صوفیا کو بھی شامل کرتا ہوں کہ وہ
بھی اپنے اپنے اماموں، پیروں، مرشدوں اور سیاسی ہیروز کے
متعلق بھی اسی انداز سے سوچیں۔ اس کے ساتھ قرآنِ مجید کی ایک
شہرۂ آفاق آیت جسے کم از کم بارہ سو برس سے منسوخ کر دیا گیا
ہے سوچیں۔ اس طرح سوچیں کہ کیا خود اس آیت کو منسوخ کر دینے
والی ساری شخصیتوں کو وہ اسی آیت سے منسوخ کرتے ہوئے پھر
سے اُسے عملی کاروبار کا سنگِ بنیاد بنا سکتے ہیں یا نہیں وہ یہ آیت ہے

ایاک نعبد و ایاک نستعین

جنابِ پیر بغدادی، جناب پیر اجمیری، اور جناب پیر نقشبندی

وروحانی شعور سے خالی خولی جمہوریت ہے کہ جو دنیا کو ایک انارکی کی طرف لے جارہی ہے۔ دوسری طرف مارکسی امت ہے کہ جو انسان کو اخلاقی وروحانی قدروں اور خدائے علیم وخبیر کے سامنے جوابدہ ہونے کے ایمان ویقین سے ہٹاتی ہوئی ایک طرف انسانیت کو ہلاکت انگیز نفرت وعناد وبکر وفریب کا سبق دے دے کر اُسے جیوانی انداز کے ایک فیصلہ کن بحران کی طرف لے جارہی ہیں اور تیسری طرف ایک جنگِ عالم گیر ساری انسانیت کو ایک بے مثال نوعی ہلاکت میں لپیٹنے کا کام انجام دے رہی ہے۔ نوعی ہلاکت کے اس کھلے امکان کو اگر کوئی چیز انسانیت سے ہٹا سکتی ہے تو وہ نوعی انداز پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کی اس ابتلائے ظاہری کے باعث پورے نوعِ انسانی کو اس کے حقیقی اتحاد کی طرف کھینچ رہا ہو جس طرح ایک فرد کی ہدایت کا سبب اکثر اوقات اس کے آلام ومصائب اور ناقابلِ حل مشکلات بن جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح پوری انسانی بستی کے لئے بھی موجودہ دور کی ابتلا انگیز عالمی فضا اپنے مالک حقیقی کی طرف رجوع کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

اوّل درجہ کا بندۂ خدا کون ہے

صرف وہ شخص ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور فلاحِ انسانی کے لیئے اگر سارے کنبے، قبیلے اور ملک و وطن اور بالآخر ساری دنیا کے مقابل اکیلا ہو کر کھڑا ہونا پڑے تو وہ نہ چوکے۔ مذہب اور اس کی رسومات مقصد نہیں ذریعہ ہیں۔ کس کا ذریعہ۔ رابطۂ مع اللہ کی استواری اور فلاح نوعِ انسانی کا۔ لہذا اگر ساری کتابوں کو جلا دینے اور سارے بت خانوں مندروں اور نمائشی عبادت خانوں کو منہدم کرتے ہوئے سارے عالمِ انسانی کے شاہ وگدا اور برہمن و اچھوت سفید و سیاہ کے فرق کو یکسر ختم کرتے ہوئے کسی ایک عالمگیر مقام میں جمع ہو جانے سے یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے تو اللہ کے ایک سچے بندے کو اس سے گریز نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے اوّل درجے کا بندۂ خدا۔ صرف ایسے ہی اعتقادِ جازم پر عالمِ انسانی کی ایک تنظیم جدید عالمِ انسانی کو عالمگیر ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔ اور اسکے لئے علمائے مذاہب و صحیح مذہبی احساس رکھنے والے مذہبی عناصر کا ایک نقطۂ عدل پہ جمع ہو جانا ابتدائی ضرورت ہے۔ ورنہ اس وقت جو عذابِ عظیم انسانیت پر حاوی ہوتا دکھائی دیتا ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔ ایک طرف اخلاقی

روایاتی تنظیم کی تھی وہ اب کسی صورت موجودہ آفاق گیر احوال سے تطابق نہیں رکھتی اس تنظیم میں اسلام صرف ایک تہذیبی اور اخلاقی قوت کی حیثیت سے دوسرے درجے پر کار فرما تھا۔ اول درجے پر صرف ملوکیت کا سیاسی اقتدار کار فرما تھا یا اس کی اقتصادی لوٹ مار کار فرما تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت نے اسلامی سوسائٹی کے دوسرے دائروں میں اپنے جو جو جوابات یعنی رد عمل پیدا کئے تھے وہ اول درجے پر کار فرما تھے۔ یہ مقام کچھ تفصیل چاہتا ہے ورنہ امت اسلامیہ ہرگز یہ نہ سمجھ سکیگی کہ اس کے موجودہ دور کے ابتلاؤں کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ ذرا اسلام کو اپنی اصل شکل میں معرف کراتا ہوں۔

اسلام اپنی اصل کے لحاظ سے کیا تھا

اسلام نام ہے کامل ترین توحید خدا کے اعتقاد سے پیدا شدہ اس عالم گیر اخوت انسانی کا کہ جو بحیثیت نائب خدا کے کائنات ارضی پر تصرف کرتی ہے۔ گویا اس کے تین اجزاے ترکیبی ہیں۔ توحید کامل۔ اخوت کامل اور کائنات ارضی پر تصرف کامل۔ قرآن کی زبان اور محمد رسول اللہؐ اور صدیق و فاروق کے عمل کی روشنی میں تصرف فی الکائنات کا استحقاق انسان کو صرف اسی حیثیت سے متعارف ہونے اور اسی حیثیت پر متمکن ہونے سے پیدا ہوتا ہے

باب سوم

پہلی فصل

زعمائے امت اسلامی کی خدمت میں گذارش

أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ

ملت اسلامی کے سارے روحانی شرعی اور سیاسی زعما کو بنیادی جس تغیر احوال کو ذہن نشین کرنا ہے اور جسے پوری طرح سمجھنے کے سوائے وہ کسی طرح اپنی حیثیت کو سنبھالنے کے قابل نہ ہوں گے وہ یہ ہے کہ خلافت علی منہاج النبوت کی تنظیم کو ختم کرتے ہوئے ملوکیت کو جن احوال نے قائم کر دیا تھا وہ عالم گیر طور پر بدل گئے ہیں۔ یہاں تک کہ آج ملوکیت اور اس کے ملحقات۔ فیوڈل نظام۔ کو ایک عالم گیر بدی اور گناہ سمجھا جانے لگا ہے لہذا امت اسلامیہ نے ملوکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی جو معاشرتی و معاشی و

جینے کا خیال ابھی حیاتِ انسانی میں بہت دھیما بلکہ ناپید ہے۔" ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی اللّٰہ رب العالمین" کو سمجھنے کے لئے خدا جانے انسان ابھی اور کتنا وقت لے۔ تصرف فی الکائنات کی بنا شرافتِ انسانی یا بالفاظِ قرآن صرف خلافتِ ارضی کا اعتقاد ہے۔ گویا اسلام توحید و اخوت و خلافت ارضی کے تین مرکزی اصولوں کی تلقین ہے۔ اسے روحانی، اخلاقی اور ارضی رابطہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ انسان کی نصب العینی حالت یہ ہے کہ وہ ان تینوں اصولوں کو اپنی زندگی میں سموتا ہوا روحانی، اخلاقی و ارضی رابطے کا بہترین توازن قائم کرے۔ یہی خلافتِ ارضی کی تنظیم کا آغاز ہے۔ اس کی عملی مثال جماعتی رنگ میں محمد رسول اللہؐ کی پیدا کردہ جماعت تھی جس نے ساری کائنات کو اسی ایک تنظیم میں منظم کرنے کی عالم گیر انداز پر کوشش کی جو کچھ عرصہ بعد رک گئی اور دنیا پر پھر بدستورِ سابق ملوکیت چھا گئی۔ لیکن مسلم ملوکیت اور عام تاریخ ملوکیت میں بلاشک اتنا فرق رہا ہے کہ مسلم ملوکیت اضافتہً باقی تمام جہاں کی ملوکیت سے افضل رہی ہے۔ یہ تعصب نہیں بلکہ ایک تاریخی حق ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تعلیم محمدی کا اعتقادی و عملی ریکارڈ اس درجہ واضح تھا کہ اس کی موجودگی میں مسلم ملوکیت میں وہ خرابیاں نہ آسکتی تھیں کہ جو ان بادشاہتوں پر آسکتی ہیں کہ جن کی پشت پر اتنا واضح کوئی اخلاقی و روحانی ریکارڈ نہ تھا۔ قدم قدم

اس حیثیت کے بعد تصرف فی الکائنات انسانی فرائض میں داخل ہے
فرد کے لئے تو یہ فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ اپنی ضروریاتِ
حیات کو ارضی ذخائر میں سے پورا کرنے کو اپنا حق اور ضروری
فرض جانے۔ اُسے ظلم و تغلب نہ سمجھے - بلا شُبہ آج بھی اِس دنیا
میں کروڑوں انسان ایسے ہیں کہ جو اس تصرف کو صاحبِ قوت کے
بے استحقاق تغلب سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک نباتات و
حیوانات کو انسانی تصرف میں لانے کا کوئی اخلاقی حق موجود نہیں
ایسے اخلاقی حق کی ان کے نزدیک کوئی بنیاد نہیں۔ یہ صرف زوردار
کا ایک تغلب ہے کہ جو خواہشات کے دباؤ کے ماتحت کام کر رہا
ہے۔ اگر آج تک حضرتِ انسان سطحِ ارضی پر کوئی پائیدار مدنیت
تعمیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تو اس کی بنیادوں میں یہی اعتقادی
تزلزل کار فرما ہے۔ اگر آج اس پر خواہشات کا غلبہ ہوا اور اس
کے اعصاب میں پوری قوت ہے تو وہ فرعون و شداد و قارون و
ہامان بنکر دنیا پر چھا جانے پر آمادہ ہو گیا اور اگر کل اس پر اعصابی
کمزوری کا دورہ ہوا یا فرطِ خواہشات میں ردِ عمل پیدا ہوا تو وہ
ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولا، ترکِ ترک کرتے ہوئے تاریک
غاروں کی تلاش میں نکل گیا۔ زندگی کو ایک ایسا مدارانہ واقعاتی
مقدس فرض اور اللہ کا بخشا ہوا ایک مقدس تر استحقاق جانتے
ہوئے۔ اس کی بقا کے لئے تصرف فی الکائنات کو ایک فرض سمجھتے ہوئے

ایزدی مطلق حاصل نہیں جو بارہ سو برس تک مسلمانوں کا خاص حصہ رہا ہے۔ اور اسوقت تک وہ تائید حاصل نہ ہوگی کہ جب تک مسلمان اقوام انڈونیشیا سے تبریز و مراکش تک کے تمام ممالک کے تمام علما و فقہا و زعما کی ایک عالمگیر شورائیت کرتے ہوئے اپنی تنظیم جدید کو پھر خلافت راشدہ کے انداز پر کھڑا نہ کریں ملوکیت کے ۱۳ سو برس کے درمیانی وقفے کو یکسر نظر انداز کرنا ہوگا۔ اس دوران کی تاریخ یا ترتیب روایات آج مطلق کام نہ دیگی۔ اس موقع پر یہ بات ہمیشہ کے لئے دلنشین کر لینے کی ہے کہ خلافت ارضی کے اصول پر جو تنظیم محمدؐ سے شروع ہو کر خلافت راشدہ تک چلی تھی اس میں اسلام سو فیصدی کار فرما تھا لیکن نوع انسانی کے اس جامع ترین نصب العین۔ خلافت ارضی۔ کے ٹوٹ جانے کے بعد ملوکیت کی مرکزیت کے بعد امت اسلامیہ کی جو تنظیم شروع ہوئی اس میں اسلام کا دسواں حصہ بھی مشکل سے کار فرما تھا۔ غالباً دنیا کے انسانیت میں بہت ہی کم ایسے لوگ موجود رہے ہیں کہ جنھیں یہ معلوم ہو کہ عالم انسانی کے اختلاف کا بنیادی سبب ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس وقت تک انسانیت کے سامنے کوئی ایسا جامع و مانع نصب العین دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکا کہ جس کے حصول کے لئے نوع انسانی کی ساری قوتیں ایک قدرتی انداز پر منظم ہو سکیں اور یہ ایک حق مطلق ہے کہ نوع انسانی کا یہ

پر اہل حق اس ملوکیت کی غلط کاریوں کو روکنے پر آمادہ رہتے تھے
گذشتہ بارہ سو برس تک مسلم ملوکیت بلاشک سارے عالم انسانی
کی تاریخ کا مرکزی نقطۂ توازن رہی ہے۔ لیکن جب سے موجودہ
تاریخ انسانی کا جمہوری دور شروع ہوا ہے، عالم اسلامی بتدریج
اپنی مرکزی حیثیت کھوتا جارہا ہے اور آج غالباً تنزل کا آخری
مرحلہ اس کے سامنے ہے۔ اس کا کھلا سبب یہ ہے کہ وہ آج بھی
اپنی اسی تنظیم و ترتیب سے وابستہ ہے کہ جو تنظیم خلافت راشدہ کے
ختم ہونے کے بعد اس نے خلافت کے بجائے ملوکیت کی مرکزی
حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اختیار کی تھی۔ چونکہ اصولاً تاریخ نے
ملوکیت کو انسانی زندگی میں سے خارج کر دینے کے اصول کو صحیح
تسلیم کر لیا ہے اور کم از کم سیاسی حد تک سب انسانوں کی مساوی
قدر و قیمت و مساوی حق حیات کو تسلیم کر لیا ہے اور چونکہ سیاسی
و اقتصادی (یعنے جماعتی) دائرے میں یہ حالت مسلمانوں کی شکست
خوردہ تیسرے درجے کی مدقوق و مسلول ملوکیت سے بہر صورت
افضل ہے، لہذا مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کو کسی مقام پر
اس خدائے حقیقی کی تائید حاصل نہیں کہ جس کے کلمے کو ظاہر کرنے
کے لئے محمد رسول اللہ صلعم نے عالمگیر تنظیم انسانی شروع کی تھی۔ انڈونیشیا
سے لیکر ایران و مصر و مراکش تک کے مسلمانوں کی اس وقت جو جو
کشمکش جاری ہیں، ان میں سے ایک کو بھی اس وقت وہ تائید

اور خود ان کی کوئی دنیاوی غرض نہ ہوتی تھی ان میں سے اکثر صرف دنیاوی اغراض واعزاز کے لئے یہ تعلق قبول کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے اہلِ قضا کی تاریخ کو عموماً مداہنت پیشہ دنیا داروں کی تاریخ سمجھا جاتا تھا۔ جو اکثر اوقات اہلِ ہوا دنیا داروں کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اہلِ حق کا گلا گھونٹتے تھے۔ لیکن چونکہ تاریخ عالم پر ابھی ملوکیت کا غلبہ تھا لہذا یہ مسلم ملوکیت اپنے اصل کے مقابل گھٹیا ہونے پر بھی باقی اقوام کی ملوکیت سے ہر صورت افضل و اعلیٰ تھی۔ اس کا ایک سبب تو وہی ہے جو صدر میں عرض کیا جا چکا ہے۔ یعنے یہ کہ تعلیم محمدی و اسوۂ محمدی کا ریکارڈ اتنی عالمگیر وضاحت رکھتا تھا کہ اس کی موجودگی میں گناہ ولغاوت کے لئے ہزار در ہزار تاویلات گھڑنی پڑتی تھیں اس کے علاوہ سطح پر نہ سہی مگر قریبی ماحول کے اندر چھپی ہوئی ایک حزب مخالف ہمیشہ حق کو کسی نہ کسی صورت میں برسرِ کار لانے کے لئے کوشاں رہتی تھی۔ پہلی صدی میں تو یہ حزب مخالف خانوادہ علی و فاطمہ اور ان کے متوسلین پر مشتمل تھی۔ بعد میں اور اور حلقوں کے علما و فقہا بھی مختلف مقامات پر اس مشن کو ادا کرتے رہے۔ یہ دو سبب تھے کہ جن کے باعث مسلم ملوکیت باقی تاریخی ملوکیت سے بہتر رہی اور اس نے تاریخ انسانی میں عملِ توازن کو بحال رکھا لیکن آج جب ملوکیت اور شخصی اقتدار کا سارے عالمِ انسانی سے جنازہ نکل چکا ہے

نصب العین صرف خلافت الٰہی ہے اور کچھ نہیں اس کے ساتھ یہ بھی ناقابل انکار ایک تاریخی محاکمہ ہے کہ اس نصب العین کو جماعتی انداز پر سو فیصدی اپنانے والی امت صرف محمدؐ کی تنظیم المسلمین تھی۔ لیکن جب یہ تنظیم پھر ملوکیت نے توڑ دی اور اس کی جگہ مرکزی اقتدار اعلیٰ پھر ملوکیت کے ہاتھ میں چلا گیا تو تنظیم المسلمین کے سامنے سے پھر یہ نصب العین گم ہو گیا جس کے نتیجے میں اسلام کے جامع ومانع مفہوم کا عملی شیرازہ گم ہو گیا اور اس کے مختلف اجزا مختلف حلقوں میں بٹ بٹا کر محض جزوی سی شکلوں میں باقی رہ گئے اور "تنظیم المسلمین" اپنے اصل کے مقابل بالکل ایک سطحی سی چیز ہو کر رہ گئی جو آج تک قائم ہے، جسے بدل دینے کے لئے آج پہلی دفعہ تاریخ نے موقعہ بہم پہنچایا ہے۔ جس کا افسوس ہے کہ امت مسلمہ کو احساس ہی نہیں۔

اس ساری تنظیم و ترتیب میں ملوکیت ایک مرکزی اصول موضوعہ کی حیثیت رکھتی تھی وہ کسی شورائیت کا نتیجہ نہ تھی نہ کسی شورائیت ملت یا کسی مرکزی اصول کی پابندی سے شروع ہوتی تھی۔ وہ مطلق و بے قید تھی۔ محتاط اہل دین ان سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ اہل دنیا اور دینداری کے تفرقے کی یہی تاریخ ہے جس نے امت اسلامیہ میں بھی وحدت کے بجائے اثنینیت کا بیج بویا جو فقہا ان اہل الدنیا سے تعلق پیدا کرتے رہے سوائے چند ایسے دور اندیش انسانوں کے کہ جو اس تعلق سے دین کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رکھنا چاہتے تھے۔

خاتم النبیین کی حقیقی خصوصیت تھی۔ ورنہ اس سے پہلے بھی اور آج بھی یہ تعلقات بالکل علیحدہ علیحدہ دائروں کا موضوع فکر و عمل ہیں تعلق خدا یا روحانیت آج بھی تارک الدنیا راہبوں کا ورثہ سمجھا جاتا ہے اور دورِ محمدی سے پہلے بھی سمجھا جاتا تھا۔ انسان کا محض معاشرتی توازن آج بھی محض معاشرتی مصلحین و محققین کا کام سمجھا جاتا ہے اور جب بھی انھیں کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اور تصرف فی الکائنات جب بھی "ناپاک دنیا داری" تھی اور آج بھی ہے۔ تعلیم محمدی نے پہلی دفعہ زندگی کے ان تینوں فرائض کو ایک متوازن سیرت ملی میں جمع کیا اور یہ تاریخ انسانی کا استثنا خلافت راشدہ تک چلا جس کے بعد ملوکیت نے سر اٹھایا امت کا راستہ روکا اور کچھ عرصے کی کشمکش کے بعد امت اسلامی بھی انھیں تین حلقوں میں بٹ گئی۔ (الف) ملوکیت اور اس کے حاشیہ بردار جرنیل اور روسا (ب) تارک الدنیا صوفیا و مشائخ (ج) علما و فقہا تعلق ارضی یعنے تصرف فی الکائنات کے حق کو ساری اخلاقی و روحانی ذمہ داریوں سے علیحدہ کرتے ہوئے محض غلبے کی بدولت امرا و سلاطین نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اخلاص باللہ و رابطہ مع اللہ فقرا و مشائخ کی کنج کاوی کی خصوصیت بن گیا اور ملت کی معاشرتی وحدت کو کسی نہ کسی شکل میں باقی رکھنا اور کلی انارکی سے اسے بچانے کی کوشش کرنا علما کا

تو ہمارے ہاں کے ان بے موسم کے جانشینانِ یزید کے گرد حلقۂ ارادت باندھے رکھنا عنایتِ خداوندی کو کس طرح اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہے۔ اس کی کیا افادیت ہے۔ یہ تو تاریخ انسانی کے ارتقائی دھارے کی راہ کو روکنے والی بلا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس کی کلی نفی کرکے امتِ اسلامی دورِ جمہوری میں بھی عالم انسانی کے لئے اپنی مرکزی افادیت کو بحال نہ کرے گی تائید خداوندی ہرگز ہرگز اس کا ساتھ نہ دیگی۔ امتِ اسلامی کے اس عالم گیر عملِ اصلاح کا ایک معین خاکہ عرض کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے موجودہ امت اسلامی کے مرکزی عناصرِ ترکیبی، ان کا موجودہ موقف اور ان کی مرکزی غلطیوں کے ساتھ ان کی اپنی اپنی تاریخی افادیت عرض کردی جائے اس صورت میں اصلاحات کا کوئی بنیادی خاکہ عرض کیا جاسکیگا۔

موجودہ امت اسلامیہ کے عناصر ترکیبی

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ "اسلام نام تھا" کامل ترین توحید خدا کے اعتقاد سے پیداشدہ اس عالم گیر اخوتِ انسانی کا کہ جو تصرف فی الکائنات کو اپنا اخلاقی حق اور اخلاقی فرض سمجھتی تھی یہ وحدت حقیقت میں تین وحدتوں (تعلقِ خدا، تعلق نوعی اور تعلقِ ارضی) کا مجموعہ تھی۔ اسی مجموعے کو خلافت خداوندی کہا جاتا ہے ان تین وحدتوں کو ایک ربط و نظم میں جماعتی انداز پر سمو لینا

کی حیثیت سے انسان کی تاریخ حیات کے ابتدائی دور سے آج
تک چلا ہے، اُسے سامنے رکھتے ہوئے امت اسلامی کا تسلسل دورِ
ملوکیت میں بھی کائناتِ انسانی کے توازن کا مرکزی عامل رہا ہے
لہٰذا میں اس کے وجود سے مطلق انکار نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن جب
دورِ ملوکیت کی غلطیوں کا ذکر کر رہا ہوں تو یہ غلطیاں امت کی
اس نصب العینی حالت کے مقابل ہیں کہ جو نصب العین حالت محمدؐ سے
شروع ہو کر خلافتِ راشدہ کے خاتمے پر ختم ہوئی۔ اس دور کی مرکزی
غلطی وہی ہے کہ جس میں اسلام سے پہلے ساری دنیا گرفتار تھی۔ یعنے
اصولی اتباع اور شخصیت پرستی میں فرق کرنے کا مادہ بتدریج امت
میں سے گم ہو گیا اور یہ صرف اس لئے ہوا کہ نوعِ انسانی کی خالص
انسانی تنظیم کا نصب العین۔ منصبِ خلافت۔ آنکھوں سے پھر اوجھل
کر دیا گیا تھا۔ چونکہ ملوکیت نے اصولی تنظیم کے نصب العین یعنے منصب
خلافت کو ختم کر دیا تھا، لہٰذا کچھ عرصے بعد امتِ اسلامیہ کے
حافظے میں سے اسلام کی اصولی زندگی کا تصور گم ہونا شروع ہو گیا
اور مختلف فقیہانہ نوعیت کی رخصتوں اور گنجائشوں کا سہارا لیکر
تنظیم امت کی اُس بلاریب منزل کردہ حالت کے لئے جواز کی شکلیں
پیدا ہوئی کہ جو خلافت کے ختم ہونے کے بعد رائج ہو چکی تھی۔ خلافت
راشدہ کے بعد پوری اسلامی سوسائٹی نے توحید، واخوت وخلافتِ
ارضی کے تینوں اصولوں کی معیاری شکل سے یک قلم انحطاط کیا اور

فرض قرار پایا۔ یہ ہیں اس مقدس وحدت کی اجزائے ترکیبی کے نمایندے کہ جس مقدس وحدتِ انسانی کا نام اسلام تھا (خلافتِ علی منہاج النبوۃ اس وحدت کا جسم تھا) اور جو آج تک صرف ایک اضافی شکل میں چلا ہے۔ دورِ ملوکیت تک تو امتِ اسلامیہ کی یہ اضافی حالت بھی باقی اقوامِ عالم کی حالت سے افضل رہی مگر عالم گیر جمہوری دور کے آغاز کے بعد اس کی یہ اضافی برتری بھی ختم ہو چکی ہے۔ صرف انفرادی اعتقاد و عمل کی سطح پر امتِ اسلامیہ کے افراد آج بھی افضل ہو سکتے ہیں مگر ان کا معاشی معاشرتی و سیاسی نظم مطلقاً اپنی افادیت و برتری کے مقام کو کھو چکا ہے۔ گذشتہ دو سو برس سے امتِ اسلامیہ کے روبانحطاط ہونے کا مرکزی سبب صدر میں عرض کیا جا چکا ہے اب اگر امتِ اسلامی پھر کبھی اپنے مرکزی مقام پر آسکتی ہے تو وہ اپنی معاشی و معاشرتی و سیاسی تنظیم کو موجودہ شکل سے یکسر بدل کر اُسے خلافتِ راشدہ کے رنگ پر لانے سے ممکن ہے۔ اس کی اور کوئی صورت نہیں۔

امت کے تینوں عناصر ترکیبی کی اپنی معیاری حالت سے گراوٹ

عالمِ انسانی کی مذہبی زندگی کا تسلسل جس طرح ایک متوروقت

دین اسلام مطلق نہیں کہ جو تمام صفات الہٰی کے مجموعی تقاضوں کا کلی نظام ہے۔ کتاب کے دوسرے باب کے خاتمے پر ان کا مختصر مگر جامع بیان آگیا ہے) انسان کی جو عملی و اعتقادی زندگی کے کسی ایک پہلو کو بھی اپنی گرفت سے آزاد نہیں چھوڑتا مگر دورِ ملوکیت کے اجرا کے بعد وہ روحانیت کے کوچے میں عشق و معشوقی کے کوچے کا ایک محبوب ہو جاتا ہے جسے محبت کے والہانہ جذبات کے ساتھ یاد کر لینے کو کمالِ عبودیت سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ قرآن کی زبان میں یہ کوئی مقام نہیں اور اگر ہے تو یہ اربابِ عزیمت کا مقام ہرگز نہیں۔ اور قرآن کے تمام احکام اربابِ عزیمت و جہاد سے تعلق رکھتے ہیں اربابِ رخصت کے وجود کی قانونی ضرورت قرآن یا دورِ محمدی میں موجود نہیں اسکی حیثیت تو صرف ایک قانونی استثنا کی ہے لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا توحید کا اسلامی اعتقاد بالکل عیسائیت کے انداز کی توحید سے بدلتا گیا۔ بلکہ آگے چل کر اس نے فلسفیانہ تصورات کی شکل اختیار کر لی اور اسلامی عقائد میں بھی وجودیت و شہودیت، حلولیت و اتحاد وغیرہ قسم کے تصورات نے راہ پائی۔ اس کا سب سے آخری نقطہ یہ ہے کہ جہاں سے اللہ تعالیٰ کا جامع جمیع صفات کمال نصب العین تصور گم ہو کر پیر پرستی و شخصیت پرستی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مقام پہ پہنچ کر اسلامی تصوف و روحانیت بتدریج نصاریٰ کی احبار و رھبان پرستی کے مقام پر آجاتا ہے۔ جیسے، ابنیتِ خدا کا اعتقاد

تینوں دائروں میں اصل دین اور ساری اخلاقی و روحانی و معاشی و معاشرتی عزیمتوں سے تنزل کرتے ہوئے تینوں اصولوں کو ان کے معیاری مقام سے رخصت و استثنا کے مقام پر لا کر چھوڑا۔ میں اس وقت ایک عجیب سی بظاہر ناقابلِ فہم پوزیشن کو سمجھا رہا ہوں۔ لہٰذا ایک صاف فقرے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امتِ اسلامیہ کا دورِ ملوکیت میں بھی اقوامِ عالم کے مقابل ایک بلند مقام ہے۔ لیکن اپنی معیاری حالت کے مقابل وہ توحید و اخوت و خلافت کے تینوں اصولوں میں اتنا تنزل کر چکی ہے کہ اس کے مقابل خلافتِ راشدہ مقامِ عزیمت و اظہار ہے اور یہ حالت خلافت راشدہ کے مقابل قطعاً رخصت و تاویل ہے۔ اپنے اصل کے مقابل اس کی افادیت بالکل جزوی سی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً محمدؐ کا اللہ رحمٰن و رحیم و رب و رءوف و غفار سے شروع ہو کر بتدریج قہار و جبار و حاکم علی الاطلاق بھی ہے (جو لوگ آج کل یا اس سے پہلے صرف صفتِ حاکمیت کے ماتحت اللہ کا کلی تعارف کراتے رہے ہیں اور اسی کی روشنی میں سارے اوامر و نواہی، کہ جو اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے مطالبات ہیں کی تشریح کو ممکن جانتے رہے ہیں وہ پہلے بھی ملحد ہیں تھے اور آج بھی ملحد ہیں ان مکاتبِ خیال کو فلسفیانہ مکاتبِ خیال کہنا تو جائز ہے جو کسی ایک صفتِ خدا کو اپنے لئے ایک اصل موضوع قرار دے کر اس پر ایک فلسفیانہ فکری نظام قائم کرتے ہیں مگر وہ

خلافت کی عبا اوڑھ کر ملوکیت، اسلامی سوسائٹی میں گھستی ہے اور مختلف مراحلِ حیات طے کرنے کے بعد "السلطان ظل اللہ" کا حق لیکر سماعت و اطاعت کو اپنے لئے مخصوص کراتی ہوئی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا دائرۂ سیاست میں بھی توحید کا اعتقاد ناپید ہو کر شخص اقتدار کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی ملوکیت قرآن سے تو صرف "سماعت و اطاعت" کے حوالے کو لے لیتی ہے اور روایات میں سے "ظل الاہیت" کو اپنا دین کامل بنا لیتی ہے۔ بعد میں اگر بعض اچھے سلاطین ہوئے تو وہ ان کی ذاتی خوبی تھی، وہ شورائیت ملت کی پیداوار نہ تھے۔ ملتِ اسلامی کی روحِ شورائیت کو تو ختم کر دیا گیا اور اس کے مقام پر ہر دائرۂ حیات میں شخصیت پرستی کو اس طرح رائج کیا گیا کہ دو چار سو برس کے بعد ملوکیت شورائیت کے احیائے جدید کے خوف سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔ روحانی دائرے میں ابتدا میں تو شاید چند شخصیتیں اور بعد میں خود شخصیت کو ایک اصل تسلیم کر لیا گیا۔ ۵

ذاتِ پیرے را تو چوں کردی قبول
ہم خدا آید بذاتش ہم رسول

ایک مسلم الثبوت کتابِ تصوف۔ مثنوی رومی۔ کا شہرۂ آفاق اصول ہے۔ سیاسی دائرے میں اگر توحید کا کوئی اثر رہا تو وہ محض

اگر نہ بھی کہا جائے لیکن اسے فی الجملہ حلولیت سمجھنا بالکل واقعہ ہے۔
سیاست کے کوچے میں بھی توحیدِ اسلامی کا جو اثر رہجاتا
ہے وہ یہ ہے کہ بالکل قیصر و کسریٰ کے انداز کی نسلی ملوکیت
پر ابتداءً تو خلافت کا لفظ اوڑھا دیا جاتا ہے اور دوسرے
درجے پر اسے "السلطان ظل اللہ" بنا کر قرآنی سماعت واطاعت
کو اس کے لئے مخصوص حق کی حیثیت میں محفوظ کرا لیا جاتا ہے۔
صحیح اصولِ خلافت کے ماتحت ایک خلیفہ صرف منشارِ خداوندی اور
فلاحِ انسانی کے قوانین کے نفاذ کی ایجنسی کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے
محض اس حیثیت میں سماعت و اطاعت کا اس سے تعلق تھا لیکن
جب آکی یہ حیثیت مشتبہ ہوجائے تو اُسے ختم کر دیا جاسکتا تھا۔
خلافت ہرگز ایک شخصی عہدہ نہیں جیسا کہ بلا اختلاف آج تک
سمجھا گیا ہے۔ یہ عہدہ بنی نوعِ انسان کی نوعی خصوصیت ہے اور
چونکہ حیاتِ انسانی ایک مخصوص انداز کے تعاون کے علاوہ نہیں
چل سکتی کہ جس کیلئے ایک تنظیم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا صرف اسی
تنظیمی ضرورت کے ماتحت نوعِ انسانی کے خود آگاہ طبقے کو حق
دیا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کی طرف اس حق کی مرکزیت
کو سپرد کر دیں۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ انسانی خود آگاہی کے مبلغ
ہیں اسلیئے وہ ایک قدرتی انداز سے اس مرکزیت پر آجاتے ہیں
لیکن باقی کے لئے یہ چیز ہر اسٹیج پر شورائیتِ ملی کا حق ہے بہرحال

موقف کے تنزل کے اعتبار سے علما کی بھی ہوئی جس طرح چند رخصتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطانی و خانقاہیت نے اپنے موقف کی دینی حیثیت کو صحیح تسلیم کرایا بالکل اور بلا ایک نقطہ مبالغے کے علما نے بھی انھیں رخصتوں کی تلاش میں "محکمات قرآنی" کے بجائے روایات کی تلاش شروع کی۔ ہمارا عمرانی مورخ تدوین و تشریح و اشاعتِ روایات کے اسباب معلوم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مگر صدر میں عرض کئے ہوئے تاریخی تجزیے کے بعد تاریخ انسانی سے مس رکھنے والے اشخاص کیلئے اس کے اسباب کا سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ جب سوسائٹی بحیثیت مجموعی "محکماتِ قرآنی" کی سطحِ تنظیم سے گرادی گئی۔ اور حسینؑ ابن علیؓ کی قسم کی مساعی بھی عملاً اُسے اپنے اصل مقام کی طرف نہ پلٹ سکیں تو اب دینی احساس رکھنے والوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی شکل ممکن نہ تھی کہ وہ اُسے کلی انار کی سے بچانے کے لئے عزیمت کے پہلو کے بجائے رخصت کے مقام پر ہی بچالیں۔ یہاں پر روایاتِ دین کی ترتیب و تنظیم و تشریح کا آغاز ہوا اور محکماتِ قرآنی کی عملی قدر وقیمت نہایت درجہ جزوی رہگئی۔ ان محکمات کو ابتداءً تو ترتیب دادہ روایات اور ان کی جزوی قسم کی تشریحات کا پابند کیا گیا اور اگلے قدم پر خود یہ روایات بھی ایک ایسے نظامِ فقہ

"سماعت واطاعت" کا قرآنی حوالہ اور "ظل اللہ" کی ایک روایت
تھی۔ اب اس قطب شمالی اور اس قطب جنوبی کے اس طرح
متعین ہو جانے کے بعد علما کے طبقے کی حیثیت کا سمجھنا آسان
ہو جاتا تا علما کا طبقہ سلطانی اور خانقاہیت کا درمیانہ جوڑ رہے
ان میں اکثر اوقات بلاشک ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں
نے وقتی طور پر سلطانی اور ملوکیت دونوں کو نظر انداز کرتے
ہوئے اپنے لئے ایک مستقل موقف پیدا کرنے کی کوشش کی مگر
ایسے افراد نہایت محدود ہیں اور ان میں سے بھی اکثر کی مساعی
امت اسلامی کی علمی مساعی کے دائرے میں شمار ہو سکتی ہیں دین
کو اپنی اصلی شکل میں ایک نظم کے رنگ میں سلطانی سے لیکر خانقاہیت
تک پر یکساں حاوی کرنے کا مقصد اس دور میں کسی کے بس کا روگ
نہ تھا۔ لہذا علما کا اپنا علمی موقف عموماً کوئی نہ تھا وہ اس بحرانی
حالت میں کبھی خانہ نشین اور کبھی امرا و سلاطین کے رفقا ہو جاتے
البتہ تحفظ روایات کے رنگ کی ایک مشغولیت انھوں نے
بھی اختیار کر لی تھی۔ اپنی افادیت و صحت و سقم کے اعتبار سے
یہ تینوں طبقے بالکل ایک وزن و ایک قسم کی قدر و قیمت رکھتے
رہے۔ لہذا جس طرح آپ دیکھ چکے ہیں کہ توحید کا اعتقاد کس
طرح خانقاہیت و سیاست کے دائرے میں کمزور ہوتے ہوتے
شخصیت پرستی [illegible]

رخصت و تاویل میں پیش کر سکتی ہے۔ جو عیسائیت کا نقطۂ ارتقا ہے وہ امت اسلامیہ کا نقطہ تنزل ہے۔ یہ ہے وہ اضافی فضیلت جو تمام ملوکی دورِ تاریخ میں امتِ اسلامیہ کو حاصل رہی اور جس کے باعث اُسے ہر پہلو سے باقی دنیا پر ایک فوقیت حاصل رہی۔ لیکن یہ فضیلت جمہوریت کے اصول کے عالمگیر طور پر تسلیم ہو جانے کے بعد اقتصادی و سیاسی دائرے میں تو امت سے یکسر چھن چکی ہے جس کے بعد اگر وہ اجتماعی طور پر کسی ایسی دوسری عالمگیر قوت سے مغلوب ہو جائیں کہ جو سیاسی و اقتصادی نظم میں اُن سے بہتر ہو تو اس میں کوئی تعجب نہ ہوگا۔ ہاں اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ اگر اُسے اس امت کو بیدار کرنے کے لئے کسی وقت ایسا ہی کرنا ہے تو پھر وہ قوت کمیونزم اور ایشیا کی بت پرستی نہ ہو اس لئے کہ کمیونزم تو انسان کی نفیٔ تام کا نام ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اس وقت تک خالص انسانی عمرانِ نوعی کے نقطۂ نظر سے کمیونزم کو کسی نے سوچا ہے۔ اس لئے کہ بہت سے بڑے بڑے مذہبی مفکرین نے کمیونزم کو صرف باطل خداؤں کی نفی کے ہم وزن ٹھہرا کر نتیجے خدا کے اثبات کے ایک بڑے امکان کی پیشنگویاں کی ہیں۔ حالانکہ کمیونزم یعنی "مارکس اینگلز ازم" کو باطل خداؤں کی نفی سے اتنا سروکار نہیں کہ جتنا بے شعور مادے کو ہمہ گیر خدائے مطلق کے مقام پر قائم کرنے کا شوق ہے۔ اس کا

سے بدل دی گئیں کہ جس کا محکماتِ قرانی سے بہت دور کا واسطہ تھا۔ بالکل اتنا ہی واسطہ کہ جتنا صوفیوں کی شخصیت پرستی و پیر پرستی کو آیت "وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ" سے ہے۔ یا جتنا جابر سلاطین کے اقتدار کو" ایت اولی الامر" سے ہے۔ تیسرے قدم پر اس دائرے میں بھی صرف وہی شخصیت پرستی رہ جاتی ہے تقلید شخصی اسی کا آخری قدم ہے۔ یہ تقلیدِ شخصی کا اصول بھی درحقیقت ہزاروں علما و فقہا کی تقلیدوں کا مجموعہ ہے۔ دورِ اول میں امتِ اسلامیہ میں روایات پرستی سے اور ان کی تدوین وغیرہ سے اجتناب اور بعد میں اسی کام کے مرکزی دینی کام بن جانے کی تاریخی تشریح یہ ہے۔ گویا توحید کی ہمہ گیری کے گم ہونے کے باعث امت تین مستقل دائروں میں بٹ گئی جن میں جز و مشترک اور اساس وحدت یکسر گم ہوتا گیا۔ محمد رسول اللہؐ نے تاریخ انسانی کی تمام قوتوں کو اصولِ خلافتِ انسانی پر سمیٹ کر جس طرح ایک ہمہ گیر وحدت و نظمِ انسانی کا سلسلہ قایم کیا تھا وہ پھر سے تین مستقل دائروں میں بٹ گیا۔ ممکن ہے کوئی من چلا اسے تقسیم عمل سے تعبیر کر بیٹھے مگر یہ خود فریبی ہے یہ امت کا مقام عزیمت سے گر کر رخصت و تاویل کے مقام پر آجانا ہے۔ لیکن اس پر بھی باقی تاریخ عالم کے مقابل امت کے نظم کو یہ اہمیت حاصل رہی کہ عیسائی سوسائٹی کا جو نقشہ مقامِ عزیمت پر عملاً پیش کر سکتی ہے وہ امتِ محمدیہ مقام

کے اس بنیادی منصوبے کو گذشتہ ۱۲ سو برس کی تاریخ امت میں ایک تعمیری ادارے کی شکل میں عملاً تلاش کیجئے تو آپ کو اس کا نام و نشان بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ اس کے مقابل امت کے تمام پڑھے لکھے طبقے سے آپ شخصی مجدد کے متعلق سوال کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سو فیصدی لوگ اس سے آگاہ ہیں۔ اب "شاورھم فی الامر" اور "امرھم شوریٰ بینھم" کے مقابل اس تجدید شخصی کی اصل تلاش کیجئے تو آپ کو دوسرے اور تیسرے درجے کے روایات میں یہ مشکل اس کا پتہ چلے گا۔ یہ تھا وہ شخصیت پرستی کا بھوت کہ جو خلافت راشدہ کے بعد امت پر مسلط کر دیا گیا۔ اور اس بات کے لئے دینی اساس دریافت کرنے میں ساری روایات کو چھان کر کچھ نہ کچھ مواد جمع کر لیا گیا۔ کائنات انسانی کی تو آخری پرواز ہیرو پرستی اور گرو پرستی و پیر پرستی آج تک ہے۔ امت اسلامیہ کا عمل اس کے مقابل جتنا محتاط رہا ہے، مجھے اس سے انکار نہیں۔ مجھے ایسی چند شخصیتوں کی مساعی کی دینی افادیت سے بھی انکار نہیں۔ کہ جنھوں نے آڑے وقت ملت کے تسلسل حیات کے لئے زندگیاں وقف کیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے کہ ایک طرف دین کو اس کی معیاری حالت میں بحیثیت مجموعی سمجھ لوں اور دوسری طرف تاریخ انسانی پر ایک اجرائی اور اشتمالی شکل میں اس کے عمل کو دیکھ سکوں اور اس طرح ہدایت و ضلالت انسانی کے علمی و عملی دونوں پہلوؤں

انجام صدر میں عرض کر آیا ہوں۔ چونکہ مغربی امپیریل ازم کے مقابل فرط انتقام سے مسلم اقوام کے کمیونزم سے ہم نوا ہوجانے کا بڑا امکان پیدا ہوچکا ہے لہذا خود مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس پر متنبہ کرنا ضروری ہوگیا۔ ورنہ میں اصل بات یہ عرض کر رہا تھا کہ جمہوریت کے اعتقاد کے عالم گیر ہو جانے کے بعد امت اسلامیہ کی سیاسی و اقتصادی فوقیت گم ہوچکی ہے۔ لہذا جب تک وہ اپنی اصل سے مربوط ہونے کی کوئی عالمگیر کوشش نہیں کرتے تب تک ان کا اس مقام پر آنا ایک وہم و پندار ہے۔ امت اسلامیہ کے جن موجودہ عناصر ترکیبی کا تجزیہ صدر میں عرض کیا گیا ہے اور جو مختلف منازل الخطاط طے کرتے ہوئے سیاست و روحانیت و مذہب کے تینوں دائروں میں اب شخصیت پرستی پر قانع ہوچکے ہیں ان سب کی ایک مشترکہ غلطی "امرہم شوریٰ بینہم" کے اٹل، ابدی اور محکم قرآنی قانون کے مقابل "شخصی تجدید دین" کو ایک اصل ثابت کی طرح تسلیم کر لینا ہے۔ اگر منطقیانہ زبان میں امت اسلامیہ کی جنس کو توحید کامل قرار دیا جائے تو اس کی فصل "شورائیت" ہوسکتی ہے۔ ذرا قرآن مجید کی تعلیم پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ کس طرح نبی آخر الزماں کو "شاورہم فی الامر" کا پابند کرتا ہے۔ اور اس نے کس طرح ایک اطلاقی رنگ میں امت کا خاصہ "امرہم شوریٰ بینہم" کو قرار دیا ہے اب تنظیم و تدبیر امت

شبہ اس وقت ملّت اسلامی کے مرکزی عناصرِ ترکیبی کے تینوں دائرے اپنے اعمال اور اعتقاد کے استناد میں صرف ایسی ہی دور از کار تاویلات اور ضمنی رخصتوں پر قائم ہیں۔ انہیں سے ہر دائرہ حیات کی عزیمتیں اصل دینی اصول اور قرآنی محکمات یکسر خارج از اعتقاد و عمل ہیں۔ آج کل تمسک بالقرآن کی طرف جو رجحان پیدا ہوا ہے محض علمی رجحان ہے۔ عملی ہتیا بی نہیں۔ ان رجحانات میں قرآنی اصولوں کو عملی نظریات کا درجہ دیا جاتا ہے اور ان پر ایک ٹھیک انداز کا کام کرنے کی راہیں پیدا کی جاتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی ملّت کے اندر کوئی ایسا رجوع پیدا نہیں ہوا کہ جو ایک طرف حسبنا کتاب اللہ" کہے اور دوسری طرف "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ" پر یقین رکھے۔ امت اسلامیہ کے دینی ضعف میں اور سابقہ امتوں۔ مثلاً عیسائیت ۔ میں دو فرق ہیں۔ ایک وہی جو عرض کر آیا۔ یعنے یہ کہ امتِ اسلامی دور از کار تاویل کرنے کے بعد جس مقام رخصت و تنزل پر پہنچی ہے سابقہ امتیں اپنے مقام عزیمت میں بہ تشکل وہاں پہنچی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام اقوام کے قرآن مجید" (یعنے اصولی تعلیں) ناپید ہو گئے ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ ان کے انبیا کی بخاری و مسلم و ہدایہ و کفایہ ہیں۔ ان کا قرآن ناپید ہے لیکن امتِ اسلامیہ کا قرآن مجید موجود ہے۔ (اس کی پوری تاریخ (تاریخ کا لفظ یاد رہے۔ روایات کا درجہ تاریخ القرآن۔

پر بھی کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔ لہذا یہ تنقید یا انکشافِ احوال تودین کے اصل معیار سے مقابلہ کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ میں اصل میں تدبیر وتقویم ملت کی مرکزی ایجنسی کو بچے بچے کے دل نشین کرنے کے لئے درمیانی روکاوٹوں کو دور کر رہا ہوں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جس طرح تقدیرِ ملتِ اسلامیہ توحید واخوت وخلافت کے جامع ومانع تین اصول ہیں شخصیت پرستی نہیں۔ اسی طرح تدبیرِ ملت کی بنیادی ایجنسی اور ذریعہ شورائیت ہے۔ چونکہ شورائیتِ ملت کے اصل کو دائماً بر بیرِ عمل ماننے کا نتیجہ شخصی اقتدار کے ابدی خاتمے کے علاوہ اور کوئی پھل نہ دلیکتا تھا۔ لہذا اُسے ملوکیت کے دھارے کی مجموعی قوت نے غایت درجہ مستور کرنے کی ہر تدبیر کی۔ اس کے مقابل اگر بعض مقبول انسانوں کی دینی مساعی کے متعلق خاتم النبیینؐ نے کہیں کوئی اشارہ فرمایا تھا تو اُسے ایک اصلِ ثابت بنا کر امت کے پورے نظامِ اعتقاد پر حاوی کر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ "شورائیت" کے مقدس فریضے کو جب تک کسی "مقدس بدل" سے نہ بدلا جاتا تو یقیناً امت اپنی تدبیر میں شورائیت کی طرف کبھی نہ کبھی ضرور متوجہ ہوتی۔ لیکن جب اس کا ایک "مقدس بدل" قائم کر دیا گیا تو ظاہر ہے کہ شورائیت کی طرف سوائے غیر معمولی حالات پیدا ہونے کے توجہ کرنے کی ضرورت ہی کب ہوتی۔ یہ تھا شخصی اقتدار کے ہر دائرہ حیات میں غالب آجانے کا تدوینِ دین پر اثر۔ بلا شک و

وظائف و ہدایا (جاگیروں کے ذریعہ سے بعد میں اربابِ خانقاہ کو بھی اپنا ہمنوا کر لیا اور اس طرح "من ترا ملا بگویم تو مرا حاجی بگو" کی کیفیت سی پیدا ہو گئی جس کے باعث انھوں نے اپنے اپنے حلقے میں ایک دوسرے کی واقعیت کو تسلیم کر لیا۔ مگر اپنی اندرونی ساخت میں یہ لوگ ایک دوسرے کی ضد رہے ہیں۔ تیسرا حلقہ علما کا تھا کہ جو بجائے خود بھی ایک ویسا ہی خودکفیل طبقہ تھا کہ جیسے پہلے دو طبقے تھے۔ لیکن اپنے عملی سلسلے میں انھوں نے ان دونوں کے درمیان ایک رابط کا کام ضرور دیا۔ وہ اپنے سلسلۂ روایات کو اپنے دائیں بائیں دونوں حلقوں پر لبقدر استعداد حاوی کرتے رہے۔ مگر اپنی عملی قوت کے لحاظ سے دونوں سے زیادہ کمزور تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر حسین ابن علی کی کوشش اپنے ظاہری نتائج کے اعتبار سے ناکام نہ ہوتی تو شاید خانقاہیت پیدا ہی نہ ہوتی اور اگر یزید ابن معاویہ اپنے منصوبے میں سو فیصدی کامیاب نہ ہوتا تو شاید ملوکیت میں بھی بڑے عرصے تک مطلق العنانی نہ ہو سکتی بلکہ خلافت علی منہاج النبوت کا سلسلہ دیر تک چلتا۔ مگر حسینؓ ابن علیؓ کی کوشش کے کاملاً ناکام ہونے سے سیاست کے میدان میں اخلاص باللہ کے جذبے کے لئے قدم دھرنے کی جگہ نہ چھوڑی نتیجے میں ترک و تجرید کا وہ سلسلہ پیدا ہوا جسے فقرا و صوفیا کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ ان دو انتہا پسندیوں (یعنے ملوکیت و اربابِ ترک و تجرید کے عمل) نے ایک تیسری حدِ اوسط کا پیدا کرنا ضروری کر دیا

کا درجہ ہے) موجود ہے۔ جس کی طرف کسی وقت بھی امت رجوع کرکے پھر مقام عزیمت پر آسکتی تھی۔ اس کا تفرقہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کا حقیقی اتحاد بحال کیا جاسکتا ہے۔

تفرقہ امت کی نوعیت

توحید و اخوت و خلافتِ ارضی کے جس باہم مربوط نظم و ضبط یعنے خلافتِ الٰہی کو ملوکیت نے توڑ کر مستقل من تین حلقوں۔ اربابِ سیاست، اربابِ روحانیت اور حاملین روایات ـــ میں تقسیم کردیا تھا، وہ اپنی اندرونی ساخت میں بالکل خودکفیل انداز کے بذاتِ خود جامع و مانع سے حلقے بن گئے ہیں۔ ان میں بہت ہی کم مابہ الاشتراک باتیں رہگئی ہیں۔ خاص کر اربابِ خانقاہ اور اربابِ سیاست میں تو کوئی چیز مابہ الاشتراک بظاہر ہے ہی نہیں۔ ایک ترک ماسوی اللہ (اگرچہ یہ ترک ماسوی اللہ آج صرف زبانی زبانی دعویٰ ہے ورنہ آج کا خانقاہی تو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سود خوار مہاجن سے بھی زیادہ دنیا پرست ہے۔ ایک سود خوار مہاجن کچھ نہ کچھ دنیا کے لئے کرتا ہوا روپے پر نظر رکھتا ہے۔ مگر موجودہ خانقاہی تو جس سے روپیہ کماتا ہے اس کا دین بھی برباد کرتا ہے) تو دوسرا تلاش ماسوی اللہ۔ چونکہ خانقاہیت، ملوکیت و شہنشاہیت سے ایک کلی ردعمل سے پیدا ہوئی ہے اسلئے دونوں میں اصولاً ایک تخالف کا ہونا قدرتی بات تھی۔ اگرچہ ملوکیت نے اپنے

کا وہ دور منتظر آج ہے کہ جب عالمگیر جمہوریت نے شخصیت
پرستی کی بنیادی اینٹوں کو بھی اکھاڑ پھینکا ہے اور اخلاقی و
روحانی احساس رکھنے والی ساری انسانی برادری کے لئے خدا و
آئینِ خدا کو اصولی شکل میں سمجھنے اور اس پر چلنے کی ساری راہیں
کھولدی ہیں۔ لہذا اگر آج امت اسلامیہ اپنے اصل کی طرف رجوع
کرتی ہوئی اپنی تنظیم کو محمدی انداز پر درست کرتی ہے تو اگلے دس
تیس برسوں میں پورے ایشیا و افریقہ پر اسلام کا تسلط ہو جاتا ہے
لیکن اگر چھوٹی تاویلیں گھڑ گھڑ کر وہ اپنی موجودہ حیثیتِ عرفی
اور موجودہ تنظیم اور موجودہ جائدادوں کی حفاظت پر مولویوں
سے فتویٰ ہائے جہاد لیتی رہی تو اس کے لئے سارے عالم میں تائید
خدا کی راہیں اسیطرح بند کردی جائیں گی کہ جس طرح ہندوستان
کی سرزمین میں اس کے لئے تائیدات کی ساری راہیں بند کردی گئی
ہیں اور وہ سرزمین کہ جس پر مٹھی بھر مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا
اور اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنظیم جدید دی تھی
اس سرزمین پر دس کروڑ کو منظم کرنے پر بھی انھیں قدم رکھنے کو
جگہ نہ دی گئی اور انھیں بھاگنا پڑا۔ جب افراد و اقوام پر سنبھلنے
اور بننے کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں محاسبۂ نفس کی قوت
و بصیرت پیدا کرتا ہے اور اپنی غلطیوں کو معلوم کرنے ان کا اعتراف
کرنے اور ان کی درست کرنے کی توفیق دیتا ہے اور جب افراد و

یہ حد اوسط علما کا طبقہ تھا۔ جو آج تک عملی طبقے کے بجائے علمی حیثیت کی چیز رہی ہے۔ مگر انھوں نے امت میں مزید انتشارِ عظیم پیدا ہونے سے ایک روک کا کام بھی کیا ہے۔ لیکن عملاً ان کے پاس اس وقت جو کچھ ہے وہ قرآن اور اس کے محکمات و ام الکتاب کا علم ہرگز نہیں اس لئے کہ یہ جبرئیل امین کے ہاتھوں کی بُنی ہوئی عبا جس جماعتی حیات پر چپت بیٹھتی تھی وہ تو آخری دفعہ حسینؓ ابن علیؓ کے ساتھ میدانِ کرب و بلا میں تہ تیغ کردی گئی تھی۔ البتہ اس کتاب مبین کے جو ستنے ستائے بین السطور بعد میں ہاتھ آئے ان کے توسط سے گرمیٔ محفل کی فی الجملہ بقا کا سامان کیا گیا اور "کان خلقہ القرآن" کی جبرئیلی عبا کو پوری دیانت اور دہشت انگیز ادب و تعظیم کے ساتھ آج تک محفوظ رکھ دیا گیا ہے۔ اس امید پر کہ شاید کوئی وقت آئے اور فضا ساز گار ہو۔ تو اُسے پھر جسدِ انسانی پر چپت کیا جائے۔ محمد رسول اللہ کی امت باقی امتوں کے مقابل اس لئے ترجیح یافتہ نہیں کہ انھوں نے اصل حالت سے رجعت قہقری نہیں کی بلکہ اس سبب سے ہے کہ ایک تو اس کا اصل نسخۂ ہدایت ضائع نہیں کیا گیا دوسرا اسی کی برکت ہے کہ وہ اپنے تنزل میں بھی اپنے اعتقاد و عمل میں اس درجہ پر قائم ہے کہ جو سینٹ پال اور ان کے رفقا کا آخری ترقی یافتہ قدم تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں اور تاریخ انسانی کا عالمگیر دھارا میری تصدیق کرتا ہے کہ "رجوع الی القرآن" یا "رجوع الی محکمات القرآن"

گروہ قائم ہو رہے ہیں، اس امت کے اپنے حقیقی مقام کے اعتبار
سے مجھے وہ محض خود فریبی کے درجے کی چیزیں محسوس ہوتی ہیں، ان
سے نہ تو امت کی اندرونی مشکلات کا کوئی حل سوجھائی دیتا ہے
نہ اس طرح روس و امریکہ کی کشمکش میں امتِ اسلامیہ مرکز توازن
بن سکتی ہے۔ شاید اپنی ہستی ہی کو اس بحران میں کھو بیٹھے۔ ان
سارے مسائل کو حقیقی شکل میں حل کرنے اور امتِ اسلامیہ کو پھر
تاریخ انسانی کی قوتِ توازن بنانے کے لئے ایک عالم گیر
شورائیت علما و فقہا و سیاسین و صوفیا کرتے ہوئے امتِ
اسلامی کی مرکزی و تنظیمی اساسوں کو معین کرنا ہو گا۔ سارے
سلسلۂ روایات کو ایک طرف رکھتے ہوئے "قرآنی محکمات" اُم الکتاب
کو چند صفحات میں متعین کرتے ہوئے تمام علما و علمائے امت کی
تائید سے اُسے امت کے سامنے عملی اتفاق کے لئے پیش کرنا ہو گا
اور اس کو کم از کم ساری ایشیائی افریقی اقوام کے سامنے
بھی بطور دعوت پیش کرنا ہو گا۔ انشاءاللہ اس طرح یہود کا
ہندوستان کا اور افریقہ کی نئی ابھرتی ہوئی قوموں کا مسئلہ چند
برسوں میں حل ہو گا اور انڈونیشیا سے مراکش تک تاریخ انسانی
کا ایک نیا مرکزِ عدل و توازن قائم ہو گا اور اگر یہ واقعہ ہے کہ
چین روسی امپیریل ازم کا جزو نہیں اور وہ بھی سچ مچ کسی نئی
اساسِ تعمیر کی تلاش میں ہے جیسا کہ بہت سارے ہندوستانی

اقوام پر بربادی کا وقت آتا ہے تو ان کی نگاہوں سے ان کی بیماریاں اور کمزوریاں چھپ جاتی ہیں اور ریاکاری وخود نمائی جھوٹ اور مغالطہ دہی مغالطہ خوری کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ آج امتِ اسلامی کے فرد، فرد اور طبقے طبقے کو اسی شدید محاسبۂ نفس کی ضرورت ہے۔ امت اسلامیہ کا موجودہ وقت کا انتشار اس کی تمام تدبیروں کی ناکامی اور اس کا ہر جگہ مصائب میں گھر جانا، جماعتی رجوع الی اللہ چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ آج ہر جگہ مسلمانوں کے تمام منصوبوں کو اس لئے ناکام کر رہا ہے تاکہ وہ پھر "کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر .... کے مقام پر آئیں۔ آج اگر وہ ایک جانبازکوشش کرتے ہوئے قرآن پر سمٹ کر اپنی سیرت و کردار کو ایک یقین کی اساس پر مستحکم کرتے ہوئے پھر زندگی کو "تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" کا مصداق بناتے ہیں تو وہ امن عالم کے داعی بن جاتے ہیں لیکن اگر محض جائدادوں پر حق ثابت کرنے کے لئے جہاد کے فتوی خریدنا چاہتے ہیں تو اب نہ تو خدا اور نہ انسانیت ان کے دھوکے میں آئیں گے۔ البتہ شترمرغ کی طرح اپنے نفس کو دھوکہ دینے میں وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ امتِ اسلامیہ میں موجودہ وقت میں جس طرح محض سطحی سی سیاسی تنظیمیں ہو رہی ہیں یا جس طرح مذہب کے نام پر چھوٹے موٹے

بڑی انسانی بدقسمتی ہوگی۔ لیکن اس کے مقابل اگر اسی انقلاب مشرق کے گروہ کے ہاتھوں میں ایک خدا' ایک انسانی بھائی چارے اور خلافتِ انسانی کا محمدی پلین ایک واضح اور معین شکل میں آجائے تو کیا عالمگیر انقلاب میں کوئی شک رہجاتا ہے؟ ہندوستان میں ہزاروں برس سے بت پرستی و نسل پرستی اساس تمدن و مذہب بن گئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس ملک کی ایک ایسی خصوصیت بھی ہے کہ جسے آج کی فضا میں عالم انسانی کی بڑی بھاری خدمت میں استعمال کیا جاسکتا ہے یہ خصوصیت اس ملک کی ترک دنیا کی راہبانہ روح ہے۔ اس وقت تک اس ترکِ دنیا کی روح کو کسی عظیم مقصدِ حق سے باندھا نہیں جاسکا۔ اگر اس بے مقصد تصور کو ایک زندہ مقصدیت سے ہم کنار کر دیا جائے تو یہاں کے سادھو اور جفاکش راہب دنیا کو ہلا سکتے ہیں۔

بہرحال ہند کی تقدیر یا کلی معاشرتی انارکی ہے اور یا نوائے محمدی کو تھام کر سارے ایشیا و افریقہ کو ایک خدا و ایک انسانی بھائی چارے اور خلافتِ ارضی کے اصول پر منظم کرنا ہے۔ دیکھا جائے کہ تقدیر کا ہاتھ انھیں کس راہ پر ڈالتا ہے۔ اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ امتِ اسلامیہ میں بحیثیتِ مجموعی سردست کیا کیا اصلاحیں فی الفور ضروری ہیں۔

سیاحوں کا بیان ہے۔ تو انشاء اللہ وہ بھی اسی نئی اخلاقی تنظیم میں بخیر و خوبی شامل ہو گا۔ اس کے بعد پورے نظم انسانی کا موجودہ ملحدانہ فضا سے نکل کر ایک پختہ تر اخلاقی تعمیر کی طرف متوجہ ہونا ایک قدرتی بات ہو گی۔ اگر آج مسلم لیگ آف پاکستان اور ہندوستان کے اختلاف اللہ تعالیٰ ختم کرا دے اور کم از کم روس و امریکہ کی عالمگیر کشمکش کے مقابل یہ دونوں ملک ایک کھلی غیر جانب دار پالیسی پر متحد ہوتے ہوئے صدر کی معروضات کی روشنی میں کسی پائیدار معاشرتی اتحاد کی متحدہ راہیں سوچیں تو میری نگاہ میں یقیناً وہ دن تاریخ انسانی کی ایک نئی صبحِ سعادت ہو گا۔ ہندوستان نے بلا شائبہ ریب جمہوریت کے انقلاب کو سیاسی دائرے میں اپنا لیا ہے۔ ہزاروں برس پہلے کی مذہبی اہمیت رکھنے والی چھوٹی موٹی راجدھانیوں کو اس نے جس طرح مسمار کیا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے (مسلمانوں سے تو ابھی سیاست کے دائرے میں اتنا بھی نہیں ہوا۔ بلکہ ہمارے یتیم خانے کے مانیٹرز (چھوٹے موٹے روسا) اپنی اپنی ڈو مینینز کو وسعت دینے کے خواب آج بھی اس طرح دیکھ رہے ہیں کہ گویا دنیا ان شتر مرغوں کی طرف دیکھتی ہی نہیں) لہٰذا اس کی ساری معاشرتی مشنیری کا ادھر کرانا رکی میں بدل جانا بالکل ایک طبعی قدم دوم ہو گا اس بحران اور گھبراہٹ میں اگر وہ کمیونزم سے لپٹ جائے تو کتنی

ہے۔ لہٰذا اگر آج عالمِ انسانی کے اخلاقی و روحانی احیا کا یا کسی ایک ملت کی اخلاقی و روحانی احیا کا سامان کرنا ہے تو اس کوشش کا طریقِ کار قطعاً جمہوری ہوگا۔ قرآن نے صرف یہی طریقِ کار امتِ اسلامیہ کی فصلِ اول کی حیثیت سے ظاہر کیا ہے۔ "امرہم شوریٰ بینہم" خود نبیؐ کو تمام تدبیری امور میں "شاورہم فی الامر" کا حکم ہے۔ یہاں پر قدرتی طور سے ایک سوال دل میں پیدا ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ جب تاریخ پر صرف شخصی تسلط کا دور دورا اتنے طویل عرصے تک رہنا تھا تو نبی آخر الزماں کس طرح ایک ایسا طریقِ عمل معین کرتے ہیں کہ جسے عملاً بروئے کار لانے کے لئے تیرہ سو برس انتظار کرنا پڑا۔ مجھے شخصی تجدیدی کوششوں سے تعلق رکھنے والی روایات اور قرآن مجید کے معین کردہ طریق کار کو ایک ساتھ سامنے رکھکر سوچنے سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ خاتم النبینؐ نے اصلاح و تدبیرِ ملتِ اسلامی کا طریق کار تو اصولاً وہی رکھا کہ جو فطرتِ انسانی سے کلی اور دائمی مطابقت رکھتا تھا۔ (شورائیت و فطرتِ انسانی کے تطابق کے متعلق ابھی کچھ عرض کروں گا) لیکن اس بارہ تیرہ سو برس کے لئے ایک بشارت یا ایک خبر دیدی۔ یہ بشارت جزوِ قرآن نہیں صرف زبانی زبانی ہے اور وہ بارہ سو برس کے لئے ایک واقع ثابت ہوئی (مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس سلسلے سے تعلق رکھنے والی جو روایات ہیں ان کی

امت اسلامیہ میں بحیثیت مجموعی کیا کیا اصلاحیں ہوں

(۱) امت اسلامیہ کے سارے سمجھدار افراد اور جماعتوں کو حرفِ تقدیر کی طرح اس بنیادی بات کو آج یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک وہ امت کو سرِ نو ایک کامل خداشناسی اور خود شناسی کی قوت سے سمیٹ کر پھر ایک اخلاقی روحانی ادارے کی تشکیل نہیں دیتے۔ اس وقت تک امت اپنے مرکزی مقام پر مطلق نہیں آسکتی۔

(۲) دوسری یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کلی اصلاح کی نوعیت آج تک کی ان تمام اصلاحی کوششوں سے جداگانہ ہوگی کہ جو گذشتہ دورِ تاریخ میں مختلف شخصی کوششوں کے نتیجے میں بروئے کار آتی رہی ہیں۔ جب تک تاریخ پر شخصیت کے تسلط کا دور دورا تھا۔ اس وقت تک اصلاحی دائرے بھی افراد کے ارد گرد بنے جاتے تھے۔ اصلاحی کوششوں کا یہ تاریخ کے ساتھ تطابق تھا لیکن شخصی مرکزیت کا اصول گم ہو چکا ہے اور جمہور کے مساوی درجہ کے استحقاقِ حیات کو تاریخ نے طوعاً و کرہاً تسلیم کر لیا ہے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے نے اسی اصول پر مہر تصدیق ثبت کر دی

کے تمام افراد کے اندر مابہ الاشتراک ہوسکتا ہے وہ یکسر ناپید ہوجاتا ہے۔ وہ عمل واعتقاد کے درجے سے ہمیشہ کے لئے متوور کردیا جاتا ہے۔ اس مصیبتِ عظیم سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے وہ صرف اور محض یہ ہے کہ ہر ہر ملک میں اصلاح امت کو صرف شورائیت کی شکل دی جائے۔ ہندوستان ہو یا ملایا انڈونیشیا ہو یا ایران افغانستان ہو یا پاکستان مشرق وسطیٰ کی طوائف الملوکی ہو یا چین کے مسلمان کی پس ماندگی صرف یہی ایک اصول امت کو موجودہ نامعلوم ومجہول حالت سے نکال کر اصولِ دین پر متفق ومتحد کریگا۔ اور ہر ہر دائرۂ حیات میں سے شخصی خودغرضیوں منافقتوں تنگ نظریوں تفرقوں اور بزدلیوں کا خاتمہ کرتا ہوا ایک زندہ دینی اتحاد پیدا کرے گا جو خود اس امت کے لئے اور سارے عالم انسانی کے لئے ایک رحمت و ایک مرکز حق ثابت ہوگا۔ موجودہ اقوام متحدہ کے نظم کو راقم مارکسی دشمنانِ ملّتِ انسانی کے مقابل انسانیت کے لئے ایک رحمت سمجھتا ہے مگر یہ ایک عارضی رحمت ہے مستقل رحمت نہیں۔ اس لئے کہ اس میں کوئی دینی وروحانی واخلاقی داعیہ موجود نہیں کہ جو جمہوریت کی لا مذہبیت کے خلا کو پُر کرسکے۔ لیکن اگر امتِ اسلامی سیاسی واقتصادی دائرے کی عارضی خودغرضیوں سے فکِ نگاہ کرتی ہوں اپنے آپ کو ایک بچے تلے اخلاقی وروحانی ادارے میں سمیٹنے کی کوشش کرے تو

مجموعی صحت کس قدر ہے)۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "امرہم شوریٰ بینہم" کے اصول کے سامنے سے ہٹ جانے اور ایسی روایات کے افکار و اذہان پر چھا جانے نے شخصی ہوا پرستی کو بہت بری طرح ہوا دی اور ترتیب تنظیم و تقویت ملت کے بجائے اُسے انتشارِ ملت کا ذریعہ بنایا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آج صرف ہندوستان میں دیکھا جائے تو گذشتہ چالیس پچاس برسوں میں ایسے اشخاص بیس تیس سے کم نہ ہوں گے کہ جن کے ارد گرد اسی اعتقاد تجدید کے ماتحت چھوٹے چھوٹے حلقے قائم ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ جو ایک دوسرے کے متعلق غالی و مبتدع ہونے تک کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ ہے امت کا اپنے سرچشمۂ ہدایت سے عملاً غیر متعلق ہونے کا پھل۔ وہی چیزیں کہ جو اصلاحِ ملت کا ذریعہ ہو سکتی تھیں انھیں کو انتشارِ ملت کا ذریعہ بنا دیا گیا اور مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ ان تنگ دامن و تنگ نظر ملت کش مصلحین کے حلقہائے ارادت کی عملی و اصلاحی کوششیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتیں کہ وہ اپنی اپنی اور اپنے اپنے شیخ طریقت کی محض شخصی و طبقاتی نوعیت کی خصوصیات کو نمایاں سے نمایاں کریں اس کے سوائے اپنے حلقہائے ارادت کی بقا کا ان کے پاس سبب جواز اور کیا ہو سکتا ہے؟ بلکہ بالآخران کا دین یہی خصوصیتیں بن جاتی ہیں اور اصل دین جو ساری امت

سے کسی ایک کے تسلط میں آ جانا بظاہر ایک واقع معلوم ہوتا ہے
ایک اخلاقی قوت بن کر پورے مشرق کو متحد کرنے کا تو بظاہر
مجھے اس صورت میں کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ "اللّٰھُمَّ اصلح ذات
بیننا و اجعل فی قلوبنا الایمان و الحکمۃ" اے اللہ ہمارے
درمیان کے تفرقوں کو ختم کرا اور ہمارے سینوں کو ایمان سے
بھر دے کر دئے بہرکیف امت کی کلی اصلاح کا مرکزی ستون سیاست
و اقتصادی دائرے میں نہیں بلکہ خالص دینی دایرے میں ایک
عالمگیر انداز کی شورائیت علما و فقہا و صوفیا و سیاسی زعما کرتے
ہوئے "قرانی محکمات" و "ام الکتاب" کا تعین کرنا اور اس کو ہر
ہر فرد امت کے لئے اعتقاد و عمل کے ہر دائرے میں لازمی قرار
دینا اور اسی کو کم از کم سارے ایشیا و افریقہ کے سامنے ایک
تیسری تنظیم انسانی کی حیثیت سے پیش کر دینا ہے۔ یہ وہ ترکیب ہے
کہ جو امت اسلامی کو اس مقام پر لے آئے گی کہ جسے قرآن مجید
"و کذالک جعلنا کم امتاً وسطاً لتکونوا شھداء
علی الناس" (ہم نے تمھیں (تمام قوائے حیات انسانی کا) معتدل
نمونہ بنایا ہے تا کہ تم ملت انسانی کے لئے نگراں (عمدہ نمونہ بنو)
کی آیت میں بیان کرتا ہے۔

بلاشک کائناتِ انسانی کے لئے مستقل دارالامن پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر پاکستان مسلم لیگ کشمیر وغیرہ قسم کے مسائل کو ملتِ اسلامی کے ایمان کا جزو اعظم بنانے کے بجائے اپنی ہندوستانی برہمن بنیا برادری کے سامنے احیائے توحید واخوت و خلافتِ محمدی کی تجویز کو لائے تو اس بات کو باور کرنے کی وجوہات ہیں کہ انھیں ناکامی نہ ہوگی۔ برہمن برادری سیاست کے دائرے میں تو جمہوریت کو کامل طور پر اپنانے پر آمادہ ہو گئی ہے لہذا معاشرتی طور پر اس کی ساری مشینری کا ادھڑ جانا ایک واقع بن کر سامنے آئے گا۔ اس لئے اگر بدظنی کی تمام راہیں بند کرتے ہوئے مسلم لیگ اخوت و بھائی چارے کا ہاتھ پھیلائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کامیابی بخشے گا جس کے بعد انڈونیشیا سے مراکش تک کو ایک وفاق میں منظم کر لینا بالکل ایک قدرتی بات ہوگی۔ (اے اللہ مسلم لیگ میں سے خود غرضی و نفاق کو ختم کر اور برہمنی برادری کے تعصب کو ختم کر اور ان دونوں کو اپنے توحید و اخوت و خلافت ارضی کے منصوبے پر متحد کرتا ہوا انسانیت کیلئے سچا دارالامن پیدا کر) ہندوستان اگر اسلام کے خلاف اپنے تعصبات کو قائم رکھتا ہے تو مجھے اس کا انجام ایک معاشرتی ناری محسوس ہوتا ہے اور اگر مسلمانانِ عالم اپنی اخلاقی قوت سے ہندوستان کو ہمنوا نہیں کرتے تو ان کا روس و اتحادیوں میں

بستی میں نوعی نظم و نسق پیدا کرنے کے لئے آتی ہے۔ اگر نوعِ انسانی کے افراد کے لئے ایک نوعی نظم و نسق ضروری نہ ہوتا تو محض انفرادی زندگی گذارنے کے لئے شایدان کی اپنی فطرت سلیمہ کافی رہنما ہوتی۔ لیکن اس مخصوص اندرونی فطرتِ انسانی کو ایک نوعی نظم دینے کے لئے وحی آسمانی کی خارجی ایجنسی ضروری ہوگی جس کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فطرتِ سلیمہ کو ترغیب و ترہیب کے مختلف ذرائع سے بیدار کرتے ہوئے اُسے اتنا قوی کردے کہ صرف وہی انسان کے سارے نوعی کاروبار کا ذریعہ بن جائے۔ اُسے اس کائنات میں اپنے ان سہ گانہ فرائض کا ایک مربوط احساس ہو کہ جن کا صدر میں متعدد بار ذکر آچکا ہے۔ ان سارے مقدمات سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہر ہر فردِ انسانی کی نجات و فلاح وحیاتِ سرمدی کے یہ معنے ہیں کہ اس کی فطرتِ سلیمہ کاملاً بیدار ہوتے ہوئے اپنے تمام فرائض و واجباتِ حیات کو بہ ہوش و حواس اور برضا و رغبت پوری طرح سمجھ بوجھ کر ادا کرے۔ ہر ہر فرد کے خدا کے سامنے اپنی منتورسے منتور زندگی کے تمام پہلوؤں میں جواب دہ ہونے کے معنے بھی یہی ہیں۔ لہٰذا اصولاً دین نہ تو جبرو اکراہ ہے اور نہ تقلید دریا کاری ہے۔ لہٰذا اپنے فرائض و واجبات کو معین کرنے کے لئے اور اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے اصولاً فطرتِ انسانی نشوائیت سے مطابقت رکھتی ہے۔ تقلید

شورائیت کا فطرتِ انسانی سے تطابق

اس مضمون میں متعدد بار صدر میں عرض کیا گیا ہے کہ حیاتِ حیوانی پر ایک مخصوص قسم کے اخلاقی و روحانی شعور اور احساس کے اضافے کا نام انسان ہے۔ اگر یہ اخلاقی و روحانی شعور ناپید ہے، تو ایک مخلوق صرف کوٹ پتلون پہن لینے اور دو ٹانگوں پر چلنے سے انسان نہیں کہلا سکتی اگر یہ احساس وشعور موجود ہے مگر وہ اس درجہ قوی نہیں کہ انسان کے تمام قوائے حیات کو اپنے قابو میں کرتے ہوئے انھیں ٹھیک ان کے انسانی مصارف میں صرف کر سکے تو یہ حالت انسان وحیوان کے درمیان ایک برزخی صورت پیدا کرتی ہے۔ قرآنِ مجید اس سلسلے میں ہر انسانی بچے کو اس صلاحیت کا حامل بلکہ خود فطرتِ انسانی ہی اسی مخصوص اخلاقی و روحانی شعور و احساس کو بتاتا ہے۔ قرآنی تعلیم کی روشنی میں "الہام فجور و تقویٰ" اور "دین قیم" خود فطرتِ انسانی اور اس کی اندرونی جبلت ہے۔ وحیٔ آسمانی اس اندرونی مستور فطرتِ انسانی کو بیدار کرتے ہوئے اور ترقی دیتے ہوئے اسی کے ذریعے انسانی

بلکہ عملی اتفاق و اتحاد ہے۔ امت کو دس بیس برسوں کے لئے ہر
چیز سے اس طرح فک نگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ گویا قرآن
کے سوائے اس کے پاس اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اس کوشش سے وہ
عالمگیر نظام تمدن پیدا ہوگا کہ جس کی جامعیت و جاذبیت کی
تاریخ عالم میں نظیر نہ ملے گی۔ آج حالت یہ ہے کہ امت اسلامیہ کا
معمولی سا مذہبی رجحان رکھنے والا ایک فرد وضو و استنجا و ایصال
ثواب وغیرہ کے متعلق سینکڑوں مسائل جانتا ہے (حالانکہ یہ باتیں
ہرگز اصول دین نہیں۔ یہ تو وہ باتیں ہیں کہ قرآن کی زبان میں جنھیں
"شرعت و منہاج" کی دوسرے اور تیسرے درجے کی تفصیل کہا جاسکتا
ہے) لیکن اگر ساری دنیا کے علما و فقہا و صوفیا و سیاسی زعمائے
اسلام کو ایک محفل میں جمع کرتے ہوئے اُن سے صرف اتنی بات
پوچھی جائے کہ قرآن مجید نے اپنی تعلیم کے جس حصے کو "منہ آیات
محکمات" "ہن ام الکتاب" کہا ہے وہ محکمات قرآن کتنے ہیں اور
کون کون سے ہیں؛ تو مجھے یقین ہے کہ اکثر و بیشتر تو سوال ہی نہ سمجھ
سکیں گے اور جو سوال کی نوعیت کو سمجھ لیں گے، اسکا جواب تو
کسی صورت ان کے بس کی بات نہ ہوگی۔ یہ ہے وہ حجاب
اکبر کہ جو امت کے خواص و عوام اور ان کے اصل سرچشمہ ہدایت
کے درمیان حائل ہو گیا ہے اور وہ اس لئے حائل ہوا کہ وہ تنظیم
امت کہ جس پر اسے محمد رسول اللہ نے منظم کیا تھا اور جو اپنی

و جبر سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ چونکہ خاتم النبیین کا پروگرام نوعِ انسانی کے لئے حیات دنیا کے سارے ادوار میں ایک نوعی نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا انھوں نے امت کا طرزِ عمل "امرہم شوریٰ بینہم" کو بتایا ہے اور چونکہ صدیوں کی تاریکی کو بھی آپکی بصیرت دیکھ سکتی تھی لہذا البعض مخصوص شخصیتوں کی مساعی کے متعلق بھی کچھ خوش خبری دیدی میرا یقین ہے کہ اگر آپ اس کی خوش خبری نہ بھی دیتے تو بھی تکمیل دین میں کوئی فرق نہ آتا۔ اس لئے کہ یہ خوش خبری اوامر و نواہی کے درجے کا کوئی بنیادی اصولِ اخلاق و روحانیت نہیں۔ یہ تو محض خبر ہے۔ مگر اصل دین تو فرد فرد کی بصیرت میں اس درجہ خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرتے ہوئے اس کی حیات کے ہر ہر شعبے سے شرک و تقلید کو ختم کرنا ہے اور یہ کام ملت کی روحِ شورائیت کے احیائے تام کے ذریعہ ممکن ہے۔ لہذا امت کے درمیان اور محکماتِ قرآنی کے درمیان تیرہ سو برس سے جو جو حجابات اس لئے حائل ہونے لگے ہیں کہ محکمات قرآنی کی سطح پر ملوکیت نے تنظیم ملت کو ناممکن کردیا تھا اور اس عظیم ترین روکاوٹ کے عالمگیر طور پر حائل ہوجانے کے کے بعد اصل کی طرف رجوع کرنا ناممکن کردیا تھا، ان سب حجابات کو ختم کرنا ہے۔ صرف محکماتِ قرآنی پر جس اتحاد و اتفاق کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ صرف زبانی و اعتقادی اتفاق مطلق نہیں

کا ہے۔ اس کے سوائے آج کی فضا میں امت اسلامی تاریخ انسانی کی اس مرکزی حیثیت پر ہرگز نہ آسکے گی کہ جو اس کی تقدیر ہے۔

کذالک جعلنٰکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس

اس وقت جو جو نئے نئے اصلاحی حلقے امت میں ہر ہر مقام پر قائم کئے جا رہے ہیں وہ کسی صورت ضرورتِ امت کو سمجھنے یا اسے پورا کرنے کا کام انجام نہیں دے سکتے بلکہ وہ درحقیقت ماضی کے انداز پر صرف شخصی حلقے ہیں۔ اکثر و بیشتر اس امت کے حقیقی مقام، اس کے فرائض، اس کے موجودہ موقف و ماحول اور اس کے مطابق اس کی تنظیم جدید کے متعلق پوری طرح بے خبر ہیں۔ بعض تو ماضی کی صوفیت و مولویت کے انداز پر فی الجملہ اصلاحِ نفسی کے "کارِ خیر" میں مصروف ہیں اور بعض موجودہ سیاسی ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دین و مذہب کے نام سے اپنے لئے کوئی نہ کوئی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جنھیں وہ مقام حاصل ہے وہ اسے پختہ کرنے کے لئے مذہب کا نام ابھار رہے ہیں۔ حالانکہ یہ باتیں اب ان کے لئے کسی صورت تائیدِ خدا کو حاصل نہ کرسکیں گی۔ بلکہ الٹا خدا کے ابتلا کو دعوت دینے والی ثابت ہوں گی۔ موجودہ ابتلا سے نکالنے

شاخ وبن کے مجموعی عمل کے اعتبار سے خلافتِ فاروقی کے خاتمے تک جاری رہ سکی (خلافتِ عثمان میں شاخوں کا عمل خراب ہونا شروع ہو گیا تھا مگر مرکز حضرت علی کی شہادت تک اپنی اصل پر قائم رہا اور اس کے بعد شاخوں کے ساتھ مرکز بھی دنیاوی بادشاہت کی شکل اختیار کر گیا) اس کے بعد بتدریج آنکھوں سے روپوش ہونا شروع ہو گئی۔ یہاں تک کی ملوکیت نے اور ہر ہر دائرہ حیات میں شخصی اقتدار کے غلبے نے اُسے ناممکن کر دیا۔ اس کے بعد امت بحیثیت مجموعی یک قلم عزیمت و خلافت کی اُس سطح تنظیم سے جبراً و اکراہاً گر گئی کہ جس کی بنا محکماتِ قرانی تھی اس کے بعد مختلف رخصتوں، تاویلوں اور جزوی استنباطوں کا سہارا لیتے ہوئے فی الجملہ حیاتِ ملی کو آج تک باقی رکھا گیا۔ لیکن آج جب کہ ملت کی راہ کو روکنے والی ملوکیت و شخصی اقتدار کو اللہ تعالیٰ نے پورے عالمِ انسانی میں تہ و بالا کر دیا۔ اگر امت اپنے نفسیاتی الجھاوے کی تاریخ کو سمجھتے ہوئے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے تو بلاشبہ اس کی راہ کو روکنے والی کوئی چیز ماضی کی طرح آج موجود نہیں۔ مگر اس کے لئے تمام زعمائے ملتِ اسلامی کا اصولِ دین کے متعلق قطعی اتفاق اور اس پر عمل پیرا کرنے کے لئے متعین تر لائحہ عمل کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اور یہ کام علما و صوفیا و سیاسی زعما و مورخین و محققین اسلام کی ایک عالمگیر شورائیت

امت کے تینوں عناصر ترکیب کے حلقوں کی ابتدائی اصلاحات

اس سلسلے کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ہر ایک طبقہ اپنے علاوہ دوسرے حلقے کی تاریخی افادیت کو قطعاً تسلیم کرے اس لئے کہ امت میں اس وقت جو خیر جاری ہے اور موجود ہے میں پوری باخبری سے گزارش کرتا ہوں کہ اس کا فیصدی تینتیس تینتیس حصّہ ہر حلقے میں موجود ہے۔ دین کی اصل رابطۂ مع اللہ کا حق الیقین ہے اور بلا شائبہ ریب یہ ایک امرِ حق ہے کہ اس کا جو حصہ بھی اس وقت امت میں باقی ہے وہ صرف ان تارک الدنیا راہبوں کے ذریعہ سے ہے کہ جنھوں نے سیاسی اقتدار کے کلیتہً سگِ دنیا بن جانے کے بعد اس دنیا داری سے ایک نفرت انگیز ردِعمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو قاطبتہً تارک دنیا کر دیا اور اس طرح ایک جوابی تضاد کے طور پر رابطۂ مع اللہ کی مقصودیت کو انسانی انکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ آخر حیاتِ انسانی کا آخری نصب العین رضائے الٰہی کے مقام کی طرف ایک دیوانہ وار پرواز کے علاوہ کیا ہے اور وہ ایک

والی چیز صرف اصولِ شورائیت کو ملک ملک میں زندہ کرنا ہے اور پھر ایک عالمگیر شورائیت ملی کرتے ہوئے پوری امت اور پورے ایشیا و افریقہ کے لئے "محکماتِ دین" کو ایک معین تر شکل و ترتیب دینا ہے۔ میں ایشیا و افریقہ کا نام فضول نہیں لے رہا ہوں۔ یہ دونوں براعظم بیدار ہو رہے ہیں۔ اور۔ ان کے سامنے موجودہ عالمگیر جمہوریت کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے والا کوئی دینی و معاشرتی پروگرام مطلق نہیں۔ اس لئے وہ نہایت تنگ نظر طریق سے زمانۂ قبل از تاریخ کے اوہام و بت پرستوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ اب اگر انہیں افکار و خیالات نے کسی وقت کسی نئی چنگیزیت و تیموریت کا رنگ اختیار کرتے ہوئے دائیں بائیں پھیلا شروع کیا تو تاریخ انسانی کا کیا ہوگا؟ بلاشبہ گذشتہ دو ہزار برسوں میں انسان کے سامنے ہدایت کی جو جو روشنیاں آئی ہیں وہ بجھا دی جائیں گی اور عالمِ انسانی کو ہلاکت کے منہ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایشیا و افریقہ کے ان قبل از تاریخ کے وہمیات کو ہمراہ لئے ہوئے بیدار و برسرکار ہونے کے بعد مسلمان جس خواب کا نام ہے کیا وہ سوائے اس کے کہ رومن امپائر کے یہودیوں کی طرح صدیوں کیلئے کسی وحشی قوم کے غلام ہو جائیں کسی طرح شرمندہ تعبیر ہوسکیگا؟ لہٰذا آج وقت ہے کہ امت کو کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر کا عالمگیر طور پر مصداق بنایا جائے اصولاً اس کا ہر فرد مبلغ ہو۔

تینوں" من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

کا مصداق بن جائیں اور تینوں کے امتزاجِ تام سے پھر اس اخوت کا قوام تیار کیا جائے کہ جسے صدرین میں نے کامل ترین توحیدِ خدا سے پیدا شدہ کامل ترین عالمگیر اخوتِ انسانی کی وہ شکل کہ جو خلافتِ ارضیٔ انسانی کے اصول پر تمکن فی الارض فطرتاً چاہتی ہے" کہا ہے۔ آج کی فضائیں کائناتِ انسانی کو صرف اسی سیرت کا کوئی چھوٹا موٹا جماعتی نمونہ بچا سکتا ہے اور وہ نظامِ امت اسلامی کے صحیح عناصر ترکیبی کے ایک کامل جذب باہم سے پیدا ہو سکتا ہے" کذالک جعلنا کم امتہً وسطاً لتکونو شھداءَ علی الناس" اس کی دوسری معین شکل یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسی تازہ دم قوم جو ہر قسم کے روایاتی الجھاوے سے آزاد ہو صرف قرآن کو دیانت داری سے لے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہزاروں برس کے سادھوں اور تارک الدنیا راہبوں اور مرتاضوں کی سرزمین یعنی ہندوستان میں یہ صلاحیت موجودہ وقت میں معلوم ہوتی ہے۔ یہ قوم اپنی روایات کی روشنی میں ہر دائرہ حیات میں شخصی اتھارٹی کی پوجاری رہی ہے۔ لیکن اس سارے روایاتی بوجھ اور شخصی اتھارٹی کے پوجا کے اعتقاد کے باوجود اس نے آج جمہوریت کے اعتقاد کو سیاسی

زندہ رابطہ مع اللہ کے علاوہ کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ امت کے تارک الدنیا گروہ نے دنیا پرست ملوکیت کی اسی ضد (Antithesis ضد) کو زندہ رکھتے ہوئے سوسائٹی کا فی الجملہ توازن بحال رکھا۔ علمائے ان دونوں ضدوں کے درمیان کی خلیج کو مختلف تاویلات و استنباطات اور مختلف قسم اور مختلف درجے کے روایات کے ذریعہ پاٹنے کی مسلسل مساعی جاری رکھیں اور تاریخ انسانی کی مجموعی اخلاقی رفتار کو سامنے رکھتے ہوئے بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے ان کی یہ کوشش سعی مشکور رہتی سعی مردود نہ تھی۔ صوفیا و علما کی اس افادیت کو واضح کرنے کے بعد ملوکیت کے دائرے کی افادیت ملی یہ رہی ہے کہ ایک تو انھیں میں ہر ہر ملک میں بیسیوں ایسے صالح افراد مختلف اوقات میں پیدا ہوتے رہے کہ جنھوں نے حیاتِ انسانی کی اجتماعی کُل کو پھر سے نیابت و خلافت خدا کے قریب کر دیا۔ اور دوسری بات کی ایک بات یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سلطانی دین کا ایک زندہ اعتقاد امت میں موجود رہا جس نے اسلام کو اور مذاہب کی طرح بالکل راہبانہ اخلاق کا نظام بننے سے ہر وقت بچایا۔ یہ ہیں خلافتِ خدا کی عبائے جبریلی کے تین پرانے اور بوسیدہ ٹکڑے کہ جن کی اپنی اپنی افادیت کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ہمیں ایک مرکز میں اس طرح سمیٹنا ہے کہ

پر انحصار شرک ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ زبان کے معاملے
میں اور گائے کی قربانی کے معاملے میں گاندھی جی جن خیالات
پر آخری وقت تک قائم رہے اُسے گاندھی جی کے یہ تینوں جانشین
اب نظرانداز کر رہے ہیں اور اپنے لئے نفع بخش اور بے خوف و
خطر راہیں اختیار کر رہے ہیں۔ حالانکہ اخلاقاً ان کی آزمائش کا
صرف یہی نقطہ ہے۔ ویسے مہاتما بن کر خدا کی زمین میں گھوم لینا
یا الیکشن لڑ لینا کوئی امتحان طلب نقطہ نہیں۔ یہ تو دنیا داری ہے
اور کچھ نہیں۔ لیکن اگر وہ میری دعوت کو قبول کر لیں تو انشا اللہ
ہم ایشیا و افریقہ کو ایک نئی اخلاقی نظم میں پرو لینے کا کوئی بہت
بڑا مشن انجام دے لینگے۔ بلکہ عجب نہیں کہ ہم اپنے ارد گرد کوئی
ایسی چھوٹی موٹی اقوام متحدہ بھی بنا لیں کہ جو کم از کم انڈونیشیا سے
مراکش تک کے باہمی معاملات کو ہر خوف و امید کے غیر اخلاقی دباؤ
اور رشتے اور رابطہ سے آزاد رہ کر صرف مسلّم اصولِ اخلاق کی روشنی
میں سلجھا سکے۔ موجودہ اقوام متحدہ کا وجود اگرچہ فی الجملہ افادیت
رکھتا ہے لیکن کسی صورت اول درجے کی اخلاقی قوتِ انسانی کا
ادارہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ اس کے چلانے والے یا تو اخلاقی و
روحانی قدروں کے منکرِ مطلق ہیں اور یا ان قدروں کو حیات
اجتماعی کی عملی کشمکش میں کوئی پائندار و کامیاب ایجنسی نہیں سمجھ سکتے
اس لئے خالص اخلاقی بنیادوں پر ایک بین الاقوامی انداز کا

دائرے میں کاملاً قبول لیا ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اس میں
ایک عالمی انقلاب کے جراثیم پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ جراثیم جس وقت
اس کی پوری معاشرتی مشینری پر بھی اثر انداز ہونے لگیں گے تو
بلاشک اس وقت اس کا انجام یا تو ایک کامل معاشرتی انار کی
ہوگا اور اگر اُسے کوئی مشن اس دنیا میں انجام دینا ہے تو پھر اس
کے لئے راستہ صرف قرآنی اسلام ہوگا۔ کاش گاندھی گروپ ہی اپنی
ملت کی فلاح کے اس نسخے پر اس وقت غور کرے۔ کیا اچاریہ
ونوبا بھوے، پنڈت سندر لال الہ آبادی اور اچاریہ کرپلانی
اور ان کے حلقے کے باقی رفقا اس گذارش پر غور کریں گے۔ گاندھی
جی کی روح کی ہمہ گیری کے اعتقاد پر وہ جو سوسائٹی بنانا چاہتے
ہیں وہ ایک ہیرو ورشپ کے انداز کے ایک چھوٹے سے غیر معین
ترکیب کے ایک اقتصادی فرقے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا
لیکن اگر وہ قرآن کو ملت انسانی کی تعمیر کی حیثیت سے لے
لیں تو ان کے اقتصادی پلین کو اس تعمیری منصوبے میں بلاشبہ
لیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ صنعت و حرفت کو منتشر کرتے ہوئے ہر
ہر گاؤں کے ہر ہر گھر کو خود کفیل کرنے کا جو منصوبہ ان کے سامنے
ہے وہ بلاشک قرآن نظم اقتصادی سے مربوط ہو سکتا ہے
اس لئے کہ توحید کا بنیادی مطالبہ ہر ہر فرد سے یہ ہے کہ وہ بجائے
خود خود کفیل ہو۔ تعاون ممکن بلکہ ضروری ہے۔ مگر دوسرے

اس بات کی مزید تفصیل کرتا ہوا یہ عرض کردوں کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" سے ہٹ کر انسان جو جو تاثیرات ملاحظہ کرتا ہے اور جو جو چیزیں اُسے نظر آتی ہیں وہ بالکل ایسی ہیں کہ جیسے چوری کا مال کھانے سے یا کسی غیر منکوحہ یا کسی حیوان کے ساتھ بدفعلی کرنے سے بھی آدمی کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا اسے جائز بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک انسان مردار کھا کر بھی اپنی بھوک دور کر سکتا ہے۔ لیکن کیا یہ جائز بھی ہے؟ جس طرح عالمِ جسمانی میں بیسیوں چیزیں ایسی ہیں کہ جو حوائج انسانی کو پورا کرنے کا کام کر جاتی ہیں۔ بالکل اسی انداز پہ عالمِ روحانی میں بھی بیسیوں ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے وجود سے انکار کرنا بے خبری ہے۔ لیکن صرف ان کا موجود ہونا ان کے جواز کا سبب نہیں بن سکتا استعانتِ غیر اللہ یا عبادتِ غیر اللہ کا اگر کوئی بھی وجود ہے تو اس سے اس کا جواز ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے صراطِ مستقیم کے راستے کی ایک خطرناک امتحانی گھاٹی ہے۔ جس میں

حالانکہ اپنی اصل کے لحاظ سے صوفیوں اور فقرا کا گروہ بالکل متوکلین کا گروہ ہے۔ لیکن آج صرف ہندوستان میں ہمارے ایسے سینکڑوں مقامات ہیں کہ جہاں کے چڑھاوُں اور نذرانوں پر ہزار در ہزار خاندان اپنی اقتصادی مشینری چلا رہے ہیں۔ میں بحیثیت ایک بندۂ خدا کے عرض کروں کہ یہ سب باتیں غضب خدا کو دعوت دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ "ایاك نعبد وایاك نستعین" "ان اجری الا علی اللہ" کی دو آیتوں کا سہارا لیتے ہوئے اس سارے سلسلے کو منسوخ کرو اور کھل کر خدا کے روبرو پھر محمدی انداز سے کھڑے ہو اور ہاتھ پھیلا کر اپنی استقامت علی الحق اور دنیا کی ہدایت کے لئے دعائیں مانگو۔ دیکھو کس طرح یہ دنیا بدلتی ہے۔ اسلامی صوفیا پر عمرانی مورخ صدیوں یہ طعنہ دیتا آیا ہے کہ ان لوگوں نے امت محمدی میں ترک دنیا کا راہبانہ پرچار کیا۔ لیکن آج ان کے جانشینوں سے زیادہ دنیا پرست اور خدا کے اعتماد سے خالی شاید اور کوئی ہو۔ صدر کی دو آیتوں کی قوت سے وہ پوری ملت کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ خدا موجود اس کی رحمت موجود اس کی ہدایت موجود صرف تمہارے آستینوں میں بت ہیں۔

قلب سے سرسری ربط پیدا کرانے کے بعد صرف ایاک نعبد و ایاکَ نستعینؔ کے ذکر اور مراقبے پر لگایا۔ اور تمام وسائط کے خیال کو حذف کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک سے مربوط ہونے کی ہدایت کی تو تھوڑے عرصے کے بعد بلاشبہ وہ حالت پیدا ہوئی کہ جسے مادی زبان شاید ہی کبھی ظاہر کر سکے اگر ایک سالک "اِیّاکَ نعبد و ایاک نستعین" کو اپنا مقام بناتے ہوئے "اِن اجری الّا عَلی اللّٰہ" کو اپنی زندگی کا دوسرا اصول بنا ڈالے تو بلاشائبہ ریب فنا و بقا کے دونوں قدم طے ہو جانے کے بعد صاف استقامت علی الحق کے مقام پر قائم ہو جاتا ہے۔
لیکن "ایاکَ نعبد و ایاک نستعین" اور "ان اجری الا علی اللہ" کو نظر انداز کرتے ہوئے مدت العمر بتان انفسی و بتانِ آفاقی کی پوجا سے نہ نکل سکیگا اور صرف اپنے نفس کے فتور و کیفیات کو اپنا خدا بنا لیگا۔ آج ہمارا راہب خاندان اسی انفس و آفاق کے بتوں کی پوجا سے نکلتا ہوا رابطہ مع اللہ کو استوار کرلے اور خود کفیل ہو جائے تو امت کے قدم جم سکتے ہیں اگر چہ موجودہ عالمی انقلاب میں اس کا اپنے مرکز پر آنا تینوں عناصر ترکیبی کی کامل اصلاح و کامل تعاون پر منحصر ہے۔
(ج) ہمارے راہبوں کی بستی میں تیسری اصلاح طلب بات یہ ہے کہ انھوں نے ملوکیت کی طرح اپنے ہاں بھی پیری مریدی کو

اس وقت محمدی قافلے کے سارے راہبوں کی روحانی اولاد او جانشین پھنس گئے ہیں۔ اوپر کو چڑھنے کے بجائے دائیں بائیں بھٹک گئے ہیں۔ آج اس قافلے کے پاس اگر کچھ ہے تو وہ بلا واسطہ رابطہ مع اللہ کی کوئی چیز نہیں بلکہ شخصیت پرستی اور کھلی پوجا پاٹ کے مقام کی شخصیت پرستی و قبر پرستی کے علاوہ محض چند انفسی کیفیات ہیں حالانکہ انسانی منزلِ مقصود قطعاً و حتماً انفس و آفاق سے باہر ہے۔ آج ایسے سو دوسو متبتّل و تارک الدنیا خودشناس و خداشناس بندگانِ خدا کہ جو انفس و آفاق سے باہر کی کائنات سے کوئی یقین انگیز رشتہ رکھتے ہوں پوری ملّتِ انسانی کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ بعض سلسلوں میں تو صریح بت پرستی کے آگے رابطہ مع اللہ کا کوئی اصولی تصور رہی نہیں۔ حالانکہ عملاً سلسلۂ سلوک و تصوف کی پوری حقیقت ایک روحانی تجربے میں کسی باخبر اور راستے سے گذرے ہوئے شخص کی ہدایت پر چند دن کام کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں یہ ایک لیبارٹری کا تجربہ ہے جہاں ڈیمانسٹریٹر کی پوجا کا اصولاً کوئی سوال ہی نہیں بلکہ اس کی ہدایت پر چند سے عمل کرنا ہے۔ اور بس۔ ابتدائی چند یوم کے عمل کو چھوڑ کر بالآخر "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے علاوہ اور کوئی راہ ہی نہیں۔ میں نے اپنے ایک غیر مسلم ساتھی کو جو پیر پوجا کی شکل میں میرے پیچھے ہو لیا تھا مقام

جب تک مسلمانوں کی زندگی کا معین جمہوری انداز کا نیا خاکہ اور ڈھانچہ تیار نہیں کیا جاتا تب تک ہند میں بظاہر امت کی بقا کی کوئی صورت نہیں۔ ان کے تمام وہ ذرائع آمدنی ختم کئے جا چکے ہیں کہ جو ان کے فیوڈل نظام کو زندہ رکھنے والے تھے۔ بلاشبہ اس وقت مسلمانوں میں پورے ہند میں جو جو اصلاحی کام ہو رہے ہیں وہ یکسر ان حالات سے پوری بے خبری پر مبنی ہیں۔ چونکہ آج بھی مسلم اکثریت خانقاہوں کے متوسلین پر مشتمل ہے لہٰذا ارباب خانقاہ کا یہ عمل پورے ہندوستان کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوگا۔ کاش سارے مسلمانوں کی ایک جامع ترین شوریٰ یہاں بھی اس پروگرام کو طے کرتی اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کو اس سانچے میں ڈھالا جاتا۔ اس وقت سوائے اس کے کہ ہزار ہزار اور بارہ بارہ سو تنخواہیں لینے والے چند خاندان وہاں پالے جا رہے ہیں اور کوئی ملی کام وہاں نہیں ہوتا۔ حالانکہ آج امتِ اسلامی کو صرف وہ لوگ بچا سکتے ہیں کہ جو ملت پرور کارِ بے مزد یا صرف بنیادی ضرورت انسانی کا خرچ لے لینے کے اصول پر کام کریں۔

ان تین اصلاحوں کے بعد سلوک و تصوف کے سلسلے کی صدیوں سے رکی ہوئی افادیت پھر بحال ہونے لگتی ہے۔ اس سلسلے کی بنیادی افادیت مقصودیت دنیا کا کلی انکار ہے یہ ٹھیک مقامِ انسانی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں غلطی یہ

خاندانی ورثہ بنا دیا ہے۔ جسے ناجائز قرار دینا ضروری ہے۔ اور اپنی اپنی اولاد کو رزقِ حلال کے کسی نہ کسی آزاد ذریعہ کیساتھ جلد سے جلد پیوست کرنا ضروری ہے۔ کتنا حسرت ناک منظر ہے جو لوگ حقیقتِ دُنیا کی توہین کرنے کے لئے عالمِ وجود میں آئے تھے آج ان کے ہاں قیصر و کسریٰ کے رنگ کی گدیاں بن چکی ہیں خدا کا عذاب نہ آئے تو کیا ہو۔ ایسے بزرگوں کا جو مختلف اوقاف پر قبضہ ہے اُسے جلد سے جلد رضا کارانہ طور پر چھوٹے موٹے ٹرسٹوں کے حوالے کر کے انھیں صرف اسلامی کاموں میں صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ خدا کے کوچے کی کیا خدمت کر سکتے ہیں کہ جو اوقاف پر گذر کریں۔ اور توکل و رضا کا ان کے کوچے میں گذر نہ ہو سہ

فقیہہ مدرسہ دی مست بود فتویٰ داد
کہ مے حرام ولے بہ ز مالِ اوقافست

ہندوستان بھر کے خانقاہ نشین اگر اپنی خانقاہوں کی آمدنیوں کو جمع کر کے ایسے مدرسوں کا آغاز کریں کہ جنھیں مسلمان بچوں کی ابتدائی قرآنی تعلیم و صنعتی و حرفتی تعلیم کو جمع کرتے ہوئے آئندہ کی مسلم سوسائٹی کا ڈھانچہ تیار ہونا شروع ہو جائے تو یہ بہت بڑی خدمتِ دینی ہو گی۔ آج تک کی ہندوستانی مسلم سوسائٹی (بلکہ پوری عالمی مسلم سوسائٹی) فیوڈل سوسائٹی تھی مگر اب جن مسلم فیوڈل نظام کی پوری بنیادیں یہاں اکھاڑ دی گئی ہیں لہذا

کے لوگ خود مواظبت و مداومت کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس وقت تو ان پر عمل کرانے والی بظاہر کوئی حاکمی ایجنسی موجود نہیں۔ ایسے ہی یہاں جو باتیں اربابِ سیاست و اربابِ زر کے متعلق عرض کی جاتی ہیں ان کا اتباع بھی بظاہر صرف رضاکارانہ طور پر وہ لوگ کر سکتے ہیں کہ جو مسلمان کہلانے پر فخر سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دینی تقاضاؤں پر رضاکارانہ عمل پیرا ہونے میں ان کی سعادت ہے۔ البتہ جس عالمگیر شورائیت کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے ہو جانے کے بعد شاید یہ سب اصلاحیں ایک مرکزیت کے ماتحت لائی جا سکیں

(الف) پہلی بات یہ ہے کہ ہر ہر مقام پر اربابِ سیاست (یعنے رؤسا) اپنے اپنے جدی و موروثی اختیارات کو اپنے اپنے مقام کی ملتِ اسلامی کی ایک شورائیت کے سپرد کر دیں اور خود کلیتہً اس سے دستبردار ہو جائیں تا کہ انتخابی امارت کا کام آسان ہو جائے۔ اگر خدانہ کردہ کہیں یہ کام ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہر مقام پر کر دیا جائے کہ امارت کا موروثی سلسلہ ختم کر دیا جائے یعنے یہ چیز وراثتاً منتقل کرنے کے سارے امکانات کو ختم کر دیا جائے۔

(ب) خزانہ ہر صورت میں شورائیت کے ہاتھوں میں رہے خرچ اخراجات کے معاملے میں امرا کو ہر ہر مقام پر دس پندرہ برس کے عرصے میں اپنی اپنی جگہ کے اوسط درجہ کے بافراغت آدمی کے مقام تک لایا جائے تا کہ حکومت و ریاست میں سے عیاشی و زر و دولت کی فراوانی کا محرک ختم کیا جا سکے تا کہ ریاست و

ہوئی کہ مقصودیت دنیا کے انکار یا ترک کے ساتھ دنیا کے متعلقہ فرائض کو بھی ترک کر دیا گیا۔ بلکہ شاید ملوکیت نے ایک حد تک اس کے لئے مجبور بھی کر دیا تھا۔ اس لئے کہ اگر دنیا کی مقصودیت کا کلی انکار کرنے والا کوئی گروہ سارے فرائض واجبات حیات انسانی کو پورا کرنے لگ جائے تو شیطان کے کارندوں کے لئے دنیا کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے کونسی شکل رہجاتی ہے؟۔ لہذا دور ملوکیت میں۔" ان اجری الا علی اللہ" کے اصول پر کار بے مزد کے دائرے کو بہت محدود کرنے کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی۔ اس کے مقابل بے ایمان کرنے کے لئے بڑے بڑے ہدایا اور تحائف و جاگیریں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ مگر آج اللہ کے فضل سے یہ روکاوٹ ساری دنیا سے اٹھا دی گئی ہے۔ اس لئے اگر آج خدا پرست تارکان مقصودیت کا کوئی گروہ سلطانی عالم پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تو راستہ روکنے کی طاقتیں بہت کم ہونگی۔ خانقاہی کوچے کی ابتدائی اصلاحات یہ ہیں

سیاست اور جاگیرداری نظام کے کوچے کی بنیادی اصلاحات

جو چند باتیں صدر میں سلسلۂ تصوف وسلوک کی اصلاح و افادیت کے متعلق ہیں وہ صرف وہ باتیں ہیں کہ جن پر سلسلۂ سلوک

البتہ ابھی تک اس کی صحیح عملی رہنمائی نہیں ہو سکی۔ وہ عملی رہنمائی امت اسلامیہ کے علاوہ کون کرے گا۔ اور اگر آج بھی ان بڑے بڑے ابتلاؤں کے باوجود امت اسلامی کے افراد وطبقات اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو اگر امت کے ہاتھوں سے زمین کا چپہ چپہ نکل جائے اور انہیں خدا کے انتقام کا ہاتھ ایک عالمگیر ادبار کی پیدا کر دے تو کونسا ظلم ہو گا۔ ہندوستان میں تقدیر کے ہاتھ نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ وہ ان کے سامنے ہے۔ یہودیت کو کس طرح دو ہزار برس کے بعد اللہ تعالیٰ فلسطین پر قابض کر رہا ہے اور سارے قانونی جوازوں کے باوجود کس طرح مسلمانوں کے قدم وہاں سے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ سارے مسلمانان عالم کی متفقہ دعائیں اور ہمدردیاں بلکہ تلواریں بھی ان غاصبوں کو بیدخل نہیں کر سکیں۔ بلکہ ان کا قدم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے کیا امت اسلامیہ کے زعما کو یہ تمام عبرتناک باتیں محاسبۂ نفس پر متوجہ نہیں کرتیں؟ کہتے ہیں کہ:-

جب اللہ تعالیٰ کسی شخص (طبقات یا امت کا سوال بھی ایک شخص کا سا سوال ہے) سے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اپنے نفس کی کمزوریوں پر مطلع کر دیتا ہے

اگر یہی واقعہ ہے تو امت اسلامی کے فی الجملہ خود شناس طبقات و افراد کب اپنے محاسبۂ نفس پر متوجہ ہو کر اپنی اپنی اصلاح

حکومت کو اخلاقی و روحانی محرکات کی مرکزی ایجنسی بنانے کی طرف پلٹا جائے۔

(ج) جہاں جہاں پوری جمہوریت قائم ہو چکی ہے وہاں کے وزرا و صدور کو محمد رسول اللہؐ صدیقؓ و فاروقؓ کے اسوۂ حسنہ کی طرف پلٹنا چاہیئے اور تنخواہی نظام کو کم از کم حکومت کے دائرے میں اس حد تک لے آنا چاہیئے کہ جس حد تک چین کا ڈکٹیٹر ماؤزے تنگ لے آیا۔ حکومت کے دائرے میں ماؤزے تنگ نے سات سو اور ایک سو تک تنخواہوں کو سمیٹ لیا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اجر آخرت کا قائل بھی ہے یا نہیں۔ لیکن جو لوگ مذہب کے قائل ہی نہیں مذہب کو تعمیر انسانی کی مرکزی ایجنسی کی حیثیت سے بھی مانتے ہیں وہ اگر اتنا بھی نہ کریں تو ان کے مکار و دغاباز ہونے میں کوئی شک ہے؟ انڈونیشیا سے مراکش تک کے مسلم روسا و حکام و جمہوریتیں اس بات پر پہلی فرصت میں غور کریں۔ ہمیں روس و امریکہ کی کشمکش کو ایک طرف پھینکتے ہوئے اپنے تمام عناصر ترکیبی کی نئی تنظیم کے ذریعہ ایک تیسری اخلاقی و روحانی مرکزیت کو پیدا کرنا ہے تاکہ "کذالک جعلنا کم امۃً وسطاً لتکونوا شھدا علی الناس" کو ایک نصب العین بنا کر عالم انسانی کے سامنے لایا جاسکے۔ تاکہ حکومت میں سے زر طلبی کا محرک کلیتہً قتل ہو کر اپنی جگہ اخلاقی محرک کو دے سکے۔ فطرتِ انسانی کا رخ صرف اسی طرف

سیاسی قوت کے پاس۔ اس لئے کہ جب تک آپ کی سیاسی قوت کا مقصد "ناموسِ آئینِ خدا کی حفاظت" نہ ہو اس وقت تک تمہارے بازو اور تمہارے دل اتنے کمزور ہوں گے کہ تم ایک چوہے اور ایک خرگوش کو بھی زیر نہ کرسکو گے۔ لیکن جب تمھیں یقین ہو جائے گا کہ اب تمہارے گھروں میں اور تمہارے تمام دوائرِ حیات میں مذہب کے نام سے کوئی سرمایہ دارانہ مکر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ناموسِ خدا کی حفاظت ہو رہی ہے تو یقین جانو کہ تمہارا ایک ایک فرد اپنے آپ کو ملت انسانی کی فطری ضرورت سمجھتا ہوا پھر سلاطین عالم کو خداشناس بے باکی سے "اسلم تسلم" کا پیغام دے گا۔ سلطنت کے دائرے کی یہ اصلاحات آج کی فوری ضرورت ہیں۔

(د) افراد صرف اس حد تک زمین اپنے قبضے میں رکھیں کہ جس حد تک ان کی انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو۔ اس کی قدرتی حد یہ ہے کہ جس حد تک ایک فرد یا ایک خاندان خود آباد کرسکے۔ زمین داری نظام کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس کے الجھاوے میں پھنسے ہوئے طبقات میں ضرورت انسانی اسراف اور عیاشی کی حدود شدید درجہ مشتبہ ہو گئی ہیں۔ سیکڑے برسوں سے ان کی معاشرت میں انسانی برادری کے حق زلیت کا کوئی مفہوم ہی نہیں۔ لہذا وقت ضرورت سے پہلے ان کا خود

کریں گے۔ اگر فی الجملہ اصلاحات کا جو خاکہ عرض کیا جا رہا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر خدا سے اپنی حق طلبی (خلافت ارضی) کرو تو بلاشک ساری راہیں کھلینگی۔ یہ یہود وغیرہ کہ جنھیں دنیا کا ذہین تریں عنصر ہونے پر بھی ساری دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملی، حقیقت میں امت اسلامیہ کا ایک فعال جزو بننے یعنے مسلمان بننے کے لئے دو ہزار برس کے بعد پھر ارض مقدس کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ آج امت مسلمہ کو آئن سٹائن کی ذہین قوم کی اشد ضرورت ہے۔ بلاشک تمھاری اصلاح وعرض کردہ شورائیت کے بعد مشرق وسطی کا یہود اور ہندوستان کا ذہین برہمن تمھارے بھائی ہوں گے۔ تم پر سارے زلزلے صرف اسی بنیاد پر آرہے ہیں تاکہ تمھارا ہاضمہ تیز ہو جائے۔ یہود و برہمن (کون برہمن۔ فیوڈل ازم کو برباد کرنے والا جمہوریت پسند برہمن) کے اسلام سے ہم کنار ہو جانے کے بعد موجودہ تاریخ انسانی کا توازن بحال ہونا شروع ہو جائیگا۔ کفر پھر مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیثَۃٍ جُتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کا مصداق ہوگا اور اسلام پھر مَثَلُ کَلِمَۃٍ طَیِّبَۃٍ کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ" کا مصداق بنے گا۔ اس وقت جس عالمگیر موقف ابتلا پر امت کو لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے اس سے نکلنے کی راہ نہ تو امریکہ کے پاس ہے نہ روس کے پاس اور نہ تمھاری

اس کی اکثر و بیشتر ضرورتیں باہمی تعاون سے مہیا ہوتی ہیں
انھیں ضروریات انسانی کے باہمی تبادلے کے جو جو مرکز تھے
وہی ہماری موجودہ مدنیت و شہریت کی اساس اور جڑ ہیں
مختلف اشیا کو مہیا کرنے کی طرف انسان کو اس کی فطری ضرورتوں
نے متوجہ کیا اور ان اشیا کے باہمی تبادلے سے انسان کی مدنیت
کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتدائی اساس میں منفعت اندوزی کو مطلق
دخل نہیں۔ ایسے ہی فطرت انسانی میں اخلاقی و روحانی و جسمانی قوتوں
کا اتنا کامل امتزاج و توازن موجود ہے کہ اگر انسان ان سب فطری
صلاحیتوں کو ان کے ٹھیک مصارف میں فطری انداز سے استعمال
کرنے کے اصول پر عمل پیرا ہو تو یقیناً اس کے باہمی احتیاج کی
وہ کیفیت غلط معلوم ہوگی کہ جہاں وہ اپنے آپ کو اپنی بنیادی
ضرورتوں کے مہیا کرنے کے نا اہل سمجھتا ہے۔ اصولاً اپنے روحانی
دائرے میں اول درجے کا خدا پرست ہونا ہر انسان کا بنیادی
فرض ہے۔ اصولاً اپنی ضروریات کو خود مہیا کرنا اور محتاج غیر
بدرجۂ جبر و اکراہ نہ ہونا ہر انسان کا بنیادی فرض ہے اور اصولاً
ہر انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آمادہ
رہنا اس کا ذاتی اور اخلاقی فرض ہے۔ فطرتِ انسانی یہی ہے
یہ تینوں فرائض فطرتِ انسانی کے داخلی فرائض ہیں کہ جنھیں ترتیب
دیتے ہوئے انسان کو ایک خارجی شکل دینا ہے۔ جس سے اس کی ایک

سنبھلنا ایک کرامت ہوگی۔ لیکن اگر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں تو کیا عجب ہے۔

سرمایہ دار اور تجارت پیشہ طبقات کی بنیادی اصلاحات

(۱) وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ

ترجمہ:۔ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے رہیں اور اُسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں عذاب الیم کا مژدہ دیدے"

(۲) یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ" تجھ سے پوچھتے رہیں کہ کیا خرچ کریں تو کہدے کہ ضرورت سے فاضل خرچ کرو"

صادر کے دو مرکزی احکام ہیں آج کی اقتصادی جنگِ زندگی میں کیونکر عمل کیا جاسے اس پر بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ اس وقت یہ عرض کرتا ہوں کہ خود تجارت کی تاریخی اصل اور اسکی فطری غرض کیا ہے۔ تجارت کی تاریخی اصل مختلف افراد یا طبقات کے درمیان ضروریاتِ انسانی کا باہمی تبادلہ تھا اور اس کی فطری غرض سوسائٹی کے لئے فطری ضروریات کا مہیا کرنا تھا۔ اوپر کہیں یہ بات عرض کر آیا ہوں کہ انسان ایک مدنی الطبع مخلوق ہے اور

شہریت اپنی اصلی فطری حالت سے اس درجہ گر چکی ہے کہ اگر ایک ملک کی مجموعی آبادی کی فطری ضروریات کا ایک بنیادی خاکہ ٹھوس اخلاقی نقطۂ نگاہ سے معین کیا جائے اور پھر اسے معیار قرار دیکر موجودہ شہریت کو اس پہ تولا جائے تو بلاشبہ معلوم ہوگا کہ موجودہ شہریت ابلیس کی سازش کا مرکزی اڈا ہو چکی ہے فرض کیجئے کہ ہندوستان و چین کی ۸۷ کروڑ انسانی آبادی کی بنیادی ضروریات کی پیداوار اور اس کی فی الجملہ ترقی کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے اس ساری بنیادی ضروریاتِ حیات کی پیداوار کو اس بستی پر مساوی درجہ تقسیم کرنے کا ایک سادہ ترین عملی منصوبہ بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ان کے لئے مساوی درجہ اوسط محنت بھی مقرر کر دی جائے اور پھر ان دونوں ملکوں کے چالیس اول درجے کے بڑے بڑے شہروں کی تمام اشیائے خرید و فروخت کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کس حد تک طے کردہ بنیادی ضروریات انسانی کے دائرے میں آتی ہیں۔ میں اقتصادی اعداد و شمار کا ماہر نہیں لیکن سالوں سے شہریت کو اسی تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ غالباً شہری اشیاء خرید و فروخت ایک ملک کی بنیادی اشیاء کے ضرورت سے دس فیصدی بھی متعلق نہ ہوں گی اکثر سامان بنیادی اشیاء ضرورت کے احساس کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف آرام و راحت و عیاشی کے درجے پر مشتمل ہو گا۔ اور جب ان کی تاجرانہ

صالحہ شہریت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ موقف تاریخ میں انسانی مدنیت اس درجہ پیچیدار ہو گئی ہے کہ یہ ساری باتیں لفظاً ایک وہم و پندار معلوم ہوتی ہیں۔ تجارت کی اصل غرض و غایت معین کرنے کے بعد یہ عرض کر دیا جائے کہ آج تجارت صرف نفع اندوزی اور نفع اندوزی کے لئے تمام ذرائع حیاتِ انسانی پر قبضہ کرنے کے مقصد کے علاوہ اور کوئی بات اصولاً اپنے سامنے نہیں رکھتی اس باطل مقصدیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار کی کوشش کا یہ انداز ہے کہ اس طرح وہ ایک طرف سے سرمایہ جمع کرتا جائے اور دوسری طرف سب قسم کے سود بخش مشاغل میں اسے لگاتا جائے اس شیطانی چکر کی کوئی ممکن انتہا نہیں۔ اگر ایک سرمایہ دار کے پاس ساری دنیا کا سرمایہ جمع ہو جائے تو مجبور ہوگا کہ اسے مزید نفع اندوزی کے لئے خرچ کرنے کے لئے کسی نئی دنیا کی تلاش کرے۔ ظاہر ہے کہ اس شیطانی چکر میں اصلاح کی گنجائش کا قدم اول ہی ناپید ہے۔ ساتھ ہی چونکہ ضروریاتِ انسانی کی مہیائی اور اس کے باہمی تبادلے کے فطری مقصد کے مقام سے تجارت گر چکی ہے اور اس کی غرض صرف نفع اندوزی رہ گیا ہے۔ اسلئے وہ اس غرض کے ماتحت صرف ایسی چیزیں مہیا کرنے کی ایجنسی بن گئی ہے کہ جن کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کر سکے اور زیادہ سے زیادہ ذرائع حیات پر قبضہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کی

لگیں تو اس کے الوالعزم انبیا کارل مارکس اور اینگلز کے علاوہ کون ہو سکتے ہیں؟ اور پھر ان کا جماعتی بلکہ نوعی طریق کار ہر اخلاقی و روحانی قدر کی کلی نفی کرتے ہوئے راہزنی، قزاقی، جبر جھوٹ کے ذریعہ ایک خونخوار حیوانی تنازع للبقا کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔

جدید انڈسٹریل اور امپیریل ازم

بلا شبہ یورپ کی نشأۃ جدیدہ کے بعد جو تمدن پیدا ہوا ہے اس نے شہریت کو فطرت انسانی کی بنیادی ضرورتیات کی مہیائی و تقسیم و تبادلے کے بجائے یکسر منفعت اندوزی اور اخلاق سوز عیاشی کا مرکز بنا دیا ہے۔ اب مشرق والیشیا بھی اسی کی کاپی کر رہا ہے۔ ہماری کائنات انسانی میں اس وقت قحط و کم یابی کا جو شور ہے اسے بلند کرنے والوں کے سامنے ہرگز یہ سوال نہیں کہ کس چیز کا قحط ہے۔ ان کے سامنے تو ضروریات انسانی کا کوئی بنیادی خاکہ ہی موجود نہیں۔ اس افراتفری میں تو اکثر و بیشتر بیدار شہریت کی غیر فطری سطح حیات کو وسیع کرنے کا سوال اصولی حیثیت رکھتا ہے۔ خود ان کی زندگیاں اسی غیر فطری معیار کا اسوۂ سیئہ پیش کر رہی ہیں۔ لہذا جب تک نوع انسانی کی فطری ضروریات یا کم از کم ایک ملک کی فطری ضروریات کا ایک عام اور تسلیم

اغراض پر نظر ڈالی جائے گی تو سو فیصدی نفع اندوزی کی خواہش کی
کارفرمائی نظر آئے گی۔ اس ساری چہل پہل کی بنیاد میں ضروریات
حیات کے تقسیم و تبادلے کا نام تک نہ ہوگا۔ صرف نفع اندوزی
اور حیاتِ انسانی کے سادہ اور ایماندارانہ جماعتی طریقِ عمل کی
راہزنی و قزاقی کے سوائے موجودہ شہریت کی بنیاد میں کوئی جذبہ
کارفرما نظر نہ آئے گا۔ اب انھیں چالیس اول درجے کے شہری بستی
کے مشاغل اور پیشوں کو دیکھئے۔ ہاں یہ بات بغور ملاحظہ فرمائی کہ
ان میں سے کتنے فیصدی سچ مچ حقیقی ضروریات کے تقسیم و تبادلے میں لگے ہیں اور کتنے
پورے ملک اور پوری انسانیت کے ساتھ بدترین قزاقی کر رہے
ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ جو لوگ سچ مچ انسان کی فطری
ضروریات کو عملاً مہیا کرنے میں مصروف ہیں فارغ البالی و آرام
وراحت کی زندگی گذارنے میں ان کا کتنا حصہ ہے اور جو لوگ سچ
مچ انسانی حیات کے سارے بنیادی فرائض نوعی کو نظرانداز کرنے
والے ہیں ان کی فارغ البالی اور آرام و آسائش کا کیا درجہ ہے
ظاہر ہے کہ جب موجودہ شہریت کی بنا مطلقاً فطرت انسانی
کو نظرانداز کر رہی ہے تو اسے عمرانِ انسانی کی بنا قرار دے کر
انسانیت کے امنِ حقیقی کے سوال کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے
اگر پوری کائناتِ فطرت کو صرف بدامنی و راہزنی کا منبع دیکھنے
لگیں اور اسی قزاقی کے ساتھ فطرتِ انسانی کا انطباق بھی کرنے

والوں کی بنیادی ضروریات تک کا اس سرمایہ داری کو کوئی
خیال نہ تھا۔ آج جو سرمایہ داری ایشیائی ممالک کے شہروں پر
قابض ہو رہی وہ اسی بے دین و بے آئین و ہوس کار سرمایہ داری
کی نقل ہے۔ یہاں پر ضمناً یہ عرض کر دینا بھی بیجا نہ ہو گا کہ مارکس
کی قسم کے لوگ بالکل اسی خلافِ فطرتِ انسانی انداز پہ ہر چیز کو
ترتیب دینے والی سرمایہ داری کی پیداوار تھے۔ یہ سرمایہ داری کہ
جو مذہب کو انسان کی جماعتی زندگی کے حدودِ عمل سے خارج
کرنے کو اور اپنے سرمایہ دارانہ سیاسی نظام کو دنیا پر محیط کرنے کے پھل
پر نگاہ رکھتی ہے، فطرتِ انسانی میں سے اخلاقی و روحانی شعور و
احساس کے ہر نقطے کو عملاً نفی کرتی ہے۔ اور نتیجے میں ساری انسانی
بستی کے سامنے عالمگیر انداز کی ایک حیوانی تنازع للبقا کی فضا
پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب اسی بے دین و بے آئین و اخلاق سوز و
روحانیت کش فضا میں پیدا شدہ اور تربیت یافتہ کوئی فرد اس
عالمگیر وسعت رکھنے والی سرمایہ دارانہ ابتری و بے ترتیب حالت
میں پورے عالمی انداز پر یکسانیت پیدا کرنا چاہے اور ذہانت
بھی رکھتا ہو تو وہ یقیناً کارل مارکس بن جائے گا۔ کارل مارکس
بالکل اسی غیر فطری حالت کی پیداوار ہے۔ اس غیر فطری فضا میں
سے اخلاق و روحانیت کے ذرات قتل کئے جا چکے ہیں۔ زناکاری
و شراب خوری سوسائٹی کے تسلیم کردہ بلکہ پورے شہری انداز پہ

شدہ معیار قائم نہ کر لیا جائے اور جب تک تجارت پیشہ طبقات کو پھر سے تقسیم و تبادلۂ ضروریات انسانی کی ایجنسی کی حیثیت نہ دی جائے اس وقت تک کوئی حسابی انداز کی اخلاقی اصلاح پیش کرنا بڑا مشکل ہے بالکل مولویانہ انداز پر یہ فتوی دے دینا کہ جو پیدا کرتے ہو سال گذرنے پر اس میں سے ان ان شرائط کے ماتحت اتنا اتنا فیصدی دے دیا کرو بالکل سیدھا سا راستہ ہے۔ مگر وہ موجودہ تجارت یا مدنیت کو کسی صورت فطری حالت کی طرف نہیں پلٹ سکتا۔ جب تک کہ خود موجودہ مدنیت کی بنیادوں کو مسلمات اخلاق انسانی کی نگاہ سے دیکھ نہ لیا جائے۔ یورپین امپیریل ازم کا موجودہ سرمایہ دارانہ تجارتی نظام تو کاملاً ایک طرف مذہب کو کہ جس کی ایجنسی چرچ تھا جماعتی زندگی کے دائرے سے خارج البلد کرنے اور اس کے ساتھ مشینری کی اس زمانے کی نئی ایجاد سے شروع ہوتا ہے اور پہلے قدم پر اپنی ہوس کاری میں نوآبادیاتی امپیریل ازم کی تشکیل اختیار کرتا ہے کہ جس میں ضروریات انسانی کی مہیائی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس میں تو زر و جواہر کے پیمانے کی نفع اندوزی اور نوع انسان کی عالمگیر غلامی کا مقصد پیش نظر تھا۔ اس میں یہ کہ تمام نوع انسانی کی ضروریات کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا بلکہ جو جو ممالک اس کا مرکز تھے خود ان ممالک کے رہنے

یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نقطے پر پہنچنے کے بعد یہ کثرت پیداوار سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت کے کنٹرول سے یکسر باہر ہو جائیگی اور پھر وہ "خود شناس مزدور" کہ جو فطری زندگی کو چھوڑ کر مشین کا کل پرزہ بن گیا تھا، وہ ایک طویل کشمکش کرتے ہوئے منظم ہو چکا ہوگا، جو اس وقت یک قلم سامنے آ کر سارے ذرائع پیداوار پر قبضہ کر لیگا۔ اور پھر ساری دنیا "آنچہ اندر وہم نایدآں شوم" کا مصداق یعنے بہشت شداد بن جائے گی۔

کارل مارکس کی پیشگوئیوں کا تاریخی ابطال

راقم موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی وسعت دادہ شہرت پر ایک اخلاقی و روحانی بلکہ ایک خدائی محاکمہ عرض کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اس راہ میں کارل مارکس کے امت کی ایک دنیا عالمگیر انداز پر حائل ہے (جو غایت ہوشیاری سے ہر بدلتی ہوئی حالت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے) لہذا اس کے جزو جزو کا تجزیہ بھی لازمی ہو جاتا ہے۔ اب ذرا ایمانداری سے اندازہ کیا جائے کہ پورے سو برس کی تاریخ انسانی نے جو نتائج سامنے کئے ہیں انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے مارکس کو اپنے

رائج کردہ مشاغل ومصروفیات بن چکے ہیں۔ اب اسی فضا اور اسی ماحول میں انھیں غیر فطری اور گناہ گارانہ مشاغل میں فی الجملہ قطع وبرید کرتے ہوئے یکسانی پیدا کرنے کی مہم کا آغاز کرنے کے لئے ایک شخصی عالمگیر انداز پر ایک پلین آف ایکشن بناتا ہے جس کا نام کمیونزم ہے۔ مگر اس کمبخت نے غلطی یہ کی کہ اس غیر فطری حالت کو انسان کی عین فطرت قرار دیا اور ایک طرف تو پھر فطری حالت، اخلاقی وروحانی قدروں کے عالمگیر احیاء کی طرف رجوع کرنے کے تمام امکانات کو ختم کرنے پر اپنے سارے استدلال کی قوت کو خرچ کیا اور دوسری طرف اس بات اور واقعہ کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ انسانیت کی اکثریت اب بھی اپنی فطری حالت کے قریب ہے اور وہ شہروں میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں بستی ہے۔ اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد مارکس کی باطل منطق ایک عجیب رنگ اختیار کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ آیندہ کے انقلاب انسانی کے لئے ساری دیہاتی بستیوں کو نااہل قرار دیتا ہے۔ اور انقلاب کے لئے جو عام منصوبہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسانی سوسائٹی کو لازماً اس مقام پر آنا ہوگا کہ جسے سرمایہ دارانہ امپیریلزم عالمگیر کرتا ہے۔ (مارکس اس سرمایہ داری کو پچھلی تمام تاریخ مدنی کا سب سے ترقی یافتہ قدم قرار دیتا ہے) اور پھر اسی نظام کو وہ "کثرت پیداوار" کی کسی مصنوعی بیماری کا شکار بناکر

ہیں۔ حالانکہ وہ انقلاب کثرتِ پیداوار سے نہیں۔ قلتِ پیداوار سے ہوا ہے۔ وہ ایک قحط عظیم اور ایک عالمگیر جنگ میں روسی زراعت کی بے دست و پائی تھی۔ زار کا روس سرمایہ داری کا مرکز ہرگز نہ تھا وہ تو جاگیرداری نظام کا سب سے بدترین اڈا تھا۔ وہاں "خود شناس مزدور جماعت" یا عالمگیر سرمایہ دارانہ مشینری اور کثرتِ پیداوار کہاں؟ اس لحاظ سے وہ تو دنیا کا پسماندہ ترین ملک تھا۔ اس کے بعد دوسرا انقلاب چین کا ہے۔ یہ بھی "زراعتی انقلاب" ہے فیکٹری کے اندر کام کرنے والے "خود شناس مزدور جماعت" کا انقلاب نہیں۔ مشرقی یورپ پر جو قبضہ کیا گیا ہے وہ فوجی قبضہ ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں مشرقی یورپ کے ممالک صنعتی اعتبار سے مغربی یورپ سے بالکل پیچھے ہیں۔ اسکے علاوہ تمام وہ ممالک کہ جو صنعتی اعتبار سے صفِ اوّل میں شمار کئے جا سکتے ہیں وہ تو کمیونسٹ انقلاب سے قاطبتہً محفوظ ہیں۔ اب ان تمام باتوں کو مارکس و اینگلز کی شریعت کی فتح قرار دینے والے اور ان نتائج کو اسی حیثیت سے سارے عالم انسانی کے سامنے پیش کرتے ہوئے مارکسی شریعت کی عالمگیر تبلیغ کرنے والے اگر تاریخ انسانی کے چوٹی کے غلط گو اور جھوٹا پراپیگنڈہ کرنے والے نہیں تو اور کیا ہیں؟ اب یہ فیصلہ کرنا کہ اوّل درجے کے غلط گو مرید تھے یا ان کا پیر ان حروف کے پڑھنے والوں

ظن و تخمین ہیں زیادہ جھوٹا قرار دیا جائے یا اس کی اس امت کو کہ جو آج بھی مارکس کے عقائد پر دنیا کو متحیر کر رکھی ہے۔ اور اس کے قائل انسانیت خیالات کو دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے غالباً ان سطور کو پڑھنے والا ابھی نہ سمجھا ہوگا کہ یہ دونوں کس معنے میں جھوٹے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ وہ اس معنے میں سو فیصدی جھوٹے ہیں کہ اس معیار پر اگر انقلاب ممکن تھا تو اس کا محل امریکہ، انگلستان، فرانس، جرمنی، یا لینڈ ہو سکتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ وہاں ایسا کوئی دور آتا کہ "کثرتِ پیداوار" ساری اپیریل مشنری کو بے کار کر دیتی اور پھر "خود شناس مزدور جماعت" تک قلم سطح پر آ کر ذرائع حیات پر قابض ہو جاتی۔ لیکن کیا دنیا کے ایک چپے پر بھی ایسا انقلاب کہیں ہوا؟ ہرگز نہیں تو کیا مارکس و انیگلز کا یہ تخمین سو فیصدی جھوٹ ثابت نہیں ہوا؟ ہوا اور ضرور ہوا؛ یہ تخمینہ چونکہ فطرتِ انسانی کی فطری حالت کو یکسر نظر انداز کرنے سے قائم کیا گیا تھا لہٰذا سو فیصدی جھوٹ ثابت ہوا مارکس و انیگلز کے دعاوی اس لحاظ سے عالمگیر انداز پر غلط ثابت ہوئے۔ اب آپ غالباً پوچھیں گے کہ ان کی موجودہ امت کو کس معنے میں جھوٹا کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس معنے میں جھوٹے ہیں کہ ۱۹۱۸ء میں روس میں جو انقلاب ہوا وہ اُسے مارکسی نبوت کی فتح کی حیثیت سے دنیا کو منوا رہے ہیں۔ اور اسی فخر کے جوش میں ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتے

کو ختم کرنے کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ عجیب یہ ہے کہ لینن بہادر
اس کتاب میں مارکس کے اقتصادی انقلاب کے تخمینے کو تاریخ
کی ابدی صداقتوں" کی فہرست میں داخل کرتا ہے۔ یہ کتاب
اس نے ۱۹۰۸ء میں لکھی تھی۔ معلوم نہیں کہ ۱۹۱۸ء کے انقلاب
کے بعد اس نے اس ابدی صداقت کی کیا تاویل کی ہوگی۔

تجار و سرمایہ دار طبقے کی اصلاح کے ضمن میں مارکس کی
بحث دھرانا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ حقیقت میں مارکس
اور مارکسزم صرف اسی سرمایہ دارانہ غیر فطری حالت کی پیداوار
ہے۔ اس کا ایک حیلہ فطرت انسانی کی فطری ترتیب سے جوڑ نہیں
کھا سکتا۔ ہاں تو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام شہری کو تعمیر انسانی
کا مرکزی نقطہ تسلیم کرتے ہوئے مذہب یعنے اخلاقی و روحانی
قدروں کا اس پر انطباق بالکل ایسا ہے کہ جیسا حضرت جبریل
کی عبا کو نعوذ باللہ ابلیس کے قدِ ناموزوں پر موزوں کیا جائے
لہذا موجودہ شہریت کو نصب العینی حیثیت سے یکسر نفی کرتے ہوئے
اسے بنیادی ضروریاتِ انسانی کے تقسیم و تبادلے کے مرکز
اور ایجنسی کی حیثیت کی طرف پلٹنے کو نصب العین کی حیثیت سے
سامنے رکھا جائے ورنہ موجودہ شہریت کو جوں کا توں رکھتے
ہوئے انسانیت کے عالم گیر اخلاقی و روحانی احیائے جدید کا منصوبہ
ایک فریب ہو کر رہ جائے گا۔ چونکہ برباد و پریشان و درہم و برہم

کا کام ہے میں صدر میں کسی مقام پر عرض کر آیا ہوں کہ تاریخ انسانی کے اقتصادی عامل کے عمل کیلئے سارے عالم انسانی میں ایک ہموار سطح پیدا کرنا ہرگز کوئی گناہ نہیں بلکہ تاریخ مذہب کا یہ ایک اصول ہے لہٰذا مجھ پر فیوڈل سوسائٹی کا یا سرمایہ دار سوسائٹی کے اثر کا شبہ بھی غلط ہے۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ مارکس اور اسکی امت دراصل تمام اخلاقی و روحانی اقدار کی نفی پر تمام پر کائنات انسانی کا جبری و قہری اتفاق کراتے ہوئے صرف حیوانی تنازع للبقا کو نوع انسانی کا نصب العین بناتے ہیں اور پھر ایک برزخی وقفے کے بعد جس حقیقی رب الارباب پر پوری انسانیت کو متحد کرتے ہیں وہ بے شعور مادے کی ہمہ گیری ہے۔ جس وقت میں نے مضمون شروع کیا تھا اس کے بعد میرے سامنے لینن کی کتاب "مادیت اور تجربی سائنس کی تنقید"

Materialism .. Empirio-criticism

کی کتاب آئی اسے ایک دفعہ میں سال گذشتہ پڑھ چکا تھا۔ لیکن اس مضمون کے دوران میں اسے نہایت درجہ غور سے پڑھا۔ اس کتاب کا حرف حرف اس بات کی تائید ہے کہ مارکس کی مقلد امت "بے شعور مادے" کو ٹھیک اسی علی الاطلاق حیثیت سے منواتی ہے (اور اس کے لئے ہر چیز کو روا رکھتی ہے) کہ جو علی الاطلاق حیثیت مذہب کی تاریخ میں خدا کو حاصل ہے۔ یہ کتاب حقیقت میں مذہب و اخلاق کیطرف رجوع کرنے کے سد امکان

میں جمع کرنے کے لئے چند مدارج بنا دیں۔ مثلاً آمدنی کا دس فیصدی پچاس فیصدی وغیرہ ایسے چند مدارج معین کردیں کہ آمدنی کا ایک معین انداز ہو جائے انشاراللہ وہ بہت جلد اس باب کے صدر میں عرض کی ہوئی دو آیتوں اور ان کے سارے قرآنی متعلقات پر اپنے آپ کو عمل پیرا پائیں گے۔ وہ بہت جلدی رب العالمین کو اپنی ضروریات کا کفیل پائیں گے۔ اس کے ساتھ زرعی پیداوار میں بھی پیدا کنندہ کی ضرورت کی چیز اس کے پاس چھوڑ دینے کے بعد "زاید عفو" کی وصولی کو بھی اسی ایجنسی کا حصہ بنا کر اس سب کو ملی بیت المال بنا دیا جائے۔ امت اسلامی کا بیت المال یہ ہو سکتا ہے۔ جہاں سے ان کی حکومت کے صدر الصدور سے لیکر تمام کارکنان حکومت تک کو روزینہ مل سکتا ہے اور جہاں سے امت کا نادار اور معذور طبقہ بھی اپنی روزی لینے کا حق دار ہو سکتا ہے۔ صرف اسی انداز کا رسے نفع اندوزی کے موجودہ محرک تجارت یعنے نفع اندوزی کو قتل کرتے ہوئے اس کے مقام پر صرف احساس فرض محرک کار بن سکتا ہے۔ ہوس کاری و منفعت اندوزی جس کام کے محرک ہوں وہ ابلیس کا عمل ہے مومنانہ عمل صرف وہ ہے کہ جس کا محرک احساس فرض اور رضائے الہٰی کا یقین ہو۔ اس مقام پر پہنچ کر موجودہ علم الاقتصاد کا سارا فلسفہ

حالت سے قوائے انسانی کو اس کی فطری حالت کی طرف پلٹنا صرف ایک سیاسی و اجماعی انقلاب نہیں بلکہ حقیقت میں اس کے لئے اخلاقی و روحانی قوا کی غایت بیداری و ترقی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ لہٰذا انسانی نصب العین کی طرف انسان ایک خونی و جبری و متشدانہ ہنگامے سے نہیں بڑھ سکتا اس لئے اس نصب العین کی طرف بڑھنے کے دوران میں ضمناً چند اصلاحات سرمایہ و تجارت پر بھی ضروری ہیں۔

(الف) صریح نوصاف و لاشک خلاف اخلاق اشیا کی تجارت و پیداوار کو قطعاً بند کر دیا جائے۔ اور بنیادی ضروریات کی پیداوار اور مہیائی کو حسابی انداز سے تجار طبقے پر عاید کیا جائے۔

(ب) جو تجار اپنے آپ کو شیطان زر و دولت کے پجاری کے بجائے خدا کا بندہ سمجھنے پر قانع ہو سکتے ہیں وہ خود اپنی تنظیم کرتے ہوئے اس طرف قدم اٹھائیں۔

(ج) وہ خود یہ قدم اٹھائیں کہ اپنی آمدنی میں سے اڑھائی فیصدی کی رسمی زکواۃ کے بجائے اپنی آمدنی کا کتنا حصہ بطور زکواۃ کے دے سکتے ہیں۔

(د) اسے کم از کم اڑھائی فیصدی سے شروع کرتے ہوئے اپنی دو وقت کی روٹی کے علاوہ سب کچھ ایک بیت المال

مہیا کی ہے اور طریق عمل تعاون پر مبنی ہے۔ مگر ضروریات
انسانی کی ایک واضح فہرست ان کے سامنے ہے۔ فرض کیجئے
گیہوں چاول مکھن دودھ اور گوشت ترکاری ان کے کھانے کی
فہرست میں داخل ہے اور پہننے کے لئے موسموں کی مناسبت سے
کپڑا بھی بقدر ضرورت موجود ہے باقی تمام سلسلۂ عمل بالکل
صدق و صفا محبت و وفا ایمانداری توکل علی اللہ خدا اعتمادی
و خود اعتمادی صبر و شکر و تسلیم و رضا وغیرہ انسانی صفات
حسنہ کے معیار پر مبنی ہے۔ ہر ہر فرد اخلاقی و روحانی و جسمانی
فرائض کو خود پورا کرتے ہوئے اپنی تمام انسانی صلاحیتوں کو
تکمیل تک پہنچانے میں پوری جماعت کا کامل تعاون اپنے ساتھ
پاتا ہے اس لئے کہ ان تینوں فرائض کو پورا کرنا ہر ہر فرد کا
انفرادی فرض ہے۔ اس بستی پر قنوطیت و یاس کا رنگ مطلق
غالب نہیں بلکہ زندگی کی متناسب و متوازن تعمیر و ترقی کے
ساتھ زندگی کی رفاہیت و آرام کا پہلو موجود ہے۔ ایک طرف نفع
اندوزی کے شیطان کے مرجانے کے اور دوسری طرف سلسلۂ اعمال کو ٹھوس
اخلاقی و روحانی فرائض کے احساس کے ماتحت ادا کرنے کی
مشق و تمرین نے ہر ایک کی زندگی کو ایک سدا بہار پھول بنا
دیا ہے۔ زندگی کا ایک معیار یہ ہے۔ مگر یہاں رقص و سرود
کی محفلوں سینماؤں اور شراب خانوں قحبہ خانوں اور قمار بازی

علی الاطلاق باطل ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اساس ہوس کاری ہے۔ اس مقام پر پہنچکر تمام وہ ماہرین اقتصادیات کہ جو موجودہ نظام سرمایہ داری کے پیداوار ہیں تعجب نہیں کہ ایک زبان ہوکر کہدیں کہ اس طرح تو انسانی ترقی کا سلسلہ رک جائے گا۔ میں ان کے سامنے انسانی زندگی کی دو مثالیں پیش کرتے ہوئے اور اس پر ایک سوال کرتے ہوئے اس باب کو ختم کرتا ہوں۔

مادیت کی دو مثالیں

(۱) فرض کرو دس ہزار انسانی نفوس پر مشتمل ایک بستی بسائی جاتی ہے۔ مکانات وغیرہ میں پوری فطری سادگی موجود ہے۔ مگر تعمیر میں تمام مکانات میں مساوات کا رنگ بنیاداً نمایاں ہیں۔ اس کے اردگرد پانچ پانچ میل تک سرسبز کھیت ہیں، جن میں یہاں کے تمام صالح جسم کے انسان مادی انداز پر کام کرتے ہیں۔ آمدنی یعنے پیداوار سب بستی کی مشترک چیز ہے اور ایک مشترک بیت المال میں جمع ہوتی ہے اور سب کو بقدر ضرورت اس میں سے حصہ ملتا ہے۔ پوری بستی کے تمام سلسلۂ عمل و دخل میں سے نفع اندوزی کا محرک رضاکارانہ طور پر ختم کردیا گیا ہے۔ سعی و عمل کا محرکِ تمام زندگی کی، ایما ندارانہ انسانی ضروریات کی

کہ اس میں بڑے بڑے وکلا و فلاسفرز اور بڑے سے بڑے آرٹسٹ اور بڑے سے بڑے مصنف بھی موجود ہیں مگر اس چہل پہل کی بنیادوں میں کوئی اخلاقی و روحانی ترتیب نہیں نہ اصولاً ضروریاتِ انسانی کی مہیائی اور اس کے تقسیم و تبادلے کا کوئی مضبوط داعیہ یہاں کار فرما ہے۔ البتہ ان تمام کے لئے قدم قدم پر رقص و سرود خانے، شراب خانے و قحبہ خانے قمار بازی و سٹہ بازی، سود خواری وغیرہ کے مراکز موجود ہیں۔ ہزار در ہزار دکانیں اور فیکٹریاں ایسی ہیں کہ جن میں اسی معیار پر چیزیں خرید و فروخت کی جا رہی ہیں اور پیدا کی جا رہی ہیں۔ نفع اندوزی کے خیال سے اس شہریت میں شامل ہونے والے اپنے مقصد میں اتنے کامیاب ہیں کہ ان میں سینکڑوں لوگ ہنری خورد و راک فیلر، سر آغا خاں اور نظام دکن سے بھی زیادہ زردار ہو گئے۔ عیش طلبوں کے لئے رقص و سرود، شراب زناکاری قدم قدم پر موجود ہے۔

دنیا بھر کے ماہرینِ اقتصادیات سے میری گذارش ہے کہ وہ مجموعی فلاحِ انسانی، مجموعی امن و عدل و رفاہیت و نظمِ انسانی کے متعلق اپنے ہر اخلاقی و روحانی احساس و ذمہ داری کو ہر ممکن حد تک بیدار کرتے ہوئے ہر مکر و تاویل کا پردہ چاک کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیں کہ صدر کے دو مثالی شہروں

کے اڈوں سٹہ بازی و سود خواری کے مرکزوں لپ اسٹک اور پاؤ ڈرز پیدا کرنے کے کارخانوں کا نام نشان نہیں۔ بلکہ ایسی تفریحات کو شیطانی اعمال کی حیثیت دینے کے بعد نہ صرف عملی سوسائٹی سے خارج کر دیا گیا ہے بلکہ خیال کی کائنات سے بھی شیطانی وسوسے قرار دیکر نکال دینے کی کوشش کر دی گئی ہے۔ پوری بستی کا ایک واضح میثاق ایسا موجود ہے کہ جو ان چیزوں کو اینٹی سوشل قرار دے کر ختم کر دیتا ہے۔ ہاں کبڈی ہے، کشتی ہے، دوڑ ہے، فٹ بال ہے غرض حیات جسمانی کی نشو و نما کا پورا خیال نہایت صحت ورانہ انداز میں موجود ہے۔ وہ عملی چارٹر کا جزو ہے۔ یہی نہیں بلکہ زندگی کی تفریح کے وہ تمام پہلو جائز ہیں جو زندگی کے اخلاقی و روحانی فرائض سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

(۲) ایک ماڈل یہ ہے کہ محض حرص و ہوا، نفع اندوزی وعیش و عشرت کے خیال کے باعث ۳۰ لاکھ کا ایک شہر بس گیا ہے۔ اس تمام بستی کے عمل و حرکت کا بنیادی محرک صرف نفع اندوزی و حرص و ہوا اور عیش و تفریح ہے۔ ان پر کم از کم ٹھوس اخلاقی و روحانی قدروں کا نہ کوئی محاسبہ ہے نہ پابندی۔ اپنے اپنے عیش و آرام کے لئے جو جس قسم کے پیشے کو سود مند دیکھتا ہے کر گذرتا ہے۔ مجھے اس سے مطلق انکار نہیں

اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور بنی نوع انسان میں سچ مچ عالمگیر انداز پر اعتماد باہمی کی فضا پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ لہذا آج کی عالمگیر انسانی ضرورت موجودہ شہریت کو کاملاً پراگندہ کرنا ہے اور ایک عالمگیر بچے تلے منصوبے کے ماتحت پراگندہ کرنا ہے۔ کائنات انسانی کے پیشوں اور مشاغل (occupation) پر ایک سخت تجزیہ کرتے ہوئے انھیں پراگندہ کرنا ہے۔ میں اس مقام پر اپنے اصل مقصد کو پھر مختصراً دہرا دوں۔ میں اگر شہریت کا ایک معین ماڈل عرض کر رہا ہوں تو اس سے میری اصل مراد صرف اس قدر نہیں کہ میں اقتصادی توازن کو نظم انسانی کا مقصد بنانا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو پوری کتاب میں یہ عرض کرتا چلا آیا ہوں کہ نظم انسانی کا نوعی نصب العین صرف اخلاقی و روحانی شعور کی غایت درجہ بیداری و ترقی کے ذریعہ مقام رضائے الٰہی کی طرف نوعی طور پر پلٹنا ہے۔ میں یہ بھی عرض کر آیا ہوں کہ تمام اخلاقی و روحانی فرائض کو اپنے اوپر عاید کرتے ہوئے رضائے الٰہی کے مقام کی طرف حرکت کرنا بنی نوع انسانی کی نوعی تدبیر ہے۔ یہ صرف افراد کی مونوپلی نہیں ہاں نوعی طور پر عالم انسانی کو اپنے اس فطری مقام کی طرف حرکت دینے کے لئے بندہ و آقا غریب و امیر حاکم و محکوم پیچھے والے پیر و پوجنے والے مرید کے سارے غیر فطری سلسلہ عمل

میں سے کون سا شہر حقیقی ارتقائے انسانی کا نمونہ ہے اور کون صرف مکر و ریا، بے ایمانی و دغا بازی، خود غرضی و اخلاق سوزی پر "ترقی" کے لفظ کا ایک رنگین پردہ ڈال کر حقیقت میں انسانیت کی ہلاکت کی راہ پر لیجا رہا ہے ؟ یہ ہے وہ بنیادی سوال کہ جسے عالم انسانی کی کسی لیگ آف نیشن یا ادارۂ اقوام متحدہ کو سب سے اول حل کرنا ہے۔ ہاں ہاں فساد ملتِ انسانی کو مستقل امن کی طرف پلٹنے کے لئے صرف اور محض یہی سوال بنیادی ہے۔ باقی سب سوالات اس کے ضمن میں حل ہو جاتے ہیں۔ اور اس سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے امن و عدلِ انسانی کو بحال کرنے کے لئے انہیں اخلاق باختہ حلقوں میں جو مساعی کی جا رہی ہیں وہ یا تو جہالت کا نتیجہ ہیں اور یا خود غرضی و مکاری ظلم و بے انصافی پر "مساعیٔ امن" کے نام سے ایک مغالطہ انداز پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ ظالم طبقات مختلف حیلے بہانے بنا کر اپنی اپنی غلط پوزیشن کو محفوظ کرنے کی مساعی میں لگے ہیں۔ لیکن اگر صدر کے معروضے کی طرف قدم اٹھایا جائے تو قدرتاً افراد و اقوام کی باہمی بدظنیوں کی مقدار کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اس وقت اقوام متحدہ میں زبانی زبانی اقوام عالم کو غیر مسلح کرنے اور عملاً سر سے پاؤں تک مسلح کرنے کی جو جو فروشی گندم نمائی ہو رہی ہے۔

اخلاقی و روحانیت کے حقیقی نصب العین انسانی کیطرف عود
کرنے کے ہر امکان کو قتل کردے۔ اسے اگر اپنے منصوبے کے
لئے کوئی بڑے سے بڑا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ یہی اخلاقی
و روحانی قدروں کے احیا کا خطرہ ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام
کو اپنے وقت تک کی تاریخ انسانی کا آخری نقطۂ ارتقا سمجھتا
ہے۔ اور اس کا طبعی دوسرا قدم "خود شناس مزدور طبقے" کی
جبری ڈکٹیٹر شپ کے ماتحت ایک کامل مادی انقلاب کو
قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ نوع انسانی کو مادے کی ہمہ گیری
کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہوا یہ فتویٰ صادر کرتا ہے کہ اس مقام
پر پہنچنے کے بعد تاریخ انسانی کا ہر تضاد ختم ہو کر انسان اپنے
نقطۂ ارتقا کے آخری زینے پر جا پہنچتا ہے گویا موجودہ مدنیت
اس کے نزدیک آج تک کی تاریخ کی افضل ترین چیز ہے۔ اس میں
خرابی یہ ہے کہ وہ اخلاقی و روحانی قدروں کی طرف رجوع کرنے
کے جراثیم اب بھی اپنے اندر رکھتی ہے جنہیں مارکس حذف و نفی
کرتے ہوئے اگلے قدم کے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔ لیکن
میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ مدنیت اپنی
فطری و اصلی غرض و غایت (ضروریات انسانی کے تقسیم دینا لے
کی یکجہتی اور مرکزیت) سے منقطع ہو کر صرف نفع اندوزی و ہوا و
ہوس اور عیش و عشرت کے نقطے کے ارد گرد سمٹ آئی ہے جو مقام

کو بدل دیتا ہے ۔ عالم انسانی کے اخلاقی و روحانی احساس وشعور کو غایت درجہ بیدار کرتے ہوئے اس غیر فطری سلسلے کو فطرت حقہ سے بدل لیتا ہے ۔ لہذا مدنیت کا میرا نصب العین غایت درجہ خداپرستی اور غایت درجہ اخلاقی بیداری کو مقصد بناتا ہے اس کا مقصد صرف اقتصادی عامل کے توازن کو بحال کرنا مطلق نہیں

مارکسی توازن اقتصادی اور اس توازن اخلاقی میں فرق

مارکس فیوڈل سوسائٹی کے خاتمے مشینری کے آغاز اور سرمایہ دار سوسائٹی کے ابھر کر ذرائع حیات پر قابض ہو جانے کو ارتقائے انسانی کا آج تک کا آخری نقطہ سمجھتے ہوئے اس انداز پر جمع شدہ ذرائع پیداوار پر مزدور طبقے کے ذریعے جبری قبضہ کراتا ہے اور پھر ایک نئے اقتصادی توازن کو عالم انسانی کا نصب العین بناتا ہے ۔ وہ اپنی اس کوشش میں ضمنی طور پر ایک جان توڑ کوشش اس بات کے لئے کرتا ہے کہ مذہب و اخلاق و روحانیت کے وجود کے متعلق موجودہ بیدار شہریت میں جو کچھ بچا کھچا اعتقاد و عمل باقی رہا ہے اس کی بھی کلی نفی کر دے اور اپنے عالمگیر نظم انسانی کے منصوبے میں مذہب

حیات دنیا بالکل آنی ہے۔ مگر حیاتِ ابدی کا یہی واحد دیباچہ بھی ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ اس ابدی سلسلے کی کامیابی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ یہاں کی حیاتِ آنی کو کامل ایمانداری سے گذارے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا پورا ضابطہ صدق و عدل، شفقت و رحمت محنت و جد و جہد و ایمانداری، ذخائرِ دنیا کو مقصودی نظر سے نہ دیکھنے میں ہے۔ گویا وہ مخصوص اخلاقی و روحانی قدروں سے ہی اپنا ضابطۂ حیات بنا کر مصروفِ حرکت و عمل ہوتا ہے۔ حیات کے ابدی یقین نے غم و غصے اور حزن و خوف کی تمام بیماریوں سے اسے نجاتِ کلی دے رکھی ہے۔ وہ سادہ سے سادہ انسان ہونے پر یکسوئی و خوشی کا مجسمہ ہے

(۲) ایک انسان ایسا ہے کہ وہ ان میں سے ایک بات پر بھی یقین نہیں رکھتا۔ بلا شک وہ سر سے پاؤں تک جد و جہد، حرکت و عمل ہے۔ مگر جب اس کے محرکات اعمال کا تجزیہ کیا جائے تو یہ محرکات ہوا و ہوس طبقاتی و انفرادی نفرت اور افراط حرص و نفع اندوزی کے سوائے کچھ بھی نہیں[۲]۔ ادھر ظاہر میں اس کی حالت یہ ہے کہ سارے سامان راحت و آرام اس کے پاس موجود ہیں وہ جب چاہتا ہے اڑتالیس گھنٹے میں دہلی سے نیویارک جا پہنچتا ہے اور وہاں کے سارے تفریحی مشاغل میں شرکت کر سکتا ہے گویا ساری دنیا کی

۲۔ مارکس کے نزدیک ڈیکارڈو وغیرہ کی طرح محرکِ عمل صرف خود غرضی ہے۔

انسانی کے لحاظ سے نہایت درجہ گراوٹ ہے۔ اُسے حتی المقدور اپنی اصلی غایت کی طرف پلٹتے ہوئے نفع اندوزی ہوا و ہوس اور عیش و عشرت کی آمیزش سے پاک کرنا ضرورت کا ایک پہلو ہے اور اس کے متوازی مدنیت کے ایسے قدر کی نمونے چاروں طرف قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جن کی بنیادی اخلاقی روحانی قدروں کی نصب العینیت پر قائم ہو اور اس طرح پوری تاریخ انسانی میں اخلاقی و روحانی قدروں کا جس قدر ٹھوس مواد ملتا ہے نوعی تعمیر انسانی کا پورا چارٹ صرف اسی ٹھوس مادے سے تیار کرنا ہے اور اس مقام پر ان کے قدموں کو مضبوط کرتے ہوئے پورے نوعِ انسانی کو حصولِ رضائے الٰہی کے مقام کی طرف پلٹ دینا ہے جو حیاتِ ابدی کا مقام ہے۔ امید ہے کہ میرا مفہوم پوری طرح واضح ہو چکا ہے (اس پر بھی میں بالکل انفرادی زندگی کی دو مثالیں بھی عرض کرتا ہوں تا کہ سارا معاملہ یک بارگی صاف ہو جائے

انفرادی سیرت کی دو مثالیں

(۱) ایک ایسا انسان ہے کہ جسے اپنے سارے عیوب و حضور پر خدا کے علم کے حاوی ہونے کا حق الیقین ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اپنے ہر ایک جزوی سے جزوی عمل میں خدا کے سامنے جواب دہ ہو گا۔ اسے یہ بھی حق الیقین ہے کہ

علما و فقہا و مجتہدین کے دائرے کی بنیادی اصلاحات

(۱) كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ؕ

۱۔ مطلب خیز ترجمہ :۔ "کائنات انسانی ایک ہی جتھا تھا (ان کا ایک قدرتی نصب العین اور ایک طریق کار تھا مگر بعد میں انہیں اختلاف پیدا ہو گیا) تو اللہ تعالیٰ نے انبیا کو بھیجنا شروع کیا جو مبشر و منذر تھے۔ ان کے ساتھ اس نے کتاب بھی بھیجی تاکہ وہ ملت انسانی کے اختلاف پر اپنا محاکمہ دے"

(۲) إِنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۔

(۲) ترجمہ :۔ (اے گروہ انبیا) یہ تمہارا جتھا ایک ہی جتھا ہے اور میں تمہارا (ایک ہی) رب ہوں۔ اس لئے مجھ ہی کو قاضی الحاجات سمجھو (مگر یہ جتھا اس وحدت پر قائم نہ رہا) اور انھوں نے اپنے نوعی نظم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے

شعور واحساس اور ان کے مظاہر کی کامل بیداری و تقویت کرتے ہوئے انھیں کو نظم انسانی کا رابطہ بنانے کے انداز پر بنا ہوا اتحاد قرآنِ مجید اور محمدؐ ای زاویے نگاہ کو اپنی عملی جد وجہد کا نقطہ آغاز بناتے ہیں اور تمام انبیا کی ساعی کا سنگِ بنیاد بھی اسی کو بتاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی دونوں صدر کی آیتیں ان دونوں باتوں کو پوری وضاحت سے ظاہر کر رہی ہیں۔ محمدؐ اور صدیقؓ و فاروقؓ کی تمام مساعی بالبداہت والاظہار اسی سعیٔ عالمگیر کا بہترین نمونہ تھیں۔

اپنی تعلیم کے اس ایجابی پہلو کے ساتھ قرآنِ مجید جہاں لاتفرقوا کہتا ہے وہ اسی ایجاب کا سلبی پہلو ہے اور اپنے دائرے میں یہی وسعت رکھتا ہے۔ اسے بھی اگر اسی انداز کا سلبی پہلو نہ سمجھا جائے تو انسان بدترین مغالطات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور آج ہم لوگ اسی عذابِ عظیم و تنگ نظری میں خود گرفتار ہیں بلا شائبہ ریب اگر علمائے امت صدر کی چند باتوں کو کاملاً دل نشین کرلیں اور نوعی اتحادِ انسانی کے ایجابی و سلبی پہلو کی اس وسعت کو بھی کاملاً اپنے سامنے رکھ لیں اور پھر اپنے مولا سے مسلسل توفیق خیر مانگتے ہوئے ایک عالمگیر شورائیت اس مقصد کو سامنے رکھ کر کریں کہ امت اسلامیہ کے اندر سے ہر غلط تفرقے کو ختم کرتے ہوئے اسے مرکزی محکماتِ دین پر سو فیصدی متحد و متفق کریں اور پھر

سہ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

محمد رسول اللہؐ کے رب العالمین سے شروع ہونے والا قرآن؛ یا قرآن کو نظمِ انسانی کا سنگِ بنیاد بنانے والے محمد رسول اللہؐ عالمِ انسانی کو صرف اس نظر سے پیش کرتے ہیں اور اسی انداز سے دیکھتے ہیں وہ دینِ انسانی کو حقیقی وحدتِ انسانی کے نوعی ادارے کی حیثیت سے دیکھتے اور دکھلاتے اور اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کے داعی ہیں۔ اپنی زندگیوں کو اسی رابطۂ نوعی کا ایک عالمگیر نمونہ بناتے ہوئے اسی وحدت کی طرف سارے نوعِ انسانی کو بلانے کی وہ تمام افرادِ انسانی کو دعوت دیتے ہیں۔ روٹی بیٹی کے معاملے کی مقصودیت پر دعوتِ اتحاد؛ ہرگز نہیں قومی ضبط و استحکام کے لئے دعوتِ اتحاد ہرگز نہیں۔ پھر کسی مقصد کے لئے اور کس طریقِ کار کا اتحاد اُن کا مقصد ہے؛ جامع جمیع صفاتِ کمال اور منزہ عن جمیع نقص و زوال قادر علی الاطلاق و مجیب الدعوات خدا کی رضا جوئی کے نصب العین پر اتحاد ان کا مقصد ہے (اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کا فطری و قدرتی نصب العین صرف یہی ہے۔ روٹی بیٹی کا معاملہ یا قومیت کا معاملہ حیاتِ حیوانی کے خواص کی فہرست کا حصہ ہے جو حیاتِ انسانی کی خصوصیات سے خارج ہے) کس انداز کا اتحاد؛ نوعِ انسانی کی تمام اخلاقی و روحانی

نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے امت کا مجموعی طریقِ عمل "اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ" مقرر ہو چکا ہے۔ خود نبی کو "شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ" کہہ کر تدبیری امور میں اس کا پابند کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا نبی آخر الزماں اس پر سکوت تام فرماتے ہیں۔ تمام اصحابہ اس پر سکوتِ تام فرماتے ہیں اور اس طرح یہ امر واقعہ اجماع امت کے درجے کو بھی حاصل کر جاتا ہے خود دورِ فاروقی سے آخر تک پوری سختی کے ساتھ اسی پر عمل در آمد رہتا ہے اور دورِ فاروقی کے اس عمل پر بھی اجماع امت رہتا ہے۔ یہ وہ اجماع امت ہے کہ جو حقیقی امت کا اجماع ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد امت ایک اضافی مفہوم ہے مگر خلافتِ راشدہ یا دورِ فاروقی کے خاتمے تک امت کا مفہوم حقیقی معنے رکھتا ہے اگر اخلاقی و روحانی قدروں نے تاریخ انسانی میں کبھی ایک جماعتی کلیت کی شکل و سیرت اختیار کی ہے تو وہ محض محمدیؐ دور ہے جو عمرِ فاروقؓ کی شہادت تک محفوظ ترین شکل میں چلتا ہے۔ اگر عمرِ فاروقؓ کے اس عمل میں ایک نقطہ اخفائے حق کا ہوتا یا اس میں بطلان کا پہلو ممکن ہوتا تو وہ لوگ جو ڈیڑھ گز کپڑے کی خیانت کے شبہے پر عمر کو بر سر ممبر جواب دہ ہونے کے لئے اس وقت مجبور کر دیتے تھے کہ جب وہ خلیفۃ المسلمین بن چکے تھے۔ وہ عمرِ فاروق کی تکہ بوٹی کر دیتے۔

اسی اتحاد انسانی کی دعوت کو ایک سمجھے تلے انداز اور متعین ترپروگرام میں سارے موجودہ عالم انسانی کے سامنے بالعموم اور تمام اقوام مشرق کے سامنے بالخصوص پیش کریں۔ اور بالکل صدیقؓ وفاروقؓ کے انداز پر اس تحریک کو چلائیں تو یقین مانو کہ فلاح انسانی کا وقت آپہنچا۔ اس کوشش کا کم سے کم پھل یہ ہوگا کہ امت اسلامی کا موجودہ انتشار ختم ہوکر اس میں ایک عالمگیر مرکزیت حقہ پیدا ہو جائے گی۔

صرف محکماتِ قرآنی پر بنیادی اتحادِ امت کا خاکہ

تاریخِ اسلام کے دو مسلم الثبوت واقعے بنیادی توجہ کے قابل ہیں۔ خاتم النبیینؐ مرض الموت میں گرفتار اور قلم و دوات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ کچھ تحریر فرمادیں دین کے بارے یا تدبیر امت کے بارے میں کوئی بات امت کو بتانا چاہتے ہیں۔ یہ بات وحی نہیں بلکہ آپ کی اپنی شخصی صوابدید ہے۔ وحی اس لئے نہیں کہ وحی کی حالت سب صحابہ جانتے تھے۔ اس میں چوں چرا کی گنجائش نہ تھی۔ مگر عمر فاروقؓ حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر اس تکلیف کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس موقع سے بہت پہلے "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ

لہٰذا علما و فقہا و مجتہدین کے دائرے کی بنیادی اصلاح ان کا محکماتِ قرانی پر متحد ہونا اور محکماتِ قرانی پر اتحاد کرتے ہوئے اور انھیں تعمیرِ امت کا بنیادی دستور قرار دیتے ہوئے قران کی لازمی ابتدائی تعلیم کی راہ امت کے لئے کھولنا ہے۔ قران مجید کی محض لازمی تعلیم سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بلکہ پہلے علماء محکمات کا تعین کریں۔ اس پر عالم گیر انداز کا اتحاد کریں انھیں تعمیرِ امت کا دستور بنائیں اور پھر "حسبنا کتاب اللہ" کی اسی نئی روشنی میں قرانی تعلیم کو عام کریں۔ اس سعی ماجور کا کم سے کم جو نتیجہ امت کے لئے ہوگا وہ اس قدر ضرور ہوگا کہ ہمارے تمام جدا جدا نظاماتِ فقہ میں جو خیر کار فرما ہے وہ ایک ہی دائرے میں سمٹ آئیگا۔ اتنا خیر تو کم از کم امت کو حاصل ہوگا اور پھر عرصے تک نئے نئے خودسر و خودغرض و خبیث الباطن فرقوں کے قیام کا شر ختم ہو جائے گا۔

شیرازۂ کار

روحانیت و خانقاہیت کے درجے کی اصلاح کے متعلق کچھ عرض کر چکا۔ سیاست سرمایہ داری کے متعلق بھی کچھ عرض کر چکا۔ علما و مجتہدین کے دائرے کے متعلق بھی کچھ عرض کر چکا یعنی محکماتِ قرانی پر اتحاد

چہ جائیکہ اُسے خلیفہ تسلیم کرتے۔ ہاں یہ ہے امت کے وجود کا وہ دور حقیقی کہ جہاں ایک طرف پوری جماعت کی سیرت محکمات قرآنی کا نمونہ ہے اور دوسری طرف اس کے سامنے اپنی ہدایت کے لئے قرآن کے علاوہ اور کسی چیز کو نظری حیثیت سے لانا حرام مطلق قرار دیا جاتا ہے۔ اس پر حقیقی امت کا اجماع ہے۔ اعتقادی بھی، علمی بھی اور نظری بھی۔ اور جب تک روحانیت، سیاست، شریعت کے تینوں دائروں میں ایک کامل اصلاح کرتے ہوئے اور اس اصلاحی پروگرام پر اتحادِ امت کرتے ہوئے آپ امت کو پھر صدیقؓ و فاروقؓ کے دور سے مربوط نہیں کرتے اس وقت تک امت کا پھر اپنے مقام پر آنا اور مغربی امپیریلازم اور روسی دہریت کی دو ضدوں کے درمیان "کذالک جعلناکم امتہ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس" کے مقام پر کھڑا ہو کر اعتدال کا ایک نیا نظامِ عدل قائم کرنا ایک محال ہے آج اقتصادی دائرے میں امت کے مجموعی عمل کے مقابل ہمارے مفلس عوام کے لئے روسی نظام میں کہیں زیادہ جاذبیت ہے اور سیاست کے دائرے میں مغربی جمہوریت ہمارے سوزاک خوردہ اور آتشک زدہ رؤسا کے مقابل کہیں زیادہ عوام کو آزادی دیتی ہے۔ اس لئے افرادِ امت کا اجماعی حیثیت سے ان دونوں کی طرف اپنے اپنے احوال کے ماتحت کھچ جانا بالکل قدرتی بات ہے۔

الایمان والحکمۃ واعنہم علی عدوک (ابلیس لعین) وعدو
ہم (نفس امارہ)" کو اپنا دور دنیا بنائے۔ انشاء اللہ یہ زمین وآسمان
بدل جائے گا انشاء اللہ بیس پچیس برسوں میں چین وماچین
سے مراکش تک ایک خدائی اتحاد قائم ہو جائے گا۔ عجب نہیں
کہ ہندوستان کا برہمن ہی اس تحریک کو چلائے۔ آخر پہلے بھی
تو ایسے بڑے بڑے انقلاب بڑے بڑے برہمن گھرانوں سے ہی
شروع ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیم جو موجودہ کائنات کے سب سے
پہلے موحد تھے، وہ بھی تو ایک بت گر و بت فروش گھرانے کی
پیداوار تھے۔ سید الانبیاء خاتم الرسل اور مکمل دین انسانی بھی
تو تاریخ کے ایک بہت ہی بڑے مرکزی تیرتھ کے پجاری خاندان
میں پیدا ہوئے تھے۔ لہذا آج اگر ہندوستان کے برہمن اس امانت
کو موجودہ امت اسلامی سے ملکر، ایک جامع تر شکل دیتے ہوئے
ایک طرف خالص تبلیغی اساس پر ایشیا و افریقہ کو متحد کرنے کا کام شروع
کریں تو دوسری طرف ایک نئی مختصر سی اقوام متحدہ کی تنظیم کرتے ہوئے
اس امانت کو اس کا چارٹر بناتے ہوئے سارے عالم کے سامنے بھی
اسے لے آئیں تو کونسی تعجب کی بات ہوگی۔ ۳۳ کروڑ خداؤں اور ۳۳
کروڑ خاندانوں کے انارکسٹ تصورات سے کلی ردعمل کرتے ہوئے
ایک خدا اور ایک عالمگیر انسانی بھائی کے نظام پر اس طرح متحد
ہونا سیاسی جمہوریت کے داعی برہمن کے لئے تاریخی عمل کے لحاظ سے

اب تینوں اصلاحات کی شیرازہ بندی اس طرح کی جائے کہ ان تینوں دائروں کے منتخب و مسلمہ افراد ایک عالمگیر شورائیت کرکے اس پر مہر تصدیق ثبت کریں اور پھر اس مصدقہ شیرازے کو پوری امت کے سامنے عمل کے لئے پیش کر دیا جائے۔ شخصی تفرقہ پردازیوں اور نقطہ آفرینیوں کو حرام مطلق قرار دیا جائے ہاں کوشش یہ ہو کہ اس شورائیت کو اس درجہ ہمہ گیر کیا جائے کہ امت کی ساری بہترین عملی و اعتقادی صلاحیتیں اس میں سمیٹ لی جائیں۔ جب شخصی نمود و اظہار اور اقتصادی نفع اندوزی کو صدر میں عرض کردہ طریق سے منفی کر دیا گیا ہو تو پھر اس جماعت المسلمین کی مرکزی شورائیت میں سارے خیروں کا جمع ہو جانا ایک فطری بات ہوگی۔

پانی وہاں پہ مرتا ہے جہاں نشیب ہو

قرآن کی محکمات کو اور اپنے دائرے کی عملی اصلاحات کو عملاً بروئے کار لاتے ہوئے امت کو دعوت اتحاد دی جائے تو فطرتِ انسانی اس طرح ایک مرکزیت حقہ پر سمٹے گی کہ جیسے ایک پیاسا پانی کے کسی شفاف چشمے کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہر ہر فردِ امت سے لئے لازمی ہونا چاہیے کہ وہ

اللّٰهُمَّ اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِهِمْ

کرے یا رنجشیاں دور کرے اور ایسے کسی سمجھوتے پر انھیں متفق کرے۔ اللھم اصلح ذات بیننا وجعل فی قلوبنا الایمان والحکمہ۔

آج کی عالمگیر فضا میں عرض کردہ انداز کی شورائیت امت کا فرض ہے

جب تک ملوکیت اس درجہ قوی تھی کہ ایک عالمگیر شورائیت کرتے ہوئے تنظیم ملت کو علی منہاج الخلافت چلانے سے ناقابل شکست روک بن جاتی تھی اس وقت تک تو دین ایک متوور قوت کی شکل میں چلنے کے لئے مجبور تھا۔ لیکن آج جب سارے عالم میں سے اس رکاوٹ کو نیست نابود کیا جا چکا ہے اور کیا جا رہا ہے تو زعمائے امت پر فرض ہو گیا ہے کہ اس شورائیت کا عالمگیر انداز پر انتظام کریں۔ اور ملت و دین دونوں کو جسم و روح بناتے ہوئے ایک ہی ادارے کے ماتحت لے آئیں۔ صدریں صوفیا و سیاسین، سرمایہ دار اور علمائے کرام کے تین دائروں میں جو مختصر و متعین اصلاحات عرض کی گئی ہیں، میں نہیں سمجھتا موجودہ عالمگیر فضا کو دیکھتے ہوئے ان میں کوئی بھی عملی رکاوٹ ہے۔ اگر ماؤزے تنگ چین کا ڈکٹیٹر ہوتے ہوئے بھی اپنے

ایک طبعی چیز معلوم ہوتی ہے۔ جو بت پرستانہ تصورات ساری
کائنات سے ختم ہو چکے ہیں، ہندوستان کا ان پر آج تک جوں
کا توں قائم رہنا ظاہر کرتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے اس قوم
کو کسی عالمگیر انقلاب کے لئے مخصوص (Reserved) کر رکھا ہے
آج عالم انسانی کو کسی ایسی قوم کی ضرورت ہے کہ جو بالکل تازہ
دم ہو اور وہ قرآن مجید جیسی کتاب کو اپنا کلی ضابطۂ حیات
بتاتی ہوئی اٹھے اور موجودہ عالم انسانی میں ایک مبلغ عنصر کی حیثیت
سے پوری طرح نفوذ کرتی ہوئی سارے عالم انسانی کو سچ مچ
ایک اخلاقی وفاق میں لے آئے۔ بلا شک آج عالم انسانی میں
ہندوستان ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں لاکھوں انسان ایسے ملیں گے کہ
وہ دنیاوی تعلق کو منقطع کرتے ہوئے روحانی سکینت کی تلاش
میں جنگلوں میں اور دور دراز دریاؤں کے کنارے جاکر ڈیرے
ڈال دیتے ہیں۔ یہ ترک و تیاگ کی روح بے معنے نہیں حق کی
اشاعت کے لئے یہ شرط اول ہے۔ لہذا اگر ایسی ملت قرآن کے
توحید واخوت و خلافت ارضی کے نظام کو اپنے اوپر حاوی کرتی
ہوئی سارے عالم انسانی میں اسے رائج کرنے کے لئے سر بکف ہو کر
نکلتی ہے تو یقیناً عالم انسانی کے موجودہ خوں آشام ابتلا کی تاریک
تارات میں ایک صبح روشن کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔ کاش اللہ تعالیٰ
پاکستانی مسلم لیگ اور ہندوستانی کانگریس کے درمیانی مجادلات کو ختم

(ب) غایت درجہ محبتِ نوعِ انسانی۔ یہاں تک کہ اپنی اس برادری کے خیر و فلاح کے لئے انسان کسی وقت بھی اپنی زندگی کو قربان کردے۔ اس کی ابتدا یہ ہے کہ ہر ایک انسان کے ناموس و عزت و جان کو اپنے ناموس و عزت و جان کے برابر سمجھے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ دوسرے کے عزت و ناموس و جان کو بچاتے ہوئے خود قربان ہو جائے (ذرا محمدی تاریخ کو اس نگاہ سے پڑھئے)

(ج) اپنے بقائے حیات کا سامان کرنے کے لئے انسان ہر جائز جد و جہد کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ انسانی دین صرف توحید و اخوت و خلافتِ ارضی کے تین تعلقوں کے عملی تعین کا نام ہے اور اس کی کامل ترین تعبیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ الاسلام ہے

شورائیت کی دو احتیاطیں

ا۔ پہلے صرف ان فرائض و واجباتِ اخلاق و روحانیت کو معین کیا جائے کہ جو تمام انبیا کی تعلیم میں موجود ہیں اور جس نے تمام قرآن کے صفحات بھر رکھے ہیں۔ صدر میں جہاں کمیونسٹوں کے نظم کا انسانی نظم سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ وہاں سرسری خاکہ موجود ہے لیکن ان کی پوری تفصیل قرآن سے جمع کرلی جائے

آپ کو سات سو روپے ماہوار کے درجے پر لا سکتا ہے اور وہاں کے چپراسی کو ایک سو روپیے دینے پر راضی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ زندگی کے ہر عمل صالح کے لئے "اَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ" (کبھی نہ ختم ہونے والے اجر) کے قائل ہیں وہ کس طرح اس چیلنج کو منظور نہ کریں گے۔ اور اگر انھوں نے خدا نہ کردہ ایسا کرنے سے انکار بھی کر دیا تو یہ کھیل زیادہ دیر تک مطلق نہ چلے گا۔ اس لئے کہ جمہور میں اتنی بیداری آ گئی ہے کہ اب کنبہ پرور سیاست ختم ہو کر رہے گی اور ایک فرض شناس خدا پرست سیاست باقی رہے گی۔

شخصی اقتدار کا سارے عالم انسانی سے جنازہ نکل چکا ہے جمہوری حقوق و فرائض کا سارے عالم میں ڈنکا بج رہا ہے مگر یہ حقوق و فرائض نہیں یہ جمہوری ہوا و ہوس ہے۔ پہلے شخصی ہوا و ہوس کا جماعت پر غلبہ تھا۔ اب جماعتی ہوا و ہوس فردیت کو قتل کر رہی ہے۔ عبودیت و بندگی اتباع ہوا نہیں بلکہ فطری فرائض و واجبات کے اتباع کا نام عبودیت ہے۔ یہ فطری واجبات و فرائض کیا ہیں۔

(الف) غایت درجہ رابطۂ مولا کی استواری۔ یہاں تک کہ کائناتِ ارضی و سماوی کی ہر چیز کے امیدِ نفع اور بیم ضرر سے انسان پاک و صاف ہوتا ہوا اللہ تعالیٰ کے خوف و رجا سے ہمیشہ کے لئے لبریز ہو جائے۔

عالم کا سب سے زیادہ اندازہ رکھنے والی اور اس کے مطابق
بدلنے والی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر جمہوریت کو عالمگیر تنظیم
انسانی کے واحد ادارے کی حیثیت میں ناقابل انکار حد تک عالم انسانی
تسلیم نہ کر چکا ہوتا اور ملوکیت کے لئے تاریخ انسانی میں آج کوئی
گنجائش باقی ہوتی تو میں تمام مسلمانوں سے صرف یہ گذارش کرتا کہ
انگریز قوم کو مسلمان کر لو تو تمہارا کھویا ہوا ملی توازن پھر بحال
ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قوم بلا مبالغہ خلافت عباسیہ اور
ترکی خلافت کی سیٹ کو آج کے موقف میں پر کر سکتی تھی اور
روس و امریکہ جیسی دو انتہاؤں کے درمیان ایک نیا عالمگیر نقطۂ
عدل پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ کسی قسم کی ملوکیت کی طرف رجوع
کرنا بھی غلط ہونا درست معلوم ہوتا ہے۔ لہذا ایسی کسی خلافت کا
میں مشورہ نہیں دینا چاہتا۔ ہاں اگر ہندوستان کا راہب فطرت
برہمن امت اسلامی کا ساتھ دیدے تو بلاشبہ پھر یہ جرأت کر لینا
مضر نہ ہوگا۔ یہاں سے ہزار دو ہزار تارک الکل سادھو ضرور
مل جائیں گے کہ جو امت اسلامیہ کے اور انگریز کے امپیریلسٹ
اثرات کو ختم کر سکیں۔ اور اُسے صحیح رنگ کا مسلمان بنا سکیں
بت پرست ہند کا یہ تارک الدنیا عنصر اگر کسی وقت تعمیر انسانی
کے کسی صحیح منصوبے کو لیکر اٹھا تو دنیا دیکھے گی کہ کیا ہوتا ہے
کہا جاتا ہے کہ فخر الرسل ہادی السبل رحمت للعالمین محمدؐ نے کسی

(ب) اس کے بعد وہ فرائض و واجبات کے کہ جو اسلام کی تکمیل سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ انھیں جمع کر لیا جائے اور ان پر علما و مجتہدین و صوفیا و سیاسین کا اتفاقِ عالمگیر کرتے ہوئے اُسے پوری امت کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اس کے ساتھ سارے ایشیا و مشرق کے سامنے رکھدیا جائے۔ موجودہ بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر اس دعوت تجدید و تبلیغ کی حدودِ عمل انڈونیشیا سے مراکش تک رکھی جائیں۔ اس کے بعد شاید چین بھی اس میں آجائے اس تحریک کی عالمگیری کا فیصلہ کن نقطہ ہندوستان کے جوابی طرزِ عمل سے معلوم ہو سکے گا۔

ہندو نظامِ تمدن کی دو خصوصیتیں

ہندو نظامِ مذہب میں دو باتیں بالکل واضح طور پر موجود ہیں

(الف) ہر ایک مذہب موجب نجات ہے"

(ب) مورتی پوجا کے مقابل ایک خدا کی پوجا مذہب کی افضل شکل (اُتم دھرم) ہے" سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر امتِ اسلامیہ عرض کردہ شکل میں اپنا راستہ معین کرے تو ہندوستان اس تحریک سے کیسے علیحدہ رہ سکتا ہے۔ مغربی اقوام میں اپنے اعتدالِ طبع کے باعث انگریز قوم ایسی کسی عالمگیر تحریک کا سب سے پہلے ساتھ دے سکتی ہے۔ یہ قوم تمام اقوام مغرب میں سے سب سے زیادہ موقعہ شناس اور حالات

خود یہ ایک ایک دائرہ بھی سو سو قسم کے مختلف فرقوں اور عناصر میں بیٹھا ہوا ہے۔ جن کے لیڈروں اور پیشواؤں کو اگر کسی چیز کا علم الیقین ہے تو وہ صرف اپنی اپنی امتیازی خصوصیات کا علم الیقین ہے اور پھر انھیں خانہ ساز یقینیات کو صدیوں سے وہ اپنے اپنے حلقے کے ارادت مندوں کو تلقین کرتے آئے ہیں، جو پیر و مرید، امام و مقتدی مطیع و مطاع سب کے لئے دین ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہر ہر حلقے کے لوگوں کو جس طرح ان مشتبہات، مکروہات اور غالباً بعض جگہ محرمات مطلقہ کے درجے کا علم الیقین ہے کہ جنھیں انھوں نے اپنے اپنے مایہ الامتیاز شعائر دین کی حیثیت سے از بر کر رکھا ہے وہاں انھیں امت کے مایہ الاشتراک محکمات کا کوئی شائبہ و گمان بھی شاید ہی ہو۔[۲] اس سارے اندرونی تفرقے کو کس چونے سمنٹ سے مضبوط کیا گیا ہے اپنے اپنے انداز کی کچھ نہ کچھ روایات و استنباطات کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ ہے کہ جو فی الجملہ سامان مغالطہ یا وجہ تسکین بنا ہوا ہے اگر اس تمام دینی و ایمانی الجھاوے میں کبھی قرآن مجید کیطرف ہاتھ اٹھا بھی تو وہ اس سارے ذہنی و فکری و قلبی و صدری معاشی و معاشرتی الجھاوے کو ساتھ لئے ہوئے اٹھا۔ اکثر اوقات یہ خوف لئے ہوئے اٹھا کہ قرآن کے آزاد تتبع سے ملحد تو نہ ہو جائینگے میں کہتا ہوں کہ اس طریق کار کیلئے اس وقت تک تو کچھ نہ کچھ سند جواز

---

(۲) نوٹ ۲۔ مجھے بڑے ثقہ سے ثقہ علما نے تاکیداً تلقین کرنے کی کوشش کی کہ میں اتحاد امت کے ناممکن اور لا طائل کام کو ترک کر دوں اور اپنی صوابدید کے مطابق کوئی طبقہ تیار کر جاؤں

موقع پر کہا تھا کہ مجھے ہند کی طرف سے خوشبو آرہی ہے"۔ شاید وہ آج ہی کا موسم ہو۔

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک   خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے   یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

بہرحال ساری دنیا کے علمائے ملتِ اسلامی اس وقت ایک مرکزیت میں سمٹ جائیں اور "کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً" اور "اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً" کے آفاق گیر محمدی نقطۂ نگاہ کو ایک طرف سامنے رکھیں اور دوسری طرف تمام انبیاء کے "المعروف" "المنکر" کے تمام مسلمات اخلاق و روحانیت ومعیشت ومعاشرت کو سامنے رکھیں اور پھر اس تکمیل دین کی آخری اینٹ یعنے محمد رسول اللہؐ کے ضابطہ روحی کے تکملے مرتب کریں۔ بلا شک اس انداز کار کے باعث وہ خدا کے فرمان "اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً" کے علی وجہ البصیرت مصدق ومصدق ہوں گے لیکن آج کیا حالت ہے جس سے اصل مرکزیت حقہ کی طرف زعمائے امت کو سب امت کو سمیٹنا ہے۔ محکماتِ قرآنی کی وحدت، دین کامل کی عملی وحدت اخلاقی وروحی قدروں کی تاریخ انسانی کی سب سے بڑی وحدت یعنے نظامِ خلافت جب ٹوٹا تو امت ابتداءً تو صدر میں عرض کردہ تین دائروں فرعونی سیاست راہبانہ روحانیت رسوم پرست ظاہریت میں بٹی۔ لیکن آج

نوٹ:۔ قرآن وسیرت محمدؐ سے زائد میں کوئی چیز نہیں بتانا۔ میں صرف یہ تجویز کر رہا ہوں قرآن کو تاریخ مذہب کی روشنی میں سمجھا جائے تاکہ "المعروف" اور "المنکر" کا عالمگیر تعین ہو سکے اور تاکہ موجودہ تنگ نظر تفاسیر سے اپنے ماحول کو سمجھ کر اپنے عالمگیر فرض کو سمجھ سکے۔

باب چہارم

موجودہ دور کے مادی نقطۂ نظر اور ماضی کے (اپنشدی) نفسی نقطۂ نظر کی عمرانی قدر و قیمت

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

میں کتاب لکھ رہا تھا کہ تقدیر کے ہاتھ نے مشہور ہندوستانی فلسفی سر رادھا کرشن کی کتاب "فلاسفی آف اپنشد" اور لینن کی کتاب "مادیت اور تجربی تنقید (Meterialism and Empiria. criticism) میرے ٹیبل پر پہنچا دی۔ میں نے

بھی کہ جب تک شخصی اقتدار کو کسی ایک حلقے میں بھی چیلنج کرنا ناممکن تھا۔ بحیثیت مجموعی امت کو اپنے اصلی ربط و ضبط کی طرف پلٹنا پوری تاریخ انسانی کے دھارے کو پلٹنے کے ہم وزن تھا کہ جو غالباً عملی نتائج کے اعتبار سے لاطائل سعی ہوتی۔ مگر آج تو معاملہ برعکس ہے۔ آج روحانیت ہو یا اخلاقیت، سیاست ہو یا معیشت کسی دائرے میں بھی صرف افراد و طبقات کے تفوق و برتری سے وابستگی تاریخی رجعت پسندی سمجھی جانے لگی ہے۔ بہت ہی کم انسان ہیں کہ جنھیں اس وقت پورے یقین سے یہ احساس ہے کہ گذشتہ دو سو برس کی ملحدانہ جمہوریت کی کشمکش نے سارے عالم انسانی کے لئے دو کھلے امکانات پیدا کر دئے ہیں۔ ایک تو باہمی تضاد کے باعث پورا نوع انسانی تتر بتر اور بالآخر ہلاک ہو جائے اور دوسرا

"اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ"

کا مصداق بنتا ہوا ایک دینِ کامل پر متحد اور اس کے پروگرام سے ہم آہنگ ہو جائے۔ امتِ اسلامی کے علما، صوفیا اور سیاسی زعما اس مقام کے متعلق اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور ساتھ ہی اللہ کے اس ابدی وعدے کو یاد کریں۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

نہیں' اس میں اکثر جگہ ایک محتاط فلسفی کی حالت پیدا ہے' جو دوسرے کے لئے بھی شریفانہ علمی انداز کی مخالفت کی گنجائش چھوڑتی ہے لیکن لینن کا تعصب دوسرے کے لئے ہر راہ جائز و ناجائز طریق سے بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دوسرے کے منہ میں اپنا ہاتھ دیکر اُسے چپ کرا دیتا ہے۔ انسانی فطرت کی جامع نوعی صلاحیتیں ساری کائنات زیر و بالا کے لئے کس درجہ قابل رشک ہونگی کہ جب یہ کائنات ایک چھوٹی سی مخلوق کو دیکھتی ہو گی کہ جس کا ظہور ابھی جمعہ جمعہ ہفتے بھر کی بات ہے مگر جس کے حوصلے ساری کائنات پر پھیل کر اُسے کاملاً اپنے بس میں کر لیتے ہیں مگر اس کی الجھی ہوئی قسمت خود اس کے اپنے حساس افرادِ انسانی کی نگاہ میں کس درجہ عبرتناک ہے کہ جب وہ زندگی کا ایک متحرک تصور قائم کرکے اپنی بقا و فلاح کی سڑک پر چلنا چاہتا ہے تو بہت جلد اس کی اپنی مخصوص نوعی صلاحیتیں (اس کی روحانی و اخلاقی صلاحیتیں) ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور اس کی زندگی ظالمانہ ہوا و ہوس کی ایک جولانگاہ بن کر خود اپنے آپ کو تلف کرنے پر تل جاتی ہے اور جب وہ اپنی مخصوص نوعی صلاحیتوں (روحانی و اخلاقی قوتوں) کو ہمراہ لیکر منزل مقصود کا تعین کرنا اور اس کی طرف کوئی نوعی انداز کی حرکت کرنا چاہتا ہے تو ابھی اس کی نوعی منزل مقصود بھی متعین نہیں ہوتی کہ اسی کے بعض افرادِ نوع سرے سے زندگی کے متحرک

دونوں کو خوب غور سے پڑھا مگر نتائج کو کتاب میں درج کرنے سے اجتناب کیا۔ انھیں بعد کے لئے اٹھا رکھا اور وہ نتائج اب عرض کر رہا ہوں۔ دونوں مصنف ایک دوسرے کے سو فیصدی ضد ہیں دونوں خوب پڑھے لکھے آدمی ہیں، دونوں ایک ہی زمانے (۱۹۳۰ء) میں ایک دوسرے سے کامل بے خبری کے ساتھ دو متضاد نقطہ ہائے نگاہ سے تعمیرِ انسانی کے منصوبے کو پیش کرنے کی خوب کوشش کرتے ہیں۔ میں نے جب دونوں کے نتائج کو نوعِ انسانی کے حقیقی عمران کے پیش نظر جمع کرنے کی کوشش کی تو بے اختیار عنوان میں درج کئے ہوئے تین اشعار سامنے آ گئے۔ آخری شعر تو ایک اعجازی رنگ میں دونوں کی حقیقت پر چسپ آتا ہے۔ دونوں کے ایک ساتھ مطالعہ نے مجھے نہایت درجہ فائدہ بخشا۔ اس لئے کہ ایک انتہائی درجے ظاہریت پر تعمیر انسانی کی بنیاد قائم کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے تو دوسرا انتہائی باطنیت پر تعمیر انسانی کی بنا رکھتا ہے جس کے باعث مجھے اپنی پوزیشن کی جامعیت و اعتدال کا واضح یقین ہو جاتا ہے۔ دونوں مصنفوں کے متعلق مجھے ایک فرق ضرور معلوم ہوا۔ دونوں پڑھے لکھے آدمی ہیں مگر لینن نتائج کے اخذ کرنے میں پرلے درجے کا متعصب سیاسی شاطر Political manipulator ہے مگر اس کا حریف عقیدہ یعنے سررادھا کرشن نتائج کے اخذ کرنے میں اس درجہ متعصب

دنیا کا نقطۂ نگاہ ایک دوسرے کی سو فیصدی نفی ہے۔ ایک سارے عالم کی تشریح صرف انفسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے اور عالمِ آفاق کو مایا کا فریب بتاتا ہے دوسرا سارے سلسلۂ کائنات کی تشریح ٹھوس آفاقی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے اور سارے سلسلۂ انفس کو ایک بطلانِ مطلق قرار دیتا ہے۔ انھیں دو متخالف نقطہ ہائے نگاہ کو سرا دھاکرشن اور لینن بہادر پیش کر رہے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو مسائلِ حیات کی سمجھ دی ہے تو وہ ان دو کتابوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھکر پڑھ لینے سے اکثر تاریکیوں سے نکل آئے گا۔ کم از کم اتنا تو اُسے ضرور سمجھ آجائیگا کہ ان دونوں نقطہائے نگاہ میں سے کسی ایک کو حق سمجھ کر اس پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھنا از حد خطرناک ہے۔ اس احساس کے ماتحت میں نے غالب مرحوم کے اشعار نقل کئے ہیں۔ لینن کے سارے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ایک وقت ایسا بھی رہا ہے کہ جب انسان ابھی دھرتی پر ظاہر بھی نہ ہوا تھا مگر کائنات خارجی اس وقت بھی موجود تھی لہذا مذہب روحانیت و انفسیت باطل ہے۔ اور مادیت حق ہے۔ لینن انفسیت (subjectivity) کا جب ذکر کرتا ہے تو اس وقت اس کی مراد محض انسانی انفسیت ہوتی ہے۔ یہ استدلال کا مغالطہ ہے یا سوچی سمجھی ہوئی ایک خیانت ہے یا ناقابلِ علاج حد تک

تصور ہی کو غلط بتاتے ہوئے آپ سے انفسیت کی وادیٔ سرور گم کی طرف کھینچ کر ایک بے تمنا و بے ارادہ انتظارِ مرگ میں بیٹھ جانے کا ناقابل رد فلسفہ پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوگونہ عذابِ حیات کا اندازہ کرنے والے کے سامنے اس مقام پر صدر کے تین اشعار ایک نالۂ جانگداز بنکر آجاتے ہیں۔ ماضی کی حیات سوز انفسیت اور حال کی اخلاق و روح سوز مادیت کے دوگونہ احساسِ عذاب سے الامان۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل | زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو | میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی | مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

دونوں مصنف اپنے اپنے انتہا پسندانہ دلائل و مقاصد کے بیان میں لاجواب حد تک چلے گئے ہیں۔

لینن کی آفاقیت

لینن کے نزدیک عالمِ انفس، باطنیت و روحانیت ایک فریبِ مطلق اور جہل و انسان دشمنی ہے۔ سر رادھاکرشن چونکہ اُپنشدوں کے ترجمان ہیں لہذا ان کے دلائل عالمِ آفاق کی نفی میں قریبًا اسی حد تک تیز ہیں کہ جتنے لینن کے دلائل عالمِ انفس کی نفی میں تیز ہیں۔ اُپنشدوں کا نقطۂ نگاہ اور کمیونسٹ

انیسویں صدی کی اکثر سائنٹیفک اصطلاحات اور کتابوں کے حوالے آپ کو اس میں جمع ملیں گے۔ مگر کتاب کی ترتیب ایک دیانت دار سائنٹسٹ کی تحریر نہیں کہ آپ اس میں سے کسی واقعہ کو واقع کی حیثیت سے دیکھ سکیں بلکہ وہ ایک سیاسی جابکدست کے پراپاگنڈے کے انداز کا ہتھکنڈا ہے جہاں علم صحیح اور دیانت کے علاوہ باقی سب کچھ موجود ہے۔ صدر میں میں نے اس کی ساری کتاب کا خلاصہ ایک جملے میں لکھا ہے جسے میں پھر دھراتا ہوں "چونکہ ایک وقت ایسا بھی رہا ہے کہ جب انسان ابھی دھرتی پر ظاہر نہیں ہوا تھا لہذا انفسیت باطنیت اور روحانیت کا دعویٰ باطل اور مادے کی ہمہ گیری مسلّم اس دلیل کے پیٹ میں جس حد تک منطق ہے وہ صدر میں عرض کر چکا ہوں اب اس کے مقابل صرف ایسے ہی ایک جملے میں ایک دعویٰ میں بھی پیش کرتا ہوں اور ساری مارکسی کائنات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کی تردید کریں اور ساری دیانت دار انسانی سوسائٹی سے التجا کرتا ہوں کہ وہ ان کی تردید کو ملاحظہ فرمائیں کہ اس میں کتنی قوت ہے! دعویٰ اور دلیل ذیل میں ہے۔

"چونکہ مادے کی کوئی ایسی حالت فرض کرنا ناممکن ہے کہ جب اس کی ہستی اور اس کی حرکت کسی نہ کسی قانون، ڈسپلن اور ترتیب کی پابندی سے آزاد ہو اور چونکہ قانون و ڈسپلن

پہنچا ہوا جہل ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہدے ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب ہنری فورڈ کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی لہذا ثابت ہوا کہ دولت کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ دنیا میں سارے غریب ہی بستے ہیں۔ یہ شخص پوری کتاب میں انسانی انفسیت و انسانی باطنیت کو ساری کائنات کی انفسیت و باطنیت کے مساوی قرار دیتا ہوا انسان کی ہستی کی نفی سے مطلق انفسیت و مطلق باطنیت کی نفی ثابت کرتا ہے۔ حالانکہ جس طرح انسانی کائنات کے ظاہر کے ساتھ اس کا باطن بھی ہے، بالکل اسی طرح حیوانی کائنات و مادی کائنات کے ظاہر کا بھی ایک باطن ہے جس طرح انسانی حیات کی آفاقیت کے مقابل اس کی ایک انفسیت ہے، بالکل اسی طرح باقی سب کائناتِ فطرت کی آفاقیت کے ساتھ ہی اس کی انفسیت بھی ہے۔ یہ کس درجے کی دیدہ دلیری یا کتنا جہل عظیم ہے کہ کوئی شخص خالص منطق کی قوت سے یہ دعویٰ کردے کہ چونکہ زید کی جیب میں پیسے نہیں لہذا عمرا ور خالد بھی مفلس ہیں لینن کی ساری کتاب کا پورا استدلال صرف یہی ہے۔ مگر سائنٹیفک اصطلاحات اور حوالوں کی وہ کثرت ہے کہ اگر انسان کے پاس حیاتِ انسانی کے متعلق طے شدہ بصیرت موجود نہیں تو وہ اس باطل جال میں سے بچ کر باہر نہ جاسکیگا۔ اس کتاب کو کمیونزم کی سب سے بڑی سائنٹیفک کتاب کہا گیا ہے۔

حیوانی تنازع للبقا سے روکتا ہے لہذا ان کی کامل نفی کرتے
ہوئے انسانی تمدن کو منفیات سے پیدا کیا جائے۔ لینن کی اس
کتاب کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری کتاب میں
آفاقیت objectivity اور مادیت materialism
کو بالکل ہم معنے الفاظ کی حیثیت سے استعمال کرتا جاتا ہے۔ حالانکہ
آفاقیت ایک خارجی و ظاہری نقطۂ نگاہ کا نام ہے کہ مادہ
جس کے لئے بنیادی اصول موضوعہ کا کام دیتا ہے۔ کائنات
(universe) کی ظاہریت پر جب انسان اپنے حواس کا
ظاہری عمل شروع کرتا ہے تو جس اصول اول سے اس کا آغازِ
کار ہوتا ہے اسے مادہ کہا جاتا ہے۔ جو محض منطق کی ایک کلی
طبعی کی طرح کا ایک ذہنی مفہوم ہے جس کا وجود صرف افراد میں
پایا جاتا ہے خود صرف ایک ذہنی چیز ہے۔ بعینہ جس طرح کائنات
کے باطن پر انسان جب اپنے باطنی حواس کا عمل شروع کرتا ہے
تو جس اصولِ موضوعہ سے اس کے کام کا آغاز ہوتا ہے اُسے روح
کہتے ہیں۔ جیسے روح اور انفسیت ایک نہیں بلکہ اسی طرح مادہ او
آفاقیت ایک نہیں۔ انفسیت تعبیر و تشریح کائنات کے لئے ایک
معین نقطۂ نگاہ ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ جس اصولِ موضوعہ سے اپنے
کام کا آغاز کرتا ہے اُسے روح کا مقام دیا گیا ہے۔ بالکل ایسے
ہی آفاقیت بھی ایک نقطۂ نگاہ ہے کہ جس کے ذریعہ کائنات

وترتیب کائنات کی ظاہریت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی
باطنیت سے متعلق ہے اور بے شعوریت مطلق کی پیداوار محض
ہونے کے بجائے ایک شعورِ اعلیٰ کی گرفت کا ثبوت ہے لہٰذا
مادیت باطل اور انفسیت ثابت ۔ لاشعوریت باطل اور شعورِ
اعلیٰ کی ہمہ گیری ثابت ۔ لاشعوریت غلام اور شعوریت آقا ۔ مادہ
قیدی اور روح اعظم داروغۂ جیل" کیا ماسکو کے خرد دشمن
لامذہب متعصبوں کا گروہ اپنی ضد اور تعصب کی تاریک غار سے
باہر نکل کر اس سیدھے اور مختصر استدلال کی روشنی میں کچھ مزید
غور کرنے کے لئے تیار ہوگا ؟ صاف بات عرض ہے بشرطیکہ دیانت
مرنہ چکی ہو ۔ ان کا سارا استدلال کائنات فطرت کے سلسلے پر
کسی متعصب جاہل کا ایک اتہام ہے اور کچھ نہیں ۔ اگر ان کے منظورِ
نظر کائناتِ انسانی کا اقتصادی مسأوا ہے تو اسے ایک خدا
اور ایک انسانی بھائی چارے کے اصول پر بروے کار لایا
جاسکتا ہے ۔ اس کے لئے کسی طرح ضروری نہیں کہ بیالوجی کا
سہارا لیکر پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ" انسان اور سور اور کتے
صرف ایک ہی برادری ہیں اور دونوں کے فرائض حیات برابر
ہیں اور وہ پیٹ کے سوال کیلئے عالم گیر تنازع للبقا کے ارد گرد
گھومتے ہیں چونکہ اخلاقی وروحانی قدروں کا اعتراف و نیکی و بدی
کی تمیز و خیر و شر کا شعور و عذاب و صواب کی احتیاط انسان کو اس

کی حقیقت" ہے۔ ڈاکٹر موصوف کیمبرج یونیورسٹی میں فلکیات کے پروفیسر ہیں) لہذا خود سائنس کی تمام شاخوں کو ایک مربوط نظم دینے کے لئے یہ ضروری محسوس ہوا کہ پہلے اکثر تخمینوں کو غلط قرار دے کر سائنٹیفک نظم کی بنیادوں کو مزید تجربات کی روشنی میں وسیع تر اور وقیع تر کیا جائے۔ لہذا اکثر پہلے مفروضا کو بدلا گیا مگر چونکہ کمیونزم کے خاتم النبیین حضرت مارکس کا سارا نظام تخیل انھیں اٹھارویں صدی کے غیر ذمہ دارانہ اور سطحی دعاوی سے تیار ہوا تھا کہ جو اب تجربے کی وسعت کی روشنی میں غلط ہو رہے تھے۔ لہذا لینن کو ایک پولیٹیکل خطیب اور لسان کی حیثیت میں ان سب تجربوں کو اور اُن سے پیدا شدہ نتائج کو غلط کہنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند ایک بیچارے نحیف و کمزور سا سائنٹسٹ اپنی لیبارٹی میں سالوں سے بعض تجربات میں مصروف ہیں اور کبھی کبھار جب وہ ایک مخصوص تجربے میں کامیاب ہوتے ہیں تو نہایت محتاط زبان میں اپنے اردگرد کے طلبا کو کہدیتے ہیں "اس تجربے کا نتیجہ تو یہ ہوا۔ لہذا اس کی روشنی میں ہمیں اپنے سابق دعوے کے فلاں فلاں جزو کو چھوڑ دینا ہے"۔ لیکن اس لیبارٹی کے پاس ہی ایک بڑا چانڈو خانہ ہے جس میں چند چانڈو باز بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے ہی ایک بڑا بھاری نقارہ ہے۔ وہ جب ان سائنس دانوں کی

کی ایک مخصوص انداز کی تشریح و تعبیر کی جاتی ہے اس تشریح و تعبیر اسلام کی بسم اللہ جس اصل اول سے ہوتی ہے اُسے مادہ کہتے ہیں جو محض ایک ذہنی تصور ہے جسے تمام اشیا کی جزو مشترک کی حیثیت میں مان لیا گیا ہے۔ لیکن لینن کی دنیا میں مادہ اور آفاقیت بالکل ہم معنے لفظ ہیں وہ مادے کے لفظ کا اتنا دالہ و شیدا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا ایک مشہور شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

بس کہ در جانِ ضعیف و چشم بیدارم توئی
ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

لینن کی اس سائنٹفک کتاب کی ایک تیسری ستم ظریفانہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ سائنٹفک تجربے اور اس کے نتائج کی تردید سائنٹفک تجربے کے ذریعہ کرنے کے بجائے محض جھوٹے زورِ بیان سے کرجاتا ہے۔ ساری کتاب میں یہ اس کی خصوصیت ہوگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں جو جو سائنٹفک تجربے ہوئے اور اُن کے سہارے جو جو نظریے یا چھوٹے موٹے فکری نظام کھڑے کئے گئے۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں اس کے خلاف خود انہیں سائنٹفک حلقوں میں ایک ردعمل شروع ہوا۔ اب مختلف قسم کے تجربوں کا ذخیرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ جس کی روشنی میں پہلے تخمینے غلط محسوس ہونے لگے (اس کا بہترین اعتراف ڈاکٹر ایڈنگٹن کی کتاب "مادی کائنات

اقتصادی حقوق کے مساوات کو تسلیم کراتا ہے یا مارکس کے باطل
والبطل تخیل و وہم کو انسانیت پر ایک مذہب کی طرح حاوی
کرتا ہے اور باقی ہر فکری و اعتقادی و اخلاقی و روحانی
صداقت کو اس کے مقابل کچل کر انسانیت کو صرف اسی فاسد
تخیل کا پابند کرتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ کمیونزم کی کشمکش
کا مقصد صرف اقتصادی حقوق کا مساوات بتاتے ہیں کمیونسٹ
لٹریچر ان کی بدترین تردید کرتا ہے۔ ان کا پورا مرکزی لٹریچر
(پروپاگنڈے کے شور کو ایک طرف چھوڑئے) صرف دوسری بات
کی تصدیق کرتا ہے کمیونسٹ پارٹی درحقیقت مارکس کے فاسد
تخیل کو تاریخ انسانی پر حاوی کرنے کے منصوبے پر کام کر رہی
ہے۔ اگر کسی کو اطمینان کرنا ہو تو وہ اصول ملکیت شخصی کا سو
فیصدی انکار کرتا ہوا صرف مارکس کے مذہبی نقطۂ نگاہ کے بطلان
کو دنیا پر ظاہر کرنے کا حق روس میں لیکر بتائے۔ میں ساری دنیا
کی کمیونسٹ پارٹی سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ انسانی روح
و اخلاق کے ایسے مبلغوں کو مادیت کے بطلان اور خدائے
واحدہ لاشریک کے معبود ہونے اور اخلاقی و روحانی قدروں
کے استقلال اور مادیت کی تردید کی تبلیغ کا حق روس میں دلا سکینگے
اس کے معاوضے میں ایسے مبلغوں سے یہ حلفیہ اعلان کرالیا جائیگا
کہ وہ ملکیت شخصی کے اصول کو غلط اور بانیان مذاہب کی

باتوں کا چرچا سنتے ہیں تو یک قلم اپنے نقارے پر زور زور کی چوٹیں دے کر پوری ہم آہنگی سے شور کرنا شروع کر دیتے ہیں یا "بالکل غلط ہے۔ بات وہی صحیح ہے کہ جو ہمارے شیخِ سلسلہ نے کہی تھی یعنی مرغی اونٹ سے بڑی ہے اور اونٹ ہمارے چاناروخانے کا شہتیر نگر ناچ رہا ہے" لاحول ولا قوۃ - انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں سائنٹیفک تجربوں اور نظریات نے جو نئی کروٹ لی ہے اور جو نئی سمت حرکت متعین کی ہے مارکس کے باطل اور چوری چکاری قسم کے تخیلات کے ڈیفنس میں اس ساری نئی تجربی لہر کو لینن کا غلط بتانا بالکل صدر کے چانڈوں بازوں کی مثال کو اپنے اوپر صادق کرتا ہے۔ ایک پانچویں ستم ظریفی لینن کی یہ ہے کہ اس کے نزدیک ہر وہ استدلال باطل ہے کہ جو مارکس کے مادی صنعت تضاد" کا تصدیق کنندہ نہیں۔ اس کے نزدیک ازازل تا ابد صرف ایک ہی ابدی صداقت ہے کہ جس پر باقی صداقتیں کس کر دیکھی جا سکتی ہیں اور وہ ابدی صداقت مارکس کی دزدیدہ (ہیگل سے چوری کی ہوئی) صنعت تضاد ہے۔ مارکسی دین کے ثبوت میں یہ کتاب بڑی بھاری کتاب ہے جس کی پانچ خصوصیتیں ہیں۔ اگر کوئی شخص یہاں پر اپنے دل سے یہ سوال پوچھے کہ آیا مارکسی امت کی کشمکش کا اصل مدعا و نہایت کار کیا ہے۔ کیا ان کا مقصد ساری کائناتِ انسانی میں

سر رادھا کرشن کی فلاسفی آف اپنشد

اب سر رادھا کرشن کی فلاسفی آف اپنشد کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ پہلی بات یہ عرض کرنا ہے کہ اپنشد محض ایک تخمینی فلسفہ نہیں بلکہ وہ بھی ایک تجربی سائنس ہے۔ محض فلسفے کی زبان میں اس کی تھیوری کو تو کسی حد تک بیان کرنا ممکن ہے مگر اس کی عملی حقیقت کو بیان کرنا فلسفے کا یا سر رادھا کرشن موصوف کا کام بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ اس انفسی تجربے کے اسرار خانے کے علم حضوری

کو فلسفے اور دماغ کے علم حصولی

کی اصطلاحات میں بیان کرنا آگ کو پانی کی اصطلاحات میں بیان کرنا ہے۔ گدھا بول کر لقمان حکیم مراد لینا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کو اس کا اعتراف ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہی کوشش کر رہے ہیں اور ایک فلسفی کی حیثیت میں وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ چونکہ میں اس کوچے کا ایک عملی سیاح ہوں لہذا اگر صرف الفاظ کی قوت سے اس کا بیان کرنا ممکن ہے تو وہ شاید میرے لئے ڈاکٹر موصوف سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ لہذا میں علمی اصطلاحات میں نہیں بلکہ ایک عملی کہانی

تعلیم و عملی زندگی کے مخالف اعلان کردینگے؟ اگر وہ ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں تو جو ممالک اقوام طبقات اور فرقے مارکس ازم پر اعتقاد نہیں رکھتے ان کا بھی اخلاقی فرض ہے کہ وہ ساری دنیا میں کمیونسٹوں کے خلاف اور ان کے لٹریچر کے خلاف یہی جوابی تعزیرات فی الفور عاید کریں۔ چند ہفتوں میں ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ مارکس کے تخیل کو ایک مکمل مذہب کی شکل میں منوانے کے نتیجے میں مذہب اخلاق تو ایک طرف خود ہر قسم کی علمی و فکری و تجربی آزادی بھی ناممکن کردی گئی ہے۔ اس لئے کہ جب تک علمی و فکری تجربی آزادی مارکس کی صنعت تضاد کی تصدیق نہ کرے اس وقت تک وہ اخلاقی و قانونی حق حیات کی لائسنس سے محروم رہے گی۔ سارے عالم انسانی کا یہ فرض ہے کہ وہ ان دشمنان انسانیت کے اور ان کے گندے لٹریچر کے خلاف عالمگیر طور پر جوابی تعزیرات عاید کردیں کیا تعجب کی بات ہے کہ انسانی تاریخ کی ساری روحانی و اخلاقی و معاشرتی ابدی صداقتوں کی تبلیغ کا کوئی حق روس میں نہ ہو مگر اُن کے ناپاک منصوبے کو ساری کائنات میں پھیلنے اور پھیلانے کا حق ساری دنیا میں موجود ہو۔

بنا دے۔ اے خدائے کریم و رحیم تو اس ہزاروں برس کی مظلوم قوم کے دلوں اور روحوں کو قرآن کی توحید اور قرآن کی عالم گیر اخوت کی روشنی سے اس طرح روشن کر دے کہ ساری دنیا میں اُجالا ہو جائے۔ آج انسانی قافلہ عجیب گومگو کی حالت میں کہیں حیرانی میں پڑا ہے اور کہیں اپنی خودکشی کا سامان کر رہا ہے اب اپنشدوں کی عملی کہانی میری زبانی سن لیجئے۔ (میں کہانی کی شکل میں ہرگز کسی نمود کے لئے یہ طریق تعبیر ہرگز ہرگز اختیار نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اس ساری النفسی سائنس کا جو نقطۂ ماسکہ ہے وہ بالکل اسی طرح متعین ہوتا ہے۔ اپنشد فلسفے سے کہیں زیادہ تلاش حق کی ایک سائنس ہے جسے فلسفے کی اصطلاح میں بیان کرنا محض ایک نظری حیثیت رکھتا ہے) میں ابتدائی عمر سے غایت درجہ محبت کی لٹک لیکر چلا تھا۔ کائنات کی ہر چیز سے محبت اور بے پناہ محبت کرنا چاہتا تھا۔ مگر ساتھ ہی قدم قدم پر محسوس کرتا تھا کہ جن چیزوں کو میں چاہتا ہوں وہ یا تو مجھے نہیں چاہتیں اور اگر کہیں چاہتی ہیں تو ان میں اور ان کی چاہت میں پائداری اور وفا موجود نہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں سچا ویراگ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ایک ایک تعلق سے انقطاع اور تیاگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ۲۲ و ۲۳ برس کی عمر میں یہ طوفانی جھکڑ مجھ پر پورے زور سے چل چکا تھا۔ اور میں ایک

شکل میں اس کی حقیقت کو واضح کروں گا تاکہ اس کی عملی قدر وقیمت محفوظ کر لینے پر اس کی اخلاقی و تعمیری قدر و قیمت بھی واضح کر سکوں اور تاکہ میرا اپنا ملک و وطن اپنی اس قیمتی متاع کے بے قدری دیکھتے ہوئے مجھے متعصب بے خبر قرار دیکر میری بات کو سننا اور پڑھنا نہ چھوڑ دے۔ اس لئے کہ مجھے اس قوم کی تقدیر انفسی فلسفے کے نقاط و رموز بیان کرنے کے بجائے ایک عالمگیر اخلاقی و مذہبی انقلاب سے وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ مجھے صرف اسی میں اس کی اپنی بھلائی اسی میں پورے مشرق کی بھلائی اور اسی میں سارے عالم انسانی کی بھلائی نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہندوستان کے تیاگی سادھوؤں کے ہاتھوں ایک زندہ اخلاقی ضابطہ دے۔ انفسی فلسفے اور اشراق کا کھیل تو وہ تین ہزار برس سے کھیل رہی ہے۔ اور چونکہ آج اس ملک نے دو ہزار برس کی انارکی کے بعد کچھ تھوڑا سا سنبھالا لیا ہے لہذا ایک سچے ہم درد اور دلی پیار کرنے والے دردمند بھائی کی حیثیت سے دل چاہتا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے تمام وہ پستکیں چھین لوں کہ جنھوں نے انھیں دو ہزار برس کے لئے انارکی میں گم کئے رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں قرآن جیسی کتاب مع چند تشریحی نوٹوں کے دیدوں کہ جو انھیں ایک خدا اور ایک انسانی بھائی چارے کے اصول پہ سارے عالم انسانی کے اتحاد کا علمبردار

آگے بڑھنے کے بعد ایک یک ڈنڈی پھوٹ جاتی ہے۔ جس کے آس پاس ایک مبہم سی بستی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ پگڈنڈی انسان کو چاروں طرف سے سمیٹ کر اپنی نفسیاتی گہرائیوں کی طرف لیجاتی ہے۔ یہ گہرائی ایک اچھی خاصی نور کی دنیا ہے۔ بعض لوگ تو یہاں پہنچ کر ڈیرے ڈالدیتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کا راستہ منزلِ مقصود پہ پہنچ کر ختم ہوگیا۔ مگر بعض لوگ ذرا زیادہ حساس ہوتے ہیں اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم نے دیکھا یہ تو صرف ہمارے اندر کی دنیا ہے اور خود ہماری طرح محدود ہے۔ کیا اس کی اصل خود کائناتِ فطرت کے اندر بھی موجود ہے یا نہیں کھوج لگانے پر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے اندر نور کی ایک مربوط کائنات تھی ویسے ہی کائناتِ فطرت کے تمام عروق و اعصاب بھی ایک نورانی وائرنگ سے گھرے پڑے ہیں۔ بلکہ سمع و گوش کی کائنات تو محض ایک سطحی فریبِ نگاہ ہے۔ اصل خزانہ یہی کائناتِ نور و ظہور ہے کہ جو پورے نظامِ ہستی کے اندر استقلال رکھتی ہے اور اس کے لئے بمنزلہٗ روح کے ہے وہ اس کائناتِ نور و ظہور کو برہم آتما کہتے ہیں اور اس طرح اپنے جزوی مظہرِ روح کو اسی روحِ کلی کا ایک جزو سمجھتے ہوئے اپنی موجودہ حالتِ معرفت کو وصول، مکتی، موکش وغیرہ کی مختلف تعبیرات

ایک تعلق کو چھوڑتا ہوا کسی ایک محبوب کے دامن وفا میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو چھپا دینا چاہتا تھا۔ مگر ایسا محبوب کہ جس کے دامن کو دامنِ وفا کہا جا سکے، آنکھ اور کان کی دنیا میں ناپید تھا۔ وہ دنیا کہ جس پہ ایک موسم میں بہار آ جائے اور دوسرے موسم میں خزاں، ایک دور اندیش و وفا کیش انسانی دل کی محبوب کیسے اور کیونکر بن سکتی ہے۔ انسانی دل و جان کے محبوب میں کم از کم اتنی صفت تو ہونی چاہئیے کہ اس کا تعلق انسان کی ڈولتی ہوئی نیا اور اس کی گھبرائی ہوئی روح کو ایک سکون اور ایک قرار بخش سکے، جو اسے موت و ناپائیداری کے خوف سے نکال کر امر (ابدی) بنا سکے۔ اگر کسی محبوب کے تعلق میں یہ اثر نہیں تو اس کی محبت اور اس کے تعلق پر سو لعنت ؎

حسن پامالِ خزان و عشق معمول زوال
دل مدہ، آں غنچہ را کو رستہ از بیرزلست

ہاں تو ایسے محبوب کا دنیائے سمع و گوش میں پتہ لگائے کہ کہیں ہے؟ جواب یہ ہے کہ کہیں نہیں۔ یہاں پر پہنچنے کے بعد انسانی روح ایک بے تابی کی حالت میں دنیائے سمع و گوش کو تیاگ دیتی ہے اور ایک نئی شاہراہ پہ چل کھڑی ہوتی ہے۔ یہ شاہراہ چند قدم چلنے کے بعد دو راستوں میں بٹ جاتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اس شاہراہ میں سے چند قدم

اور در حقیقت دائمی ارتقا کی طرف بڑھنے والی فطرتِ انسانی
کو ضائع کر دیتے ہیں مگر چونکہ دوسرا گروہ ڈھانچے کے بجائے
فطرت کی داخلی پائیداری کے عنصرِ حقیقی کی تلاش میں نکلا ہے
اور وہ ظاہری تغیر و انقلاب سے کاملاً نظر کو بچاتے ہوئے
اصل میں غیر متبدل کنہہ کائنات تک پہنچنا چاہتا ہے لہذا ابتداً
اپنی نفسیاتی معنویت پر اس کی نظر پڑتی ہے اور پھر اس کے ذریعہ
کائنات کی داخلی معنویت پر اس کی نگاہ جا کر تھمتی ہے۔ ایک
میں اُسے جزوی نور و شعور کا پتہ چلا تھا تو دوسرے میں اُسے
ایک کلی نور و شعور کا ادراک ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس مرکز نور و
شعور و یقین و اذعان کو روح کلی کہکر اطمینان کا سانس لیتا
ہے اور سمجھتا ہے ہم امر ہو گئے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں
مقامِ انسانی اور اسکی فلاح کی صراطِ مستقیم سے دائیں بائیں پھٹ
جانے والی دو پگڈنڈیاں ہیں کہ جو دونوں حقیقت انسانی کو
تلف کر دینے والی ہیں۔ کیوں تلف کر دینے والی ہیں؟ ذرا غور
سے سنئے۔ ایک کا کہنا ہے کہ غیر شعوری مادے کی ایک خاص ترکیب
و ترتیب سے انسان کو ایک بے مقصد سی زندگی ملی تھی جو اس ترکیب و
ترتیب کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کوئی سنجیدہ انجام نہیں
کسی ذمہ دارانہ اور سنجیدہ انجام کی توقع صرف وہم پرستی ہے۔ یہ تو کائنات
کے ڈھانچے کے اجزائے ترکیبی کی تلاش کرنے والے سائنس دانوں کا

سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ حالت روح کائنات سے ہم کنار ہو جانے کی حالت ہے کہ جس سے آگے اس پگڈنڈی پر چلنے والوں کے ہاں اور کوئی مقام نہیں۔ نہ انسان کی اور کوئی منزلِ مقصود ہے۔ اس منزلِ مقصود کی نشان دہی کرنے والوں کے ہاں نہ تو انسانی اخلاقی فرائض و واجبات اور نہ روحانی اور معاشرتی فرائض واجبات کے استقلال کی کوئی حقیقت ہے ان کی حالت بالکل ایسی ہے کہ مردہ بہشت میں جائے یا دوزخ میں ملا جی کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔" مجھے اس مقام پر پہنچنے کے بعد عرض کرنا ہے کہ یہ حالت محض دھوکا اور نمود نہیں بلکہ واقعی حالت ہے اور خالص تجربی حیثیت سے اس کی بھی ویسی ہی قدر و قیمت ہے کہ جیسی آفاقی سائنس کے تجربات کی قدر و قیمت ہے۔ ایک کائنات فطرت کے ڈھانچے سے بحث کرتی ہے تو دوسری اس کے اندر کام کرنے والے قوانین کی حقیقت کو معلوم کرنے کے درپے ہے۔ چونکہ ڈھانچے کے اجزائے ترکیبی کو معلوم کرنے والوں کی نگاہ صرف ظاہریت پر ہوتی ہے جو ایک سلسلۂ تغیر و انقلاب ہے۔ جہاں شعورِ اعلیٰ کی گرفت بہت مدھم ہے لہٰذا ڈھانچے سے بحث کرنے والے بالآخر "بے شعور مادے کو اپنی آخری منزلِ مقصود قرار دیتے ہوئے اس سے آگے ہر بات کو وہم دینداری بتاتے ہیں

(۲) دونوں متفق ہیں کہ اپنے اپنے مادی یا روحانی عناصر ترکیبی کے اعتبار سے انسان حیوانات کے علاوہ کوئی مستقل اور پائیدار مقام رکھنے والی مخلوق نہیں۔ ایک کے نزدیک وہی مادی عناصر ترکیبی انسان کے ہیں تو وہی ایک بندر اور گریلے کے۔ دوسرے کے نزدیک وہی پرم آتما انسان میں جلوہ گر ہے کہ جو ایک ذرے سے لیکر سورج تک میں جلوہ گر ہے، جو ایک قطرے سے لیکر ایک سمندر تک جلوہ گر ہے، جو ایک مچھر سے لیکر ایک ہاتھی تک میں جلوہ گر ہے ؎

حقیقت ایک ہے ہر شئی کی نوری ہو کہ ناری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

یہ ہے دونوں کا نظامِ اعتقاد کہ جو انسانی زندگی کے لئے کوئی سنجیدہ اخلاقی وروحانی انجام تجویز کرنے کے کلیتہً ناقابل ہے جو انسان کو ایک اشرف مخلوق و اعلیٰ زندگی قرار دے کر اس کے لئے نوعی فلاح کا کوئی مقام معین کرنے سے یکسر قاصر ہے ادھر دونوں کے حرکت وعمل کا ایک ایک نقطہ ان کے اس اعتقاد کی تردید کر رہا ہے۔ ایک بدترین دھریہ اور مادہ پرست سائنٹسٹ ہو یا ایک تارک کل ہمہ اوسی سادھو، دونوں اپنی اپنی عملی زندگی میں باقی کائنات کو اپنے غلام کی طرح اپنی ادنیٰ ترین خدمات میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک عمدہ ترین پھلوں پھولوں

اعتقاد و انجام ہے۔ اب دوسرے گروہ کے نظام اعتقاد کا خلاصہ سنئے۔ زندگی کے تمام اخلاقی و معاشرتی و طبعی مظاہر کے متعلق تو ان کا متفقہ فتویٰ یہ ہے ؎

ہستی کے وہم میں نہ کہیں آئیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یہ تو ظاہر حیات کے متعلق ان کا متفقہ فتویٰ ہے۔ اب باطن کے متعلق ان کا جچا تلا اعتقاد بھی سن لیجئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک نورانی عنصر ہے جو ساری کائنات کا جوہر اول معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہی نورانی عنصر ہمیں ساری کائنات کے عروق و اعصاب میں ایک برقی لہر یا نشۂ شراب کی ایک لہر کی طرح رواں دواں محسوس ہوتا ہے۔ لہذا انفرادی حیات کا کمال صرف یہ ہے کہ وہ تمام انفرادی انگوں اور جوڑوں کو توڑ مروڑ کرتی ہوئی اور اپنے بندھنوں کو کاٹتی ہوئی اس آفاق گیر نورانی برہم آتما میں بھسم ہو جائے کمال انسانی صرف اسی فنائے کلی کا نام ہے۔

(۱) اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ حیات کے مستقبل کے لئے کسی حرکت مزید کے امکان کے قائل نہیں۔ ایک مادے کے لا انتہا سراب میں انسانی قافلے کو ہلاک کرتا ہے تو دوسرا روح کے سمندر میں انسانی کشتی کا بیڑا غرق کرتا ہے۔

بھی کوئی نفسیاتی و اخلاقی سند جواز پیدا نہ ہوگی اور بالکل ہمہ اوستی Santhenists (Santhenists) سادھوؤں کی طرح ایک دن ہمارے سائنس دانوں کو بھی تھک کر فیصلہ کرنا ہوگا ؎

ہستی کے دام میں نہ کہیں آئیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس لئے کہ اگر مستقبل کی پائیداری ایک لغو اور بے معنیٰ بات ہے تو ایک عارضی حال کے لئے اتنی سردردی کون مول لے گا کہ جتنی لی جا رہی ہے۔ بلاشک ایک دن ہمارے ان آفاق گیر شہسواروں کو یہ بات سمجھ آئیگی کہ چونکہ زندگی میں راحت کے بجائے غم اور امن کے بجائے فتنے اور خیر کے بجائے شر کی مقدار زیادہ ہے اور چونکہ اس ساری سردردی کا کوئی سنجیدہ انجام اور معاوضہ نہیں لہٰذا اس کی سب سے بڑی خدمت صرف یہ ہے کہ کوئی ایسا مسالہ تیار کیا جائے کہ جس کے استعمال سے کم از کم پوری انسانی بستی ایک صبح کو ساری دھرتی پر سے غائب کر دی جائے۔ اس لئے کہ حیات کا سب سے بڑا شعوری مظہر انسانی حیات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر خالص اخلاقی و روحانی نقطۂ نگاہ سے حیاتِ انسانی کا کوئی اطمینان بخش اور سنجیدہ تر انجام نہیں تو پھر آ کی تکالیف و شر و فتنوں اور دکھ کو ختم کرنے کے لئے مندرجہ صدر قسم کا ہلاکتِ کل کا منصوبہ ہی ایک قابلِ قبول و کامیاب نسخہ

سے اپنے پیٹ کی اور اپنے لباس و قطع و وضع کی تواضع کرتا ہے۔ وہ گنگا کے مقدس پانی سے اپنے بدن کا میل کچیل صاف کرتا ہے۔ غرض کہ کائنات کی اکثر اشیا کو اپنی نوکری میں استعمال کرتا ہے اور اسے یقین ہے کہ یہ مقام اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔ ایک مادہ پرست و دھریہ سائنٹسٹ تو اپنی ہستی کے کسی اخلاقی و روحانی استقلال کا کلی منکر ہونے پر بھی ساری کائنات کی تسخیر میں صبح سے شام تک مصروف عمل ہے۔ مگر جب ہستیٔ انسانی کے استقلال یا اس کے سنجیدہ انجام کا سوال سامنے آتا ہے تو وہ منکر مطلق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے ان دونوں کے اعتقاد و عمل کا تضاد۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان کی صوابدید اس کی فراست اور اس کا سارا نظام عمل اس درجہ ساری کائنات زیر و بالا کے عمل و صوابدید سے ممتاز و جداگانہ حیثیت رکھتا ہے تو اسی اعتبار سے اس کے مستقبل اور انجام کو بھی کیوں ایک جدا نوعی تقدیر قرار نہ دیا جائے۔ جب تمہارا حال اس درجہ باقی کائنات زیر و بالا کے حال سے جدا اور ممتاز ہے تو تمہارا مستقبل کیوں اسی اعتبار سے باقی کائنات سے جدا اور ممتاز نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ صرف یہی ایک منطق صحیح ہے اور صرف یہی وہ منصوبہ ہے کہ جس کے سبب انسان کی موجودہ بنیادیں بھی پائیدار ہو سکتی رہیں۔ ورنہ تو اس کی موجودہ سرفرازی و گردن درازی کے متعلق

کا یہ ارتداد ان دو انتہا پسندیوں کا نتیجہ ہے کہ جو یہ دونوں گروہ اپنی اپنی تشریح کائنات کے نقطہ ہائے نگاہ میں اختیار کر جاتے ہیں۔ ایک کائنات خارجی اور حواسِ ظاہری کے سنگم سے سارے حق کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں انتہا پسند ہوتا ہوا کائنات کی ساری باطنی معنویت کا منکر مطلق ہو جاتا ہے۔ دوسرا ظاہر سے کلیتہً قطع نگاہ کرتا ہوا اپنے حواس باطنی کو کائناتِ فطرت کے حواسِ باطنی کے ساتھ جوڑ دیتا ہوا اس سکون مطلق میں ساری زندگی کو فنا کر دیتا ہے۔ خالص کائناتی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ دونوں نقطہ ہائے نگاہ اپنے کمال کے آخری زینے پر پہنچ جانے کے بعد صرف پچاس فیصدی صداقت کے حامل ہو سکتے ہیں اور بس۔ لیکن مستقبل میں اگر انسانیت کوئی ایسا نیا نقطۂ نگاہ بنانے میں کامیاب ہو سکے کہ جو انفس و آفاق کے عین وسط میں انسان کو کھڑا کرتے ہوئے دونوں طرفوں کے سارے خیر کو جمع کر لینے میں کامیاب ہو جائے تو اس وقت انسان اس سارے سلسلۂ خیر کو جمع کرے گا کہ جو دونوں حلقوں میں پھیلا ہوا ہے اور جس تک ابھی انسان کی رسائی اس لئے نہیں کہ وہ تلاش و تفحص کو شروع کرنے سے پہلے ہی اپنی ایک آنکھ پھوڑ ڈالتا ہے کبھی ظاہر کی آنکھ پھوڑ کر صرف باطن کی ایک آنکھ سے سارے حق کو معلوم کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے اور نتیجے میں جو کچھ ملتا ہے

ہوسکتا ہے۔ اس سے ہمہ اوستی Pantheist سادھو کا
مقصد بھی بظاہر پورا ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ حیاتِ انفرادی
کے اس طرح ختم ہو جانے سے جو کل تیار ہو گا وہ پار برہم کے علاوہ
اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

شکستِ قطرہ ہا بہ بیں چہ بحر در کنار شد
ز انتزاعِ صورتت کنند عالم بقا

اس طرح موجودہ دور کے آفاقی نقطۂ نگاہ رکھنے والے
بے مقصد سائینٹسٹوں کی پریشانیاں بھی کم از کم اپنے بے شعور
مادے سے ہم آہنگ ہو جائیں گی۔ یہ ہے انجام ان دونوں نقطہائے
نگاہ کے تسلیم کرنے کا جو صرف اسی کائنات کو انسان کی منزلِ
مقصود قرار دیتے ہیں۔ ایک اس کی ظاہریت پر حواس کو استعمال
کرتا ہوا انجام کار ایک بے شعور مادے تک انسان کو پہنچا کر اپنے
سفر کو ختم کر دیتا ہے اور دوسرا اس کائنات کے باطن میں داخل
ہو کر اس کائنات کی باطنی حقیقت الحقائق تک رسائی حاصل
کرتا ہوا سفر کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ دونوں انجام انسان کی موجودہ
حالت کو دیکھتے ہوئے آیندہ کے دو ترقی یافتہ قدم نہیں بلکہ
پیچھے کی طرف ارتداد ہے۔ ان دو میں سے کسی ایک کو تسلیم کرنے
سے انسان کا امتیازی موقف ناپید ہو جاتا ہے۔ چونکہ عمل خود
اعتقاد کا پھل ہے لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو علماً و اعتقاداً ماننے

مشاغل و مصروفیات کا اندازہ لگانے سے ہو جاتا ہے اس کیلئے کسی پیچیدار منطق کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب تک خود انسان کے اعتقاد کو اس کے نوعی نصب العین سے باندھ نہ دیا جائے اس وقت تک انسان کا علماً یا عملاً اپنے احساسِ شرافت پر قائم رہنا ناممکن و محال ہے۔ ذرا ایک ایک اول درجے کے سائنسٹ کے عمل کو غور سے ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ موجودہ سب عناصرِ فطرت کی ایک نئی ترکیب و تحلیل سے ایک نئی دنیا کی تعمیر و تخلیق میں مصروف ہے۔ وہ اپنی کمندِ ہمت کو ساری کائناتِ زیر و بالا پر پھیلا کر سب کا آقا بنا جا رہا ہے۔ اس سے بداہتہً محسوس ہوگا کہ انسان کو سب کائنات سے ایک اشرف و اعلیٰ مخلوق ہونے کا یقین دیا گیا ہے کہ جو اُسے اس ساری کائنات کی تسخیر کر لینے پر مسلسل ترغیب دیتا ہے۔ مگر انھیں اصحاب سے ٹھوس اخلاقی و روحانی زبان میں حقیقتِ انسانی کے متعلق دریافت کیجئے تو وہ انسان کو شاید ہی گوبر و پاخانے یا گدھے اور بندر سے اعلیٰ ظاہر کریں بلکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی پوری فکری تاریخ کو اس خیال سے ایک وحشت ہو جاتی تھی کہ انسان ایک اشرف مخلوق ہے اور وہ ساری کائنات سے جداگانہ ایک معین تقدیر و تدبیر رکھتی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اکثر سائنسدانوں کے خیال میں ایسا اعتقاد وہم پرستی کی انتہا تھی (برٹرنڈ رسل نے اپنی ایک کتاب "سائنٹیفک آؤٹ لک" میں بھی اس خیال کا مذاق اڑایا ہے

اسے سو فیصدی حق سمجھ لیتا اور انتہاپسندی کی ہلاکت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو کبھی باطنی آنکھ کو پھوڑتا ہوا صرف ظاہری ترکیب وتحلیل عناصرِ فطرت کے متعلق اپنی ظاہری آنکھ کو استعمال میں لاتا ہے اور نتیجے میں اُسے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اُسے حق مطلق قرار دیتا ہوا پوری تقدیرِ انسانی کی تعمیر کا منصوبہ صرف اسی رجعت پسندی سے تیار کرنے کے خبط میں گرفتار ہو کر خود ہلاک ہوتا ہے اور دوسری کو ہلاکت کی دعوت دیتا ہے۔ ان انتہاپسندیوں سے مقامِ انسانی کا تعین نہیں ہوتا۔ نہ ان سے انسان کے نوعی نصب العین کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں نقطہ ہائے نگاہ انسان کو اپنے مقام سے اور اپنے نصب العین سے مرتد کرتے ہیں۔ انسان کا مقام اس کی فطری جامعیت کے پیشِ نظر عالمِ انفس و عالمِ آفاق کے عین وسط میں واقع ہوا ہے جہاں سے وہ دونوں طرف کے خیر کو نہایت آسانی سے سمیٹ کر اپنے مقامِ شرافت کی پختگی کے لئے استعمال کر سکتا ہے مگر یہ حرفِ تقدیر اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک اس کا نوعی نصب العین معین ترین شکل اختیار نہ کرلے اور جب تک اس پر اسے سو فیصدی یقین نہ آ جائے تب تک اس کا اپنے آپ کو ظاہر و باطن کی انتہاپسندیوں سے بچاتے ہوئے مرکزِ اعتدال پر قائم کر لینا ناممکن ہے مقامِ انسانی کی جامعیت و شرافت و افضلیت کا اندازہ تو بالکل سرسری طریق سے انسانی

کی حق الیقین سے باندھے ہوئے نہ تھے۔ بلکہ سرے سے وہ نصب العین ہی طے شدہ حالت میں ہمارے سامنے نہ تھا، لہذا جب ہم نے اپنی تقدیر کو اپنے مخصوص نوعی نصب العین سے جدا کر کے صرف کائناتِ انفسی و آفاقی کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تو اس علم نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہمیں منطقیانہ اور سائنٹیفک انداز میں اپنی مخصوص ہستی اور اس کی مخصوص قدر و قیمت کا انکار کرنا پڑا۔ لیکن اگر اپنی ہستی کی شرافت کے یقین کے ساتھ ہی ہمارے لئے ہمارے نوعی نصب العین کا یقین بھی جمع ہو جاتا تو پھر ہمیں اپنی شرافت کے متعلق کوئی چیز بھی شبہے میں نہ ڈال سکتی۔ چاہے وہ سورج اور چاند اور ان کی باقی ساری ارضی و سماوی برادری کی سازش ہی کیوں نہ ہوتی۔ بلاشک انسان کو جس بداہت سے اپنے مقامِ اشرف و اعلیٰ کے متعلق یقین حاصل ہے اگر اس کے ساتھ اُسے اتنے ہی یقین کے ساتھ اپنے نوعی نصب العین کا یقین بھی حاصل ہو جائے تو وہ موجودہ دنیا جیسے ہزاروں دنیاؤں کے لئے اپنے آپ کو تنہا مرکز حق ولیقین پائے اور ان دنیاؤں کو اپنے اردگرد گھومتا دیکھے غالباً یقین و ایمان سے ایک محروم شخص سوال کر بیٹھے گا کہ کیا انسان کی اپنے متعلق اس خوش فہمی کی کوئی قرارِ واقعی بنیاد بھی ہوگی یا یہ صرف تخیل کا ایک فساد و فریب ہوگا؟ میرا جواب

ابھی تک سارے بیالوجسٹ یہی کر رہے ہیں) ایسے ہی ذرا اس تارک الدنیا اشراقی کی حالت پر بھی غور کریں کہ جو اپنی بصیرتِ باطنی کو کائناتِ زیر و بالا کی تدبیر کلی کی مرکزی ایجنسی سے ہم آہنگ کرنے پر جان جوکھوں میں ڈالے ہوئے ہے اور پھر سرسری طور پر غور کریں کہ کیا اس کائنات میں کوئی اور بھی ایسی جری و دور اندیش و ہمہ گیر مخلوق موجود ہے کہ جو ایسے ایسے عالمگیر و ہمہ گیر تجربے کرنے میں مصروف ہو تو آپ کو انسانی قدر و قیمت کے متعلق حیرت ہو گی کہ وہ کیسی عجیب مخلوق ہے۔ لیکن خالص منطقیانہ استدلال کی شکل میں اس جانباز تارک الدنیا سے منصبِ انسانی کی خصوصیات کے متعلق کوئی طے شدہ اور کنکریٹ بات پوچھیں تو وہ کوئی یقینی جواب آپ کو نہ دے سکیگا۔ سوائے اس کے کہدے کہ ساری کائنات کا انجام اور حقیقت دونوں ایک ہیں۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مقامِ انسانی کے متعلق ایک مطلق ہدایت اور کلی صراحت کے طور پر ہمیں جو علم پہلے قدم پر حاصل ہوا تھا وہ دوسرے ہی قدم پر کیوں ایک سراب کی طرح ہمیں اس طرح چھوڑ گیا کہ ہمارے لئے اپنے درمیان اور ایک گدھے کے درمیان فرق کرنا ناممکن ہو گیا؟ جواب یہ ہے کہ مقامِ انسانی کے اعلا و ارفع ہونے کے متعلق ہمارا پہلا علم ایک فطری بداہت تھی۔ لیکن چونکہ ہم اپنی حرکات و سکنات کو اپنے نوعی نصب العین

اسی مقدار سے اس کی واقعیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ کتنی بڑی انسانی بدقسمتی ہے کہ وہ دو ہزار برس تک محض انفسی تجربوں کی بنا پر اپنی تقدیر کو ما پتیا رہے اور پھر دو ہزار برس کے بعد یک قلم ایک زقند بھرتا ہوا آفاقیت کے چوراہے پر آکر کھڑا ہو جائے اور لگے بے تکی ہانکنے۔ ادھر اس کے اس سارے بے تکے پن کی قرار واقعی حقیقت یہ ہو کہ صرف دو سو برس میں (اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی) میں کوئی سو سو پینترے بدلتے ہوئے کبھی ایک بات کو ابدی صداقتوں کا معیار قرار دے اور کبھی دوسری بات کو۔ غرض کہ کائنات کی کوئی ایسی لغویت نہیں کہ جسے اس نے کسی نہ کسی وقت ابدی صداقت نہ کہا ہو اور پھر باقی ساری کائنات کو اس حماقت سے نہ ما پا ہو۔ بہرحال اگر انسان میں اپنی نوعی شرافت کا یقین اور نوعی نصب العین کا یقین جمع ہو جائے تو وہ اُسے آج تک کی اس ساری کذب وافترا اور مغالطے کی دنیا سے نکال کر سارے انفسی و آفاقی خیروں کا جامع بنا دیگا۔ وہ دنیا بہرحال اور بہرصورت موجودہ انسانی دنیا سے کئی حصے زیادہ خیر کی جامع ہو گی۔ صدر کی سطور میں اصولاً آفاقی و انفسی نقطہ ہائے نگاہ پر اصولی تنقید کی گئی ہے۔ گزشتہ دو اڑھائی سو برس میں یورپ نے جس آفاقی نقطۂ نگاہ سے کائنات کی جانچ پڑتال کی ہے کمیونزم اس کی نہایت درجہ بھونڈی ہی نہایت درجہ جاہلانہ

یہ ہے (اور اسے ساری جھوٹی خوش فہمیوں اور سارے انسانیت کش تعصبوں سے علیحدہ ہوکر بالکل واقعاتی اعتبار سے ہر انسان کو سننا اور غور کرنا چاہیئے) کہ اس یقین میں محض حسابی اعتبار سے (Mathematical Calculation) بھی دوگنی سے زیادہ واقعیت ہوگی۔ اس لئے کہ اس یقین میں وہ سارا خیر و یقین و واقعیت موجود ہوگی کہ جو محض آفاقی یا محض انفسی تجربہ گاہوں کے ذریعہ آج تک علیحدہ علیحدہ جمع ہوئی ہے۔
اس لئے کہ ہمارا یہ علم اور یہ یقین ہماری اس پوزیشن کا پھل ہے کہ جب ہم محض آفاقی یا محض انفسی پوزیشن کو سو فیصدی حق و صداقت قرار دینے کی انتہا پسندانہ حالت سے وسعت بردار ہوکر اس مرکزِ اعتدال پر سمٹ آئے ہیں کہ جو انفس و آفاق کے عین وسط میں واقع ہے اس پوزیشن پر مستحکم ہو جانے نے ہمارے علم و یقین کو کم از کم دوگنا مضبوط کر دیا ہے اور اس کے ساتھ محض انتہا پسند ہونے کے باعث ہمارے ظن و تخمین و مشاہدے اور بیان میں مغالطات کی جو دنیا جمع ہوگئی تھی، وہ ہم سے دور ہوگئی ہے اور اب ہماری بصیرت ایک معیاری حالت کے قریب ہوگئی ہے۔
بلاشک اس مرکزِ اعتدال و یقین پر سمٹ آنے کے باعث ہمارے بیان و کلام اور اندازے میں جھوٹ اور مبالغے کی وہ زرق برق بے پایانی ختم ہو جاتی ہے کہ جو انتہا پسندیوں کا خاصہ ہے۔ مگر

بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ کم از کم ہند و تاریخ میں انفسیت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سب کا ایک واضح فلسفیانہ خلاصہ پیش کر دیں وہ ان تمام مکاتب خیال میں سے اپنے آپ کو کسی ایک کا پابند نبا کر نہیں چلتے (ایک باحیا علمی شخصیت اور ایک بے حیا سیاسی شعبدہ باز گروہ میں اتنا فرق موجود ہے) لہذا ان کی تصنیف میں وہ جاہلانہ تنگ نظری نہیں کہ جو لینن کی کتاب میں ہے۔ لینن نے تو آفاقیت objectivity کا صرف عنوان دیا ہے۔ اس نے اس میں کسی آفاقی سائنس کے نقطۂ نگاہ کو ثابت کرنے کے بجائے حقیقت میں سب کی تردید کرتے ہوئے مارکس کی منطق تضاد کو ثابت کرنا چاہا ہے: ظاہر ہے کہ اس سے آفاقی سائنس کا نقطہ نگاہ واضح نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اس نے کم از کم دعویٰ کی حد تک اپنے آپ کو آفاقیت کا علمبردار ظاہر کیا ہے لہذا آفاقیت کے متعلق بھی جو چیز عمرانِ انسانی کی روشنی میں کہنا مناسب تھی وہ عرض کر دی گئی۔ آفاقی علوم یا آفاقی نقطۂ نگاہ انفسی علوم و انفسی نقطۂ نگاہ کی ساری انسانی قدر و قیمت ایک جملے میں عرض کرتا ہوا نصب العین انسانی کے تعین کی طرف بڑھونگا۔ عرض یہ کرنا ہے کہ جب تک ان دونوں حلقوں کو مجموعی فلاحِ انسانی کے نصب العین سے باندھتے ہوئے اور اس کی نوکری کا ان دونوں سے حلف نامہ لیتے ہوئے

سی اور نہایت درجہ تنگ نظرانہ سی نقالی ہے۔ اس میں اتنی بھی وسعت نہیں کہ کم از کم گذشتہ دو سو برس کے سارے آفاقی نقطۂ نظر کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔ مارکس کے مادی صنعتِ تضاد کو اپنے مذہب کا اصل الاصول قرار دینے کے بعد یہ لوگ سائنس کی اسّی فیصدی جائداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ گذشتہ دو اڑھائی سو برس کے سارے سائنس دانوں میں سے بیس فیصدی بھی ایسے مشکل سے ملیں گے کہ جو اس صنعتِ تضاد کے قائل ہوں۔ مارکس کی صنعتِ تضاد کے مرید کہلانے والے تو شاید پوری تاریخ میں دس بیس بھی مشکل سے نکلیں۔ لہٰذا خالص آفاقی سائنس کے نقطۂ نظر سے یہ لوگ پرلے درجے کے تنگ نظر جاہل اور سیاسی شعبدہ باز political manipulators ہیں۔ ان کے ائمۂ اربعہ۔ مارکس، اینگلز، لینن اور سٹالن۔ میں سے ایک بھی سائنٹسٹ نہیں۔ لیکن اگر ان کی کتابوں کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ سائنس کا نبی آخر الزماں اور جہنم داتا صرف کارل مارکس تھا اور جونہی کسی بڑے سے بڑے سائنٹسٹ نے اپنی لیبارٹری میں کوئی لفظ ایسا کہہ دیا کہ منطقِ تضاد کا اصول غلط ہے ویسے ہی انھوں نے اس کی ساری سائنس کا انکار کر دیا۔ اس کے مقابل سر رادھا کرشن نے اپنشدوں کی الفسی سائنس کے متعلق اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ فرقہ واریت اس قدر موجود نہیں

درجے کے ایرکنڈیشنڈ ایک ایک ورجن آٹومک ہوائی جہاز ہیں جن میں یہ لوگ شام کو سوار ہو کر ہالی وڈ کے ایک خاص ڈانس کا لطف لینے کیلئے امریکہ پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد دس بجے وہ سٹالن کی جام صحت کی ایک تقریب پہ ماسکو پہنچ جاتے ہیں اور صبح کے تفریحی مشاغل کو پیرس میں جا کر انجام دیتے ہیں مگر ان میں ایک میں بھی روحانی و اخلاقی معاشرتی و فکری یکسوی اور توازن کا پتہ نداردہے۔ ہوا و ہوس کی ایک آگ ہے کہ جو انھیں بے کل کئے ہوئے ہے اور وہ یوسف بے کارواں ہو کر ڈالی ڈالی پر امن و راحت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں خوب غور کرو کہ ان دو بستیوں میں سے حقیقی و پائیدار راحت انسانی کسے حاصل ہے اور کسے ہوا و ہوس کے پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے اور وہ بے لگام ہو کر چاروں طرف بھاگ رہا ہے! یہ حرف تقدیر یاد رکھنے کے قابل کہ جس طرح وہ انسان بدترین عذاب اور بے چینیوں سے ہلاک ہوتا ہے کہ جس کے تمام اعمال کو ایک مضبوط شیرازے میں رکھنے والا کوئی معین مقصد اس کے سامنے نہ ہو۔ ایسے انسان کا انجام عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس کے متخالف جذبات اور متضاد افکار چلتے چلتے اسے سرِراہ ڈھیر کر دیں کہ جہاں اس کا کوئی جاننے والا بھی نہ ہو۔ بالکل انسانی بستی کی جماعتی زندگی کی بھی یہی حالت ہے کہ اگر اس کے افراد کے سامنے کوئی ایسا

آپ انھیں انسانی خدمت میں نہ لگائیں گے، تب تک یہ دونوں اکیلے اکیلے بھی اور باہم ملکر بھی کائنات انسانی کو ہلاک کر دینگے

ان دونوں کو مطلق العنان چھوڑنے کا نتیجہ صرف انسانی بربادی ہو گا۔ اس کا پھل روحانی انارکی، اخلاقی انارکی، معاشرتی انارکی اور ذہنی و فکری انارکی ہو گا اور یہ سب انارکیاں ملکر نوع انسانی کو نیست و نابود کر دینگی۔ اس لئے کہ انسان اس کائنات میں جس نئے حق خود ارادیت کا نام تھا اس کا خمیر روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور فکری قوتوں کے توازن و اتحاد سے تھا اور اس توازن و اتحاد کو یہ انفسی و آفاقی انتہا پسندیاں اور خودسریاں نیست نابود کر رہی ہیں۔ آؤ ذرا ایک ایسی انسانی بستی کا اندازہ کریں کہ جن کے فرد فرد کی سیرت و کردار روحانی، اخلاقی، معاشرتی و فکری امتزاج و اتحاد و توازن کا ایک معیاری نمونہ ہے مگر ان کے پاس موجودہ دور کی پیچیدار شہریت کے زرق و برق کا کوئی اثاثہ نہیں، سیدھے سادھے سے ایماندار لوگ ہیں کہ جو اپنے سارے فرائض کو نہایت سادگی اور بے تکلفی سے انجام دیتے رہتے ہیں۔ لیکن آؤ اس کے مقابل ایک ایسی مصنوعی انسانی بستی (برٹنڈرسل نے مستقبل کی سائنٹفک انسانی سوسائٹی کا ایک ایسا ہی خاکہ اپنی کتاب سائنٹیفک آؤٹ لک میں دیا ہے) کا ہم اندازہ کریں کہ جن میں سے ہر ایک قارون جتنا حریص ہے ان میں سے ہر ایک کے پاس اول

اس کے سارے انفرادی و اجماعی حرکت و سکون کو انہیں کی حدود کے اندر محدود رکھنا ہے تو پھر یہ بھی ایک فطری بداہت ہے کہ جب تک اس کے لئے ایک پائیدار تر اور نقائص و عیوب سے پاک تر اور موجودہ ماحول کی حدود و قیود سے آزاد تر اور وسیع تر حیاتِ کامل و باقی کو ایک قابلِ حصول حق الیقینی نصب العین کی حیثیت حاصل نہ ہو اس وقت تک اس دنیائے فانی میں اس کی مخصوص صلاحیتوں کا ایک شیرازے میں باندھنا ناممکن ہے۔ بلا شبہ ایک طرف پوری تاریخ فطرت کا ارتقائی سلسلہ اور دوسری طرف اندرونی فطرتِ انسانی کا حکیمانہ تجزیہ صرف اسی یقین بخش نصب العین کی طرف نوعِ انسانی کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلتا ہے۔ اس کی خالص اندرونی فطرت میں کبھی نہ ختم ہونے والی ہزار در ہزار رنگین و فرحت بخش تمناؤں کی ایک متحرک کائنات ہے کہ جو موجودہ ماحول کی تنگنائے حدود و قیود میں اپنا ہزارواں حصہ بھی پورا ہوتا نہیں دیکھتی۔ انھیں محض فریبِ نفس کا سراب سمجھنا اتنا ہی باطل ہے کہ جتنا باطل اس کائناتِ زیر و بالا کو سمجھنا ہے اس لئے کہ جہاں سے کائناتِ زیر و بالا کو ہستی کی خلعت ملی ہے وہیں سے انسان کو یہ بے پناہ تمناہائے رنگین ملی ہیں۔ بلکہ حقیقی زندگی کی لطافت ان تمناؤں میں باقی کائنات کی مجبور ہستی سے کہیں زیادہ ہے۔ لہذا جس طرح ایک حق اور واقعہ ہے بالکل

جامع و مانع نصب العین نہیں کہ جو ان کے تمام قوائے حیات کے لئے ایک مضبوط شیرازے کا کام دے سکے تو فرد کی طرح جماعت کی ہلاکت بھی یقینی ہے۔ آج کائنات انسانی کی صرف یہی ضرورت ہے کہ اس کے لئے ایک ایسا جامع و مانع نصب العین مقرر کر دیا جائے کہ جو اس کے تمام قوائے حیات کے لیے ایک جامع شیرازہ بند بن سکے ورنہ اس کا مستقبل روحانی، اخلاقی، معاشرتی و ذہنی وسیاسی انارکی کے علاوہ کچھ نہیں اور ان سب کا نتیجہ ہلاکت انسانی ہے اور کچھ نہیں

حیات انسانی کا یہ جامع و مانع نصب العین کیا ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

اگر نوعِ انسانی ایک بداہت کے طور پر اپنی مخصوص ظاہریت اور اپنی مخصوص باطنیت کے پیش نظر سارے انواعِ حیوانات کے مقابل ایک نئی اور مقدس خود ارادیت ہے جو اپنی مخصوص صلاحیتوں کے پیش نظر ہر حیثیت سے تاریخِ فطرت کا آخری نقطۂ ارتقا ہے اور اس کی یہ مخصوص صلاحیتیں اس کی اپنی اخلاقی و روحانی صلاحیتیں ہیں اور اگر اس کے معاشرے کی فلاح و بقا صرف انھیں صلاحیتوں کو غایتِ کمال تک پہنچانا ہے اور انھیں کی روشنی میں اور انھیں کے ذریعے اس کے تمام کاروبار کو چلانا اور

یہ ہے ہماری حیاتِ آنی کا ہماری حیاتِ جاودانی سے فطری اور قدرتی تعلق جس کی تصدیق پوری تاریخ فطرت کا مجموعی دھارا اور پوری فطرتِ انسانی کی اندرونی کائناتِ تمنا و بقا دے رہی ہیں مگر جنھیں اپنی اصل منزلِ مقصود سے روکنے کے لئے ہزاروں برس سے نہایت درجہ نیک نیت دشمنانِ انسانیت کا وہ گروہ کام کر رہا ہے کہ جو کبھی تو انسان کو اس کی اپنی صاف اور واضح صراطِ مستقیم سے ہٹا کر انفسیت کی گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے اور کبھی آفاقیت کے خار و خس و خاشاک سے الجھا دیتا ہے مگر جس کا علاج مذہب کو پوری ایمانداری سے اس کی کامل ترین شکل میں قبول کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں یاایہا الذین آمنوا ادخلو فی السلم کافۃ اے حق کو تسلیم کرنے والو سلامتی میں پورے داخل ہو جاؤ۔

ذاتِ باری کا غلط تصور

جب تک انسان اپنی اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو باقی تر، پائیدار تر، لطیف تر، آزاد تر اور پر لطف تر حیاتِ خیر و باقی کے اعتقاد سے باندھتے ہوئے ان میں ایک غیر معمولی ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے ایک ہمہ گیر جامع بقیہ

اسی طرح دوسرا بھی ایک لطیف و مقدس حق ہے اگر عام الجھے ہوئے اور جلد باز انسانی ادراک میں اس کے لئے کوئی خفا ہے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے انسان کے اس کائنات پر ظہور سے پہلے بندروں اور بن مانسوں کے لئے انسان جیسی کامیاب مخلوق کے ظہور کے متعلق ایک خفا ہوا ہوگا۔ حالانکہ اس دھرتی کو انسان کے ورود کے لئے تیار کیا جا چکا تھا۔ غرض کہ ایک طرف پوری تاریخ فطرت کا سلسلۂ ارتقا، دوسری طرف انسان کی مخصوص اخلاقی و روحانی صلاحیتیں اور تیسری طرف اس کی بے پناہ تمنائیں ملکر بحیثیت مجموعی صرف اس ایک بات کی شہادت دیتی ہیں اور صرف اس ایک الہام سننے کی منتظر ہیں۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی

"تم اس قریبی زندگی سے لپٹ جاتے ہو حالانکہ آخرۃ بہتر اور پائیدار تر ہے"

لیکن جب تک پورے یقین سے اس جاذب عزیمت انسانی نصب العین سے حیات انسانی کی پوری مشنیری کو باندھ نہ لیا جائے اس وقت تک انسان کی اخلاقی و روحانی قوتوں اور صلاحیتوں کا اپنے کمالِ مقدر پر پہنچنا اور سارے کاروبار انسانی کا انھیں کی صوابدید میں انجام پانا مشکل، اور جب تک انھیں بہ حیثیت عملی کاروبار میں حاصل نہ ہو اس وقت تک فسادِ انسانی کا خاتمہ ناممکن ہے۔

بس کے ذریعہ وہ زندگی کے سب سے دقیق اخلاقی وروحانی
مرحلے کو طے کرسکتا ہے۔ ہاں جب انسان اپنی بدیہی اخلاقی
وروحانی صلاحیتوں کو عاقبت بالخیر کے نصب العین سے
باندھتے ہوئے اپنے قوائے حیات کو فرائض و
واجبات حیات کی عملی ادائیگی سے ایک توازن بخشتا ہے
تو اس جامع عملی توازن کے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ
اس میں وہ جامع نورِ بصیرت پیدا ہونے لگتا ہے کہ جو
بالآخر اُسے اپنے خالق کی حقیقی معرفت تک پہنچا دیتا ہے
غرض کہ انسان کی تمام مخصوص اخلاقی وروحانی صلاحیتوں
کو ان کے قدرتی آرڈر میں رکھنے اور انھیں کمال کے
آخری زینے تک پہنچانے کے لئے جو نصب العین نوعِ انسانی
کی فطرتِ صحیحہ سے کلی مطابقت رکھتا ہے وہ یہی ایک
پائیدار تر عاقبت کا یقین ہے۔

والآخرۃ خیر و ابقی۔ ان ھذا لفی الصحف الاولی صحف
ابراھیم وموسیٰ۔ عاقبت خیر تر اور باقی تر (حقیقت) ہے یہی تعلیم
پہلی مذہبی کتابوں میں بھی تھی (یہی) صحف ابراہیم وموسیٰ میں بھی تھی۔

ے سے حیات منزل جاوداں کو طویل عرصے سے گامزن
وہی بچ بچا کے پہنچ سکا جو مطیع دائمی طور رہے

فقیر نذیر احمد کاشمیری

پیدا نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کے ذاتِ باری کے صحیح معرفت کے سارے دعاوی فریب خوردگی اور فریب دہی ہیں۔ جن کا تجزیہ یہ ہے کہ کوئی تو اُسے انفسیت کے مساوی قرار دیتا ہے کوئی اسے آفاقیت کا ہموزن بتاتا ہے اور کوئی اُسے انفس و آفاق کے مساوی قرار دیتا ہے اور کوئی اپنی معقولیت کا سو فیصدی قائل رہنے کے باوجود ساری کائنات کو ایک نامعقول و مجہول قوت کا ہجوم اور ریلا گردانتا ہے۔ حالانکہ صدر میں بیان کی ہوئی بدیہی حدودِ انسانی کی پابندی کرنے والی بصیرت کے لئے یہ سب ظن و تخمین کا بطلان ہے اور کچھ نہیں۔ صدر میں ایک سیر حاصل تجزیے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر انسانی اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو کائنات انفسی و آفاقی میں تلاش کیا جائے تو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ یہ مساعی الٹا انسان کو اس کے مقامِ انسانی سے گرانے کا موجب ہو جاتی ہیں۔ تو جب انسان کی اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کی یہ حالت ہے تو ان کے خالق کو انفس و آفاق کے بت خانے میں تلاش کرنا اس سے بھی ہزار گنا بڑی گمراہی کے سوائے کیا ہو سکتا ہے۔ آخر اس کے پاس صحیح اخلاقی و روحانی توازن کو عملاً بحال کرتے ہوئے اسے غایت درجہ پختہ کرنے سے پہلے کونسی بصیرت ہے کہ